اردو کے مسیحی شعراء



ڈی اے ہیرس
قربان

اردو
کے
مسیحی شعراء

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں شاعرانِ پاک طینت را

ڈی۔ اے۔ ہیرسن قُربان
ایم۔ اے، بی ٹی، کامِل۔

اُتر پردیش اردو اکاڈمی (لکھنؤ) کے مالی اشتراک کے ساتھ

ناشر: ——— مُصنّف

مطبع: ——— محبوب پریس۔ دیوبند

کتابت: ——— شیخ رضوان احمد۔ ایم۔ اے۔ سہارنپور

قیمت: ——— ۱۵ پندرہ روپے

تعداد اشاعت: ——— بار اوّل ۶۰۰

سن اشاعت: ——— جنوری ۱۹۸۳ء

پتہ

قمر آن۔ بی۔ ۷۸ آواس وکاس کالونی۔ سہارنپور (یو۔پی)

پن کوڈ ۲۴۷۰۰۱

فہرست

شعرائے متاخرین

تاخیر سے موصول ہونیوالے شعراء

نوازشات

پروفیسر گوپی چند نارنگ - جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

"اردو محض ایک زبان نہیں، ہندوستان کی ثقافتی بوقلمونی، مذہبی رنگا رنگی اور کثیر لسانی صورت حال میں معاشرتی شیرازہ بندی کا ایک ایسا رشتہ بھی ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ اردو مختلف فرقوں، طبقوں اور علاقوں میں باہم دیگر وصل کی زبان ہے فصل کی نہیں۔ اس کی آبیاری میں تمام فرقوں اور مذہبوں سے تعلق رکھنے والوں نے شانہ بشانہ خدمات انجام دی ہیں۔ مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور پارسیوں کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی اور ترویج میں عیسائی ادیبوں اور شاعروں کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے رام بابو سکسینہ نے انڈو یورپین شعرائے اردو میں اسی پہلو کو نمایاں کیا تھا۔ اب ڈی۔ اے ہیریسن قربان نے اس تاریخی سلسلے کو اور آگے بڑھایا ہے۔ ان کی تالیف سے وقت کی ایک ضرورت پوری ہوگی۔"

پروفیسر بخشی اختر امرتسری

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جناب ڈی۔ اے ہیریسن قربان نے ایک دستاویز "اردو کے مسیحی شعراء" مرتب کی ہے اس کتاب کی اہمیت اسکے نام سے ظاہر ہے۔

یہ اس ضرورت کو پورا کرے گی جس کی اسوقت تک کمی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ کتاب ہذا اردو شعر و ادب کی دنیا میں قبولیت کا درجہ پائے گی۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی شعبہ اُردو۔ بہار یونیورسٹی مظفر پور

اردو زبان ہندوستانی تہذیب کا عطیہ ہے اور اردو شعر و ادب عظیم متحدہ قومی ثقافت کا منبع شعر و ادب کی تاریخ کے مطالعہ سے وضاحت ہوتی ہے کہ اسکی روایتوں کی تشکیل و ترویج، ہر مذہب اور ہر فرقے کے دانشوروں نے کی ہے۔ پیش نظر تصنیف "اُردو کے مسیحی شعراء" بھی اس سلسلے کی ایک اہم مثال ہے اس کی اہمیت و افادیت بہ آسانی محسوس کی جا سکتی ہے۔
مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اردو ادب کے شائقین کے لئے توجہ طلب ہوگی اور ان کے علم و اطلاع میں اضافے کا سبب بنے گی۔

جناب ویریندر پرشاد سکسینہ ممبر اُتر پردیش اُردو اکاڈمی

جناب ہیرسین قربان کا شمار صف اوّل کے نقادوں اور ادیبوں میں ہوتا ہے اُردو کے مسیحی شعراء پر جو آپ کی کتاب شائع ہو رہی ہے ہمارے تحقیقی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

جناب ضیاء عظیم آبادی۔ ایڈیٹر جدید شاہراہ لکھنؤ

جناب ڈی۔ اے ہیرسین قربان مرادآبادی صاحب ایک کہنہ مشق اور سلیقہ شعار

صاحب قلم ہیں اردو سے واقعی انھیں محبت ہے اور ہندوستانی ہونے کے ناطے کما حقہ اسکی عملی خدمت کر رہے ہیں یہ کہنا بڑی زیادتی ہے کہ زبان و حُبِّ وطن کا رشتہ مذہب سے ہوتا ہے ریحانی لکھنوی اور شاکر میرٹھی وغیرہ ان ارباب کمال میں ہیں کہ باوجود عیسائی ہونے کے ہندوستان کے فدائی تھے اور اردو کے عاشق زار ایسی مثالیں تاریخ ادب میں بے شمار ہیں انکے تذکرہ کی اسلئے ضرورت نہیں ہے کہ "اردو کے مسیحی شعراء" کافی ترجمان ہے اور وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرنیوالی گرانقدر تصنیف ہے ۔ اسکے لئے جناب قربان مرادآبادی لائق ستائش اور قابلِ قدر ہیں ۔ آج ہندوستان میں جو علیحدگی پسندی کا رجحان بڑھ رہا ہے اور فرقہ پرستی ولسانی تفریق سر ابھار رہی ہے اسمیں ایک مسیحی ادیب کی اتحاد و یکجہتی کیلئے مساعی جمیلہ نہ صرف دیدہ ودلوں میں جگہ پانے کی مستحق ہے بلکہ حکومت اور ہر محبِ وطن کے لئے سر آنکھوں سے قبول کرنے کی بھی متاعِ عزیز ہے ۔

مجھے یقین ہے کہ ادب کا بیدار مغز حلقہ اور ترقی پسند سرکار جناب قربان مرادآبادی کو خاطر خواہ نوازے گی اور انھیں زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع دے گی ۔ •

جناب منظر اعجاز ۔ ایڈیٹر "انعکاس" مظفرپور (بہار)

"اردو کے مسیحی شعراء" کے مولف قربان مرادآبادی نے اس کتاب کی تالیف کرکے نہ صرف اپنی تحقیقی صلاحیت کا ہی اظہار کیا ہے بلکہ آنکو اردو داں طبقہ میں متعارف کرانے کے وہ مستحسن اقدام کئے ہیں جو دُہری افادیت و اہمیت کے متحمل ہیں ۔ واقعی اردو ادب کے ان مسیحی شعراء کو اردو ادب میں کتنے فیصد لوگ قبل سے جانتے ہیں ؟ اس کتاب کی اشاعت ترسیل و ابلاغ کے اہم فریضہ پر دلیل ثابت ہوگی ۔ اس کارِ خیر کیلئے میں قربان صاحب کو لائقِ تحسین و مبارکباد سمجھتا ہوں ۔ •

ہمیں کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

اُردو زبان اپنے آغاز سے ہی سیکولر رہی ہے۔ خود لفظ اُردو اس بات کا ثبوت ہے۔ دراصل اردو زبان کا ماخذ برج[ط] بھاشا ہے۔ اُردو ترکی لفظ ہے جس کے معنی ہیں لشکر۔ اس لئے اردو کے زائد افعال و متعلقات فعل وہی ہیں جو برج بھاشا کے ہیں۔ جب مسلمان اس ملک میں آئے تو ان کے ساتھ عربی، فارسی، اور ترکی زبانیں بھی آئیں۔ یہاں ایک دوسرے کو حسب ضرورت سمجھنے اور سمجھانے کے لئے اِن مختلف زبانوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ اصل الفاظ کی شکلیں اور ساخت بگاڑ کر نئے الفاظ تراشے جانے لگے۔ مثلاً حجور۔ (حضور) سرطان (سلطان)۔ جحاج (جہاز) (لاٹینی) انگریزی۔ ٹیم (وقت TIME) کچھ الفاظ اصل صورت میں رائج ہوگئے جیسے صاحب۔ سلام۔ دُنیا۔ سرائے۔ ریل۔ ٹکٹ۔ صابن وغیرہ۔ کچھ مختلف زبانوں کے الفاظ کے مرکّب سے وجود میں آگئے جیسے تال + آب۔ ہندو + استھان۔ سمجھ + دار۔ دُکھ + درد۔ رنگ + روپ گورا + چٹّا۔ ڈبل + روٹی وغیرہ

اس طرح ایک مخلوط زبان کا جنم ہوا۔ مغلوں کے زمانہ میں اُردو لفظ کا

ط از داستان تاریخ اردو

استعمال لشکر کے معنوں میں ہوتا تھا۔ لشکرگاہ کو اردوئے معلیٰ اور بازار لشکر کو اردو بازار کہتے تھے یہ ظاہر ہے کہ لشکر میں ملک کے ہر حصّے سے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ گویا لشکر مجمع ہے۔ مختلف قوم کلچر اور زبان کے افراد کا۔ اس طرح اردو زبان کی ترویج اور ترقی میں کاشمیری۔ پنجابی بنگالی۔ مدراسی۔ ہندو۔ مسلمان۔ سِکھ۔ عیسائی سبھی نے حصّہ لیا۔

پنجاب میں اردو، دکن میں اردو، بہار میں اردو۔ اردو زبان میں ہندوؤں کا حصّہ۔ اردو زبان میں سکھوں کا حصّہ وغیرہ جیسی کتابیں اس بات کا ثبوت ہیں۔

انگلستان کے تاجروں نے ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور ہندوستان میں بغرض تجارت آنے لگے جب تجارت میں ان کے پاؤں جم گئے تو انہوں نے اقتدار حاصل کرنے کی سعی شروع کی۔

اورنگ زیب کے زمانۂ حکومت میں مغلوں کی سلطنت متنزلزل ہونے لگی تھی۔ انگریزوں نے موقع غنیمت سمجھا اور اپنی تدبیروں سے ملک کے بیشتر حصّہ پر قبضہ کرلیا۔ حکومت کا انتظام چلانے کے لئے یہ ضروری ہوا کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کی زبان سمجھیں۔ یہاں کے حالات۔ خیالات۔ رسم ورواج سب سے واقفیت حاصل کریں۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کی مروّج زبان سیکھنا شروع کردی۔ اس وقت یہی لشکری زبان (اردو یا ریختہ) عام فہم تھی۔ اسلئے انہوں نے اس کی ترقی واشاعت میں دلچسپی لینا شروع کردیا خود اردو سیکھی۔ کتابیں تصنیف وتالیف کیں۔ ترجمے کئے۔ ۱۸۱۶ء میں

سیرام پور (مغربی بنگال) میں ایک کالج کھولا۔ اور ۱۸۱۸ء میں سماچار درپن کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ مذہبی و تبلیغی کتابیں اردو میں شائع ہونے لگیں۔ ۱۸۱۴ء میں پادری ہینری مارٹن نے یونانی زبان سے عہد جدید (نیا عہدنامہ) کا ترجمہ اردو میں شائع کیا۔ اور ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۹ء تک مکمل بائیبل کا اردو ترجمہ پانچ جلدوں میں شائع ہوا۔

انگریز حکام نے قانونی کتابیں اردو میں لکھوائیں اور کمپنی کے ملازموں کے لئے اردو زبان سیکھنا اور امتحان پاس کرنا لازمی کر دیا۔ اسی مقصد کے لئے فورٹ ولیم کالج وجود میں آیا۔ اردو کی سب سے پہلی لغت ایک مسیحی نے تیار کی۔ مسٹر فیلن کی ڈکشنری کو اولیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کی سعی جمیلہ سے کون واقف نہیں۔ ۱۸۸۴ء میں سر الفرڈ لائل کی تحریک پر حضرت امیر مینائی نے اردو لغت تیار کرنا شروع کیا۔

۱۸۳۲ء میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا یہی نہیں بلکہ انگریزوں نے اردو میں شعر بھی کہے اور بعض صاحب دیوان بھی ہو گئے اس عہد کے بہت سے انگریز مصنفین کے نام تذکروں میں ملتے ہیں لیکن افسوس کہ کسی ہندوستانی مسیحی ادیب یا شاعر کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

اس کتاب کا موضوع ہندوستانی مسیحی شعراء سے متعلق ہے اسلئے ہم نے انگریز مصنفین اور یورپین شعراء کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس تذکرے میں شعراء کرام کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق رکھی گئی ہے۔

دیباچہ

ادب زندگی کا آئینہ ہے اور مذہب زندگی کا عنصر۔ اسلئے ادب سیکولر ہوتے ہوئے بھی مذہب اور مذہبی روایات سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔ شاعری نام ہے جذبات کا اور مذہب بھی ایک جذبہ ہے جو دل و رُوح سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی روایات۔ اعتقادات واقعات۔ رسومات ادب کا جزو بن گئی ہیں۔

اردو شاعری میں مذہبی شاعری ایک مستقل صنف بن گئی ہے اس میں مثنوی، قصیدے۔ غزل۔ قطعات۔ رباعیات۔ مرثیے اور سلام سب کچھ شامل ہیں۔ چونکہ اردو زبان مختلف لوگوں کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ اسلئے مذہبی شاعری میں ہر قسم کے اعتقادات شامل ہوگئے ہیں۔ جس طرح انگریزی ادب میں بائیبل کا بہت بڑا حصّہ شامل ہے ہندی ادب میں ہندو مذہب کے اعتقادات کی کثرت ہے اسی طرح اردو میں میرانیسؔ و دبیرؔ کے مراثی۔ عزیزؔ لکھنوی کے قصائد۔ چکبستؔ و نظیرؔ اکبرآبادی کی مذہب سے متعلق نظمیں شامل ہیں۔ ان موضوعات نے

اردو ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔

مسیحی ادیب و شعرا بھی اردو زبان کی ترقی و ترویج میں پیچھے نہیں رہے۔ گو ان کی کاوشوں کو ادب نواز نظروں تک پہونچنے کے ذرائع حاصل نہ ہو سکے پر ان کی سعی مسلسل سے اردو ادب میں ایک نئے موضوع کا آغاز ہو گیا ہے۔ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توصیف و تمجید مسیحی تصوف و عرفان حضرت مسیح کے معجزات، واقعات زندگی۔ کیفیت ولادت مسیح۔ حادثاتِ صلیب وغیرہ شامل ہیں۔ ان عنوانات کے تحت مسیحی شعرا نے وہ بلند پروازیاں اور رنگینیاں دکھائی ہیں کہ ادب اردو کا مورخ اُن کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

لیکن کسقدر افسوس کا مقام ہے کہ شائقین ادب اُن کے نام و ولادت، انتقال، علمیت۔ اوصاف۔ عادات۔ اطوار اور زندگی کی سرگذشت سے لاعلم ہیں۔

اسی خیال کے تحت اس ناچیز نے ضروری سمجھا کہ جتنے شعرا کے حالات میسّر آ سکیں انھیں ایک جگہ جمع کر دوں تا کہ آنیوالی نسلوں کو کچھ روشنی مل سکے۔

اردو زبان کے مشہور و معروف ادیب شاعر ترجمانِ ادب جناب علامہ منشی بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی رقم طراز ہیں:۔

مسیحی شعرا کی اردو دوستی بھی اپنی جگہ ایک خاص اہمیّت رکھتی ہے۔ ان شعرا کے قریب قریب تمام شعر

فصاحت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ اپنے جذبات اور دلکش بیان کے لحاظ سے ہر مسیحی کا کلام خاص و عام میں یکساں طور پر مقبول ہو گا۔ جب محفل میں یہ اشعار پڑھے یا سنے جائیں گے ایک قسم کی روحانی کیفیت یقیناً پڑھنے یا سننے والوں پر طاری ہو جائے گی۔ کاش ایسی پاکیزہ شاعری سے اردو کے شعر و ادب میں اسی طرح اضافہ آئے دن ہوتا رہے۔ (رسالہ ہما۔ لکھنؤ بابت اپریل تا جون ۱۹۷۵ء)

مسیحی ادب نے بہت سی نئی نئی تلمیحات۔ تشبیہات ـــــ ـــــ استعارات۔ مترادفات۔ نئی ترکیبیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق استعمال کی جاتی ہیں۔ مہیا کر دیں۔ مثلاً ابن مریم۔ ابن داؤد۔ ناصری۔ کفارہ۔ منجی۔ کلمۂ حق اور بیمارِ عصیاں وغیرہ چند مسیحی تلمیحات درج ذیل ہیں:-

ناصرت۔ یروشلم۔ (بیت المقدس) کے قریب ایک قصبہ ہے جو حضرت مسیح کا وطنِ مبارک تھا ۔

اے ناصرت کے چاند اے مریم کے نورِ چشم
پوشیدہ آفتاب تیری ہر کرن میں ہے

بیت لحم۔ بیت المقدس کے نزدیک ایک چھوٹا سا قصبہ جہاں حضرت مسیح کی ولادت ہوئی۔ اس مقام کو داؤد کا شہر بھی کہا جاتا ہے

بیت لحم کی ایک چرنی میں ؛ نورِ فزا کونین کا داور
شہرِ داؤد میں چمکا ہے ستارا اس کا ؛ جس نے اعدا کو دمِ ملے کے پشیمان کیا

چرنی۔ بیت لحم کی ایک سرائے میں جانوروں کو چارہ کھلانے کی ناند جس میں حضرت مسیح کو بسبب جگہ میسر نہ ہونے کے بعد ولادت رکھا گیا۔

آج چرنی میں ہوئی ذاتِ خدا جلوہ نما ؛ اِس سے بڑھکر نہ کوئی ہوگی کراماتِ کی بات
چرنی ہے کوہِ طور کا جلوہ لئے ہوئے ؛ کیسی ضیا ہے وہ رُخِ زیبا لئے ہوئے

جبریل۔ حضرت جبریل خدائے پاک کے مقرب فرشتوں میں ہیں۔ سب سے پہلے آپ نے ہی مقدسہ مریم کو خوش خبری دی تھی کہ آپ کے بطن مبارک سے حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوگی۔

دیا جبریل نے پیغام جس کا آکے مریم کو ؛ صحائف نے خبر دی جسکی وہ نورِ جہاں آیا

تارہ۔ (ستارہ) ۔حضرت مسیح کی پیدائش کے وقت ایک عجیب و غریب تارہ آسمان پر نمودار ہوا جس کو دیکھ کر چند علماء حضرت مسیح کی ولادت سے باخبر ہوئے۔

ہے نقیبِ ولادتِ عیسیٰ ؛ رونما اک عجیب اختر ہے

گڈریے۔ حضرت مسیح کی پیدائش کے وقت آسمان پر بہت تیز روشنی نمودار ہوئی اور ملائک کا ایک گروہ ظاہر ہوا۔ جنھوں نے چند گڈریوں کو جو میدان میں اپنے گلّے کی پاسبانی کر رہے تھے حضرت مسیح کی ولادت کا مژدہ سُنایا۔ یہ گڈریے فوراً حضرت

مسیح کے دیدار کے لیئے روانہ ہو گئے ؎

گڈریے چل دیے سجدے کو فوراً ستارہ رہبری فرما رہا تھا

مجوسی یا انجم شناس غیر معمولی ستارہ کو دیکھ کر چند نجوموں، قالیگروں اور عالموں نے آپ کی ولادت کا سُراغ لگایا تلاش کر کے آپ کو سجدہ کیا اور نذرانے پیش کیئے ؎

پہنچے جیرنی تک اسی کی رہنمائی میں مجوس ؛؛ مشرق میں نوری ستارے کو درخشاں دیکھ کر

مجوسی چل دیئے اسدم ستارہ ہو گیا رہبر ؛؛ انھیں تھی جستجو جسکی پتہ اس کا لگایا ہے

معجزات۔ حضرت مسیح نے بے شمار مریضوں کو شفا بخشی حتیٰ کہ آواز دیکر (قم بأذنی) مُردوں تک کو زندہ کر دیا ؎

وہ جس نے کر دیا اچھا مریضوں کو اشارے سے وہ جس نے پاؤں کی ٹھوکر سے مُردوں کو جلایا ہے

شفا دیتا ہے بیماروں کو نابینوں کو گونگوں کو

جلا دیتا ہے مُردوں کو یہ قدرت ہم بھی دیکھیں گے

لعزر۔ چار دن کا ایک مُردہ جس کو حضور نے آواز دیکر زندہ کیا ؎

لعزر کو پھر جلایا اعجاز اللہ اللہ

موت و حیات ان کا ادنیٰ سا ہے اشارا

ہم تری قدرت کے قائل ہو گئے ؛؛ خالی جب لعزر کی تربت دیکھ لی

طوفان۔ ایک مرتبہ حضور اپنے حواریوں کے ہمراہ کشتی میں سفر کر رہے تھے یکایک سمندر میں تلاطم برپا ہو گیا کشتی غرقِ آب ہونے لگی۔ آپنے فوراً ہوا اور پانی کو ڈانٹا سمندر اسی وقت ساکت ہو گیا ؎

طوفان سے بچائی کشتی حواریوں کی ؛ حاضر ہوا مدد کو جس نے جہاں پکارا

کلوری (گلگتا) بیت المقدس کی ایک کھوپڑی نما پہاڑی کا نام جہاں حضرت مسیح کو صلیب پر چڑھایا گیا ہ

ایماں پہ جان دیتے ہیں ہنس ہنس کے دوستو
ہوتے ہیں مر کے زندہ شہیدانِ کلوری

زمانے کو دکھایا حق پہ ہوتے ہیں فدا ایسے ؛ نمازِ عشق پڑھتے ہیں شہیدِ گلگتا ایسے

صلیب۔ (سُولی۔ دار) جس پر حضرت مسیح کو چڑھایا گیا۔ انکے ہاتھ پاؤں میں لوہے کی میخیں ٹھونکی گئیں۔ سر پر کانٹوں سے بنا کر تاج رکھا اور دو ڈاکوؤں کے درمیان آپ کو صلیب پر لٹکا دیا گیا۔ بعد میں ایک سپاہی نے آپ کی پسلی میں بھالا بھونک دیا جہاں سے خون اور پانی بہنے لگا ہ

سُرخ چوغہ زیبِ تن اور زیبِ سر کانٹوں کا تاج
اس طرح ظالم اسے پیدل سفر کو لے چلے

پسلی چھدی تو پیار کا چشمہ اُبل پڑا ؛ دھارا لہُو کا واقعی آبِ سبیل ہے
افسانۂ وفا میں نیا رنگ بھر گئے ؛ چڑھ کر مسیح دار پہ کیا کام کر گئے

برابا۔ ایک بدنام سفاک ڈاکو جس کو گرفتار کیا گیا تھا۔ منصف نے ہجوم سے کہا کہ دستور کے مطابق عید پر ایک قیدی کو رہا کیا جاتا ہے۔ کس کو رہا کیا جائے۔ عیسیٰ ابن مریم کو یا برابا ڈاکو کو۔ ہجوم نے چیخ چیخ کر مانگ کی کہ برابا کو رہا کر دیا جائے اور عیسیٰ کو مصلوب کیا جائے ہ

ٹھکرا دیا تھا جس کو ہر ایک نے سمجھ کے کفر
تم نے اسی صلیب کو ایماں بنا دیا

ڈاکو۔ وقتِ مرگ صلیب پر لٹکے ہوئے دو ڈاکوؤں میں سے ایک حضرت مسیح پر ایمان لے آیا۔ چنانچہ آپ نے جانکنی کی حالت میں اس سے کہا آج ہی تو میرے ساتھ فردوس میں ہوگا۔

ڈاکو کو وقتِ مرگ بھی جنت ہوئی نصیب
کلمات خوشگوار سُنائے صلیب نے

ایک ذرا سی بات پر ڈاکو پہ رحمت ہوگئی ؛؛ ایک طرف جو ہو رہا تھا ساتھ قربانِ صلیب

زندہ ہونا۔ حضرت مسیح اپنے قول کے مطابق تیسرے دن مُردوں میں سے زندہ ہوگئے۔ اس واقعہ کی یادگاری میں ایسٹر یا عیدِ قیامت منائی جاتی ہے۔

موت کا سر ہے جھکا عیدِ قیامت آئی ؛؛ جی اُٹھا ابنِ خدا عیدِ قیامت آئی
ابنِ مریم پہ میری جان فدا ہے یارو ؛؛ مر کے جو قبر سے پھر آج جیا ہے یارو
تیسرے دن فتح پا کے موت پر ؛؛ بے سہاروں کا سہارا جی اُٹھا

مُبارک جمعہ۔ جمعہ کا وہ دن جب حضرت مسیح کو صلیب دی گئی اس کو گُڈ فرائیڈے یا مبارک جمعہ کہتے ہیں۔

گتسمنی۔ یہ ایک باغ ہے جو یروشلم کے نزدیک ہے اپنی گرفتاری سے قبل حضرت مسیح نہایت غمگین ہو کر اس باغ میں خدا سے دُعا مانگنے گئے اور دشمنوں نے وہیں آکر آپ کو گرفتار کر لیا۔

یہ وہی راہِ المناک ہے گتسمنی کی ؛ کوہِ زیتون کا دامن بھی وہی ہے ابتک

توما۔ حواریوں میں سے ایک حواری جو شکی مزاج واقع ہوا تھا حضرت مسیح کے زندہ ہو جانے کی خبر سُنکر اس نے کہا تھا کہ جبتک مَیں ان کے زخموں میں اپنی انگلیاں نہ ڈال کر دیکھ لوں یقین نہ کروں گا۔ چنانچہ آپ اس کے سامنے ظاہر ہوئے اور اپنے زخموں کے نشان اس کو دکھلائے۔ ؎

ہر زخم دِلربا میرے دل کو عزیز ہے ؛ جو بدگمان توما کو دکھلاکے چل دیئے

آمدِ ثانی۔ حضرت مسیح نے وقتِ صعود وعدہ کیا تھا کہ میں دوبارہ دُنیا میں آؤں گا اور آسمان کی بادشاہت زمین پر قائم کروں گا۔ ایماندار آپ کی آمدِ ثانی کے منتظر ہیں ؎

وہ چڑھ کر بادلوں پر آرہے ہیں ؛ مَیں اُن کی آمدِ ثانی کے صدقے

چند خصوصی موضوعات جو مسیحی شاعری کی رُوح رواں ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں تاکہ مسیحی کلام کو سمجھنے میں سہولیت ہو۔

ولادتِ حضرت مسیح (بڑا دِن یا کرسمس)

حضرت آدم علیہ السلام کے گنہگار ہو جانے کے بعد آپ کو باغِ عدن سے نکال دیا گیا اس کے بعد انسان کی مغفرت کے لئے کوئی سبیل نہ تھی۔ جنّت کے دروازے اسکے لئے بند کر دیئے گئے تھے۔ اس فردوسِ گمشدہ کو حاصل کرنے کے لئے کوئی راہ نہ تھی چنانچہ

خداوندکریم نے جو منبع مہر و اُلفت ہے انسان کی محبت سے مجبور ہوکر اس کی مخلصی کے لئے حضرت عیسیٰ (رُوح اللہ یا ابنِ خدا) کو مجسّم کرکے دُنیا میں بھیجا۔ چنانچہ آپ نے مقدسہ مریم کے بطنِ مُبارک سے جنم لیا۔ بعد ولادت آپ کو بیت لحم قصبہ کی ایک چرنی میں رکھا گیا اُس وقت آسمان پر ایک عجیب و غریب ستارہ نمودار ہوا۔ جس کو دیکھ کر منجموں نے آپ کی ولادت کا پتا لگایا اور اس ستارہ کی رہنمائی میں جاکر آپ کو سجدہ کیا۔ نذرانے پیش کئے۔ اُس وقت چند گڈریے بھی آپ کو سجدہ کرنے پہنچے۔ آپ کی پیدائش کے متعلق انبیائے کرام کی معرفت بہت پہلے پیشین گوئیاں کردی گئی تھیں۔

ولادتِ مسیح کی تقریب ہر مسیحی کے لئے مسرت و شادمانی کا باعث ہوتی ہے۔ ہر طرف عجیب کیف و مسرت طاری رہتا ہے۔ ہر شے میں زندگی دکھائی دیتی ہے۔ ان تمام مناظر کو شاعرانہ رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔

صلیب۔ واقعاتِ صلیب ایک محبوب شاعرانہ موضوع ہے۔ اس میں وہی وسعت ہے جو واقعاتِ کربلا میں موجود ہے۔ اس میں حضرت مسیح پر ڈھائے گئے ظلم و ستم۔ شاگردوں کی بے وفائی۔ صلیب پر موت وغیرہ کا ذکر بڑے دردناک انداز میں ہوتا ہے۔ مسیحی شعراء نے مرثیے۔ قطعات۔ رُباعیات۔ سلام سب کچھ کہا ہے۔

ایسٹر مُبارک جمعہ کے دن آپ کو صلیب پر شہید کیا گیا اُسی روز آپ کو قبر میں رکھا گیا سنیچر کے دن آپ کا جسدِ مُبارک قبر میں رہا۔ اور تیسرے روز یعنی اتوار کو آپ اپنے قول کے مُطابق زندہ ہو گئے یہ دن ایسٹر یا عید قیامت کہلاتا ہے۔ اس موضوع میں حضرت مریم کی آہ وزاری و سنیچر کی شب میں اقربا کی بے قراری کا ذکر ہوتا ہے۔ پھر ایسٹر یعنی حضرت عیسیٰ کے زندہ ہونے کے واقعات پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

بپتسمہ۔ یہ ایک مُقدّس مذہبی رسم ہے جس کا پورا کرنا ہر مسیحی پر فرض ہے۔ جب کوئی شخص مسیحی مذہب قبول کرتا ہے تو اس کو بپتسمہ (اصطباغ) دیا جاتا ہے۔ گویا یہ ایمان کے اقرار کا ظاہری نشان ہے۔ حضرت مسیح نے بھی بپتسمہ لیا تھا اس کے دو طریقے رائج ہیں یا تو پانی میں غوطہ دیا جاتا ہے یا سر پر تقدیس شدہ پانی سے باپ (خدا) بیٹا (مسیح) اور رُوح القدس کے نام سے چھینٹے دیے جاتے ہیں۔

پاک عشاء۔ یہ ایک سنجیدہ و مقدّس رسم ہے جو حضرت مسیح کی موت سے قبل ان کی عید فسح میں شرکت کی یادگاری میں منائی جاتی ہے۔ عید فسح یہودیوں کی بڑی عید تھی جو اس بات کی یادگاری میں منائی جاتی تھی کہ خدا نے ان کو مصر کی غلامی سے آزاد کیا تھا۔

تعارف

اردو زبان اہلِ ہند کا مشترکہ سرمایہ ہے اس کی نشو ونما ترقی و ترویج میں ملک کے ہر حصّہ اور ہر مذہب کے لوگوں نے برابر کا حصّہ لیا ہے مگر بدقسمتی سے مسیحی شعرار اُدبار کی کاوشیں ابتک تذکرہ نویس حضرات کی مرہونِ منّت نہ ہوسکیں حالانکہ تذکروں میں یوروپین مصنفین و شعرار کے نام تو نظر آتے ہیں لیکن کسی ہندوستانی مسیحی ادیب یا شاعر کا ذکر نہیں ملتا۔ گو ہر دور میں ہندوستانی مسیحی شعرار حضرت مسیح کی توصیف و تمجید میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے ہیں لیکن کئی وجوہ کی بنا پر یہ نگارشات ادبی محفلوں تک نہیں پہنچ سکیں اور ہمارے ادیب و شاعر گمنامی میں ختم ہوگئے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ چند مسیحی رسالوں کی اشاعت سے شعرار کو منظر عام پر آنے کا موقع ملا۔

اس سلسلے میں راقم الحروف کے دو ایک مقالے رسالہ آجکل دہلی شانِ ہند دہلی۔ زندگی دہلی اور سہ ماہی مجلّہ ہما لکھنؤ میں شائع ہوئے۔ نیز مسیحی ادیب و شاعرِ بے مثال جناب پادری ایس ایس ریحانی لکھنوی مرحوم کی مرتب کردہ پیغام حیات کو اس موضوع پر مستحسن قدم کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ہند کے مسیحی شعرار کا جامع اور مکمل تذکرہ پیش کرنے کی یہ پہلی سعی ہے۔

شعرار کا تذکرہ ترتیب دینا ایک دُشوار امر ہے۔ چونکہ یہ کام

تنقید کے زمرہ میں آتا ہے۔ نقاد کے فرائض بہت اہم اور مشکل ہیں شاعر یا ادیب جو چاہتا ہے لکھ دیتا ہے لیکن نقاد اس کے لکھے ہوئے کو خود سمجھتا ہے۔ دوسروں کو سمجھاتا ہے اس کی خوبیوں اور عیبوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ صحیح تنقید اسی کو کہا جاتا ہے جس میں غیر جانبداری سے کام لیا جائے۔ فنکار کے روشن اور تاریک، دونوں رُخ قاری کے سامنے پیش کر دیئے جائیں۔ اگر محض خوبیوں کا اظہار کیا جائے گا تو وہ مدح کہلائے گی۔ اگر محض عیوب پر نظر رکھی جائے گی تو وہ عیب جوئی سے تعبیر کی جائے گی۔ اسلئے نقاد کا فرض ہے کہ وہ ایمانداری و انصاف سے دونوں پہلو روشن کر دے۔ اس کتاب کی ترتیب میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے اور بے لاگ تبصرہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بہت سے فنکار اپنے فن کی تعریف سُننا پسند کرتے ہیں لیکن وہ عیوب اور لغزشوں کو سننا گوارا نہیں کرتے۔ ایسے فنکار حقیقی معنوں میں فنکار نہیں ہوتے۔ ترقی انھیں لوگوں نے کی ہے جنھوں نے اپنی لغزشوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا اور اُن سے احتراز کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

اس کتاب کی ترتیب میں مندرجہ ذیل باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے

۱۔ مسیحی رسالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی شعراء کی تعداد کافی بڑی ہے۔ یہ ایک صحت مند اور امید افزا بات ہے لیکن اس طویل

فہرست میں بہت کم شعراء ایسے ہیں جنھوں نے باقاعدہ کسی اُستادِ فن کے قدموں میں بیٹھ کر استفادہ کیا ہے۔ اکثر شعراء ایسے ہیں جو کسی سے اصلاح لینا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ اسلئے ان کی شاعری تُک بندی ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کو وزن اور صحتِ زبان کسی چیز کا علم نہیں۔ اس تذکرے میں ایسے شعراء کو شامل نہیں کیا گیا۔

۲۔ جن شعراء کی ایک ہی زمین میں یا ہم قافیہ وہم ردیف غزلیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان کو تذکرے میں درج کر دیا گیا ہے اسکے علاوہ ہر شاعر کی کم از کم ایک مکمل غزل بغیر کسی ترمیم کے شامل کی گئی ہے تاکہ قاری کو شاعر کا مقام تعین کرنے میں دُشواری نہ ہو۔

۳۔ تمام مسیحی مقبول موضوعات مثلاً عید ولادت مُبارک جمعہ عید قیامت وغیرہ پر کافی کلام پیش کیا ہے تاکہ پڑھنے والے شعراء کے رنگین تخئیل۔ بُلند پروازی اور حُسن زبان سے لطف اندوز ہو سکیں۔

۴۔ اوّل صفحات میں چند قدیم شعراء کا تذکرہ ہے جو ہمارا بہت قیمتی سرمایہ ہے۔

اِس کتاب کی ترتیب میں مجھے شعرائے کرام کے تغافل پر افسوس ہے۔ میرے کئی خطوط لکھنے کے باوجود اُنہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ مرحوم شعراء کے عزیز و اقارب اور احباب سے بھی یہی شکایت ہے۔

مَیں اُن تمام شعراء احباب کا ممنون ہوں جنھوں نے میری

طلب پر نہ صرف اپنا کلام مع سوانح ارسال فرمایا بلکہ دوسرے شعراء سے بھی مجھے روشناس کرایا

مرحوم حضرت ریحانی لکھنوی کا ذکر کرنا بہت اہم ہے جنھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی اور اپنے مفید مشوروں سے مجھے نوازا۔ خدائے کریم انھیں کروٹ کروٹ جنت عنایت کرے۔

جناب ڈاکٹر سیموئیل وی بھجن طالب شاہ آبادی کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان فراموشی ہوگی۔ اُنہوں نے اس مسودّے پر نظر ثانی کی اور اس کی اشاعت کے لئے راہیں ہموار کیں۔

مَیں اُتّر پردیش اردو اکاڈمی کا احسان مند ہوں جس نے اس کتاب کی اشاعت کے لئے جُزوی مالی اِمداد دیکر میری ہمّت افزائی فرمائی۔ بہن سراج سخی، علاّمہ گریفن جانز شرر لندن مدظلہ منشار پوری جناب بیگ اجمیری ادارہ ہینری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اِسلامک اسٹیڈیز نیز اپنے قدردان دوست ڈیوڈ اے بھٹّی مقیم اسکاٹ لینڈ کا بہت شُکر گذار ہوں جنھوں نے مجھے مالی تعاوُن دیکر کتاب کی اشاعت کو ممکن بنایا۔ خدا ان حضرات کو ہمیشہ اپنی برکتوں سے نوازے۔

ناچیز:—

ڈی۔ اے۔ میں یسین قربان

سہارن پور
۲۰ نومبر ۱۹۸۲ء

چند قدیم شعراء کا تذکرہ

مسیحی شعراء کے حالات و کلام کی تحقیق و جستجو کے سلسلے میں خوش قسمتی سے مجھے دو قدیم کرم خوردہ نسخے ہاتھ لگ گئے دونوں نسخے صفدر علی نے تالیف کئے ہیں۔ کتاب کا نام غذائے روح ہے اسکے دو ایڈیشن شائع ہوئے پہلے ایڈیشن کے نسخے میں ٹائیٹل اور چند صفحے غائب ہیں اور صفحہ ۱۵۸ کے بعد کچھ نہیں ملتا۔ اسلئے کتاب کے حجم کا تعین نہیں کیا جا سکتا البتہ دوسرے ایڈیشن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۸۷۵ء میں چھاپی گئی۔ اور آٹھ آنے (پچاس پیسے) قیمت تھی پہلے ایڈیشن میں مولف کے یہ چند جملے قابل غور ہیں جن کا اطلاق دوسرے ایڈیشن پر بھی ہوتا ہے اور اس تالیف پر بھی

"مولف نے کوشش کی کہ جن شاعروں کے طبع زاد اس رسالے میں درج ہوئے ہیں اُن کے نام نامی اور حالاتِ گرامی کا ذکر کرے لیکن افسوس ہے کہ کئی سبب سے اس وقت تک چند صاحبوں کے سوا باقیوں کی بابت آگاہ نہ ہو سکا۔ کہ وہ کس کے طبع زاد ہیں جتنے صاحبوں کا جسقدر حال معلوم ہو سکا مختصراً ذیل میں لکھ دیا ہے آئندہ اگر معلوم ہو سکے گا تو طبع ثانی میں درج کیا جائے گا۔"

دوسرا نسخہ ۱۸۸۹ء میں ریلیجس بک سوسائٹی لاہور نے چرچ مشن

کانگریگیشنل پریس الہ آباد میں چھپوا کر شائع کیا۔ اس کی قیمت بھی آٹھ آنے (پچاس پیسے) ہے بڑی تقطیع کے ۳۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اوّل ایڈیشن کے ضمیمہ اوّل کے ۵ صفحات میں اُن اصنافِ سخن کی تشریح و تصریح کی گئی ہے جو اس کتاب میں شامل ہیں یعنی رُباعی۔ غزل۔ قصیدہ۔ قطعہ۔ مثنوی۔ ترجیع بند۔ مسمّط اور مستزاد وغیرہ۔ اسکے بعد صفحہ ۶ سے ۱۰ تک چند شعراء کے مختصر حالات درج ہیں۔

رسالے کے مطالعے سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:۔

۱۔ اس دَور کے مسیحی شعراء نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

۲۔ رسالے میں صرف نعتیہ اور حقانی و اخلاقی شاعری کو جگہ دی گئی ہے۔

۳۔ شعراء کا مقصد حضرت مسیح کی تعریف و توصیف کرنا ہے۔

۴۔ اس میں جن شعراء کا کلام شامل ہے ان کے نام اور کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نو مسیحی ہیں اور بیشتر اسلام سے حلقۂ مسیحیت میں داخل ہوئے ان کا کلام ان کے مذہبی جوش و خروش حضرت عیسیٰؑ سے عقیدت اور بائبل پر اعتقاد و ایمان کا اظہار ہے۔

۵۔ تمام شعراء کی زبان صاف، شستہ اور پاکیزہ ہے البتہ ایسے متروک الفاظ کا استعمال جو شاید اس زمانے میں رائج تھے جا بجا ملتا ہے کچھ الفاظ کے ہجے بھی مختلف ہیں۔ محاورات کا برمحل استعمال قابلِ تعریف ہے کلام محاسنِ شاعری سے مزین ہے۔

۶۔ شعر میں وزن قائم رکھنے کے لئے بائبل کے اکثر ناموں میں حسبِ

ضرورت تصرف کیا ہے مثلاً پیلاطوس سے پیلاط۔ لعزر سے لعازر۔
یروشلم سے ایروشلم گتسمنی سے گتسمن۔ پطرس سے پطر وغیرہ۔

دوسرا نسخہ آفتاب صداقت صفحہ ۹۷ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۱۴۲ کے بعد کچھ نہیں ملتا۔ درمیان سے صفحہ ۱۲۹ اور ۱۳۰ غائب ہے یہ ایک مکمل مثنوی ہے جو متی کی انجیل کے مکمل ۲۸ ابواب پر مشتمل ہے انجیل مقدس کو سامنے رکھ کر منظوم کیا گیا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس شاعر کا صحیح نام و تخلص کہیں نہیں ملتا۔ خیال ہے کہ یہ کسی ولیم میچن کا نتیجہ فکر ہے۔ مسیحی موضوع پر یقیناً یہ پہلی مکمل مثنوی ہے جو بحر متقارب مثمن (مثنوی بدر منیر کی بحر) میں لکھی گئی ہے۔

مثنوی کے مطالعہ سے شاعر کے قادر الکلام ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ انجیل مقدس کی آیات کو بغیر ردّ و بدل کئے منظوم کر دینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ کاش اس شاعر کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتیں۔

اس مثنوی کے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔ ؎

اقوال حضرت مسیح

مگر تم نہ کرنا کبھی ایسا کام | جو چاہے بڑا ہونا ہو وہ غلام
کہ ہے ابنِ آدم نہیں اسلئے | کہ خدمت کو لے بلکہ خدمت کرے
ہے آیا کہ بہتیروں کے واسطے | خوشی سے وہ جان اپنی فدیے میں دے

نابینا کو شفا

وہ یریحو سے رخصت ہوئے جس گھڑی
بڑی بھیڑ اک ان کے پیچھے ہوئی

سرِ راہ بیٹھے تھے دو کور واں
سُنا جا رہا ہے شفیع جہاں

لگے کہنے چلا کے خستہ جگر
کہ اے ابنِ داؤد تو رحم کر

اُنھیں ڈانٹ کر وے لگے کہنے سب
کہ چُپ ہو کرو تم نہ شور و شغب

لگے کرنے وہ اور بھی شور و شر
کہ اے ابنِ داؤد تو رحم کر

بُلا کر انھیں یسوع نے یوں کہا
ہو تم چاہتے ہیں کروں تم سے کیا

انہوں نے کہا ہے یہی التجا
کہ تو کر دے ہم لوگوں کے چشم وا

خداوند نے ترس دونوں پہ کھا
ان آنکھوں کو چھو اُن کو بینا کیا

وہ دو اندھے جس وقت بینا ہوئے
خداوند کے پیچھے پیچھے چلے

فقیہہ و فریسیوں پر عتاب (متی ۲۳ : ۱ تا ۱۲)

کہا چیلوں سے کھول اپنی زباں
اور ان لوگوں سے جو جمع تھے وہاں

زمیں پر فقیہہ و فریسی دیں
ہیں موسیٰ کی گدی پہ وہ جانشیں

جو کہتے ہیں وہ اُس کو مانو مدام
مگر مت کرو ان کی مانند کام

کہ اپنی زباں سے جو کہتے سخن
نہیں پورا کرتے ہیں اپنا بچن

گراں بار رکھتے بدوشِ دِگر
لگاتے نہیں اپنی انگلی مگر

یہ سب جتنے کرتے ہیں دنیا میں کام
اِسی واسطے تاکہ دیکھیں عوام

بناتے ہیں تعویذ اپنے بڑے — کنارے بھی چوڑے ہیں پوشاک کے
ضیافت میں ہوتے ہیں بالانشیں — معابد میں بر تختِ اعلیٰ تریں
وہ بازاروں میں چاہتے ہیں سلام — ہیں خوش گر کہیں ان کو ربّی عوام
لہٰذا جو تم میرے شاگرد ہو — ہو تم بھائی آپس میں میری سنو
اگر ہے کوئی شخص تم میں بڑا — وہ خادم بنے تم میں ہر ایک کا
بنائے گا اپنے تئیں جو بڑا — وہ جائے گا اک روز چھوٹا کیا
کرے گا مگر جو کہ خدمت پسند — کیا جائے گا بس وہی سربُلند

متی ٢٣ : ٢٥ تا ٢٨

ہو افسوس تم پر نویسندگاں — ریاکار تم جو فریسی ہو یاں
کہ پیالے کو کرتے ہو باہر سے صاف — ہے اندر مگر لُوٹ سب جو خلاف
اے اندھے فریسی رکابی و جام — کرو صاف اندر و باہر مدام
ہو مانند تم لوگ اس قبر کی — کہ جس پہ ہے رہتی سفیدی پھری
ہے اوپر سے وہ خوبصورت مگر — کریں اسکے اندر اگر ہم نظر
تو مُردوں کی پائیں گے واں ہڈیاں — نجاست سوا نہ ملے گا وہاں
اسی طور ہو ظاہرا دیندار — دکھاتے ہو اپنے تئیں راستکار
مگر اپنے باطن میں کب ہو کھرے — ہو بے دین تم اور ریا سے بھرے

متی ٢٦ : ٣٦ تا ٥٦

خداوندان سے یہ جب کہہ چکا — رواں ہو کے تب گتسمنی[۱] میں گیا
یہیں رہنا چیلوں سے اس نے کہا — کہ جبتک وہاں جاکے مانگوں دُعا
کہا اس لئے ہے مرا جی غمگین جاں — نشاں موت کے ہو رہے ہیں عیاں
کہا ان سے تم لوگ ٹھہرو میاں — مرے ساتھ کچھ دیر جاگو یہاں
وہاں سے وہ کچھ دُور آگے بڑھا — دُعا کرنے کو منہ کے بل وہ گرا
دُعا میں کہا ہو سکے اے پدر — تو یہ جام ٹل جائے مجھ سے مگر
نہیں چاہتا جیسا میں ویسا ہی — مگر تو ہے جو چاہتا ہو وہی
ہوا تھا زباں سے سخن نہ ادا — کہ اُن بارہ میں اک یہوداہ جو تھا
بڑی بھیڑ تلوار اور لاٹھیاں — لئے آگیا ازطرف کاہناں
پکڑوانے والے نے یوں تھا کہا — پکڑ لینا بوسہ میں لوں جس کا جا
کہا آکے ربّی ہو تجھ کو سلام — لیا بوسہ اس کا بہ پیش عوام
کہا اس سے تب یسوع نے اے میاں — تو کرلے جو کرنے کو آیا ہے یاں
لگا بھیڑ سے کہنے شاہِ جہاں — کہ تم لے کے تلوار اور لاٹھیاں
چلے ہو پکڑنے مجھے تم یہاں — پکڑتے ہیں جس طور سے رہزناں
میں ہیکل میں تعلیم دیتا تھا روز — نہیں پکڑا تم نے مجھے تا ہنوز
ہوا جو ہوا ہے یہاں اس سبب — کہ نبیوں کے پورے نوشتے ہوں سب

گرفتاری

متی ۲۷ : ۲۷ تا ۵۲

قلعے میں اُسے تب سپہ لے گئی — جمع اس کے چاروں طرف فوج کی

---

۱ باغ گتسمنی۔ متی ۲۶/۳۶

اُتار اس کی پوشاک ننگا کیا — اُسے قرمزی چوغہ پہنا دیا۔
وہ سب زانو کو ٹیک کر سامنے — اُسے ٹھٹھوں میں تب اڑانے لگے
وہ کہتے تھے اے بادشاہِ یہود — ہو آداب کرتے ہیں جھک کر سجود
ہوا ختم جب ان کا ٹھٹھا و مار — انھوں نے لیا چوغہ اس کا اُتار
کیا اس کو مصلوب تب چوب پر — لئے بانٹ کپڑے قرعہ ڈال کر
اُسی وقت تھے ساتھ دو رہزناں — جو مصلوب تھے دہنے بائیں وہاں
اُسے سر ہلا کہتے تھے بد زباں — گذرتے اُدھر تھے جو خورد و کلاں
اے مقدس کے ڈھا دینے والے خدا — مہربانی سے اپنے کو تو بچا
اگر درحقیقت ہے ابنِ خدا — صلیب اپنی سے اب ذرا نیچے آ
رؤسا بزرگاں نویسندگاں — یہی کہتے تھے وے تمسخر کناں
بچایا ہے اوروں کو پھر کیوں نہیں — بچا سکتا یہ شخص اپنے تئیں
شہِ اسرائیل گر اُتر آئے اب — تو ایمان اس پر ابھی لائیں سب
اسی طور سے ساتھ کے رہزناں — جو مصلوب تھے کرتے تھے لعن طعن
وہاں دوپہر سے لے تا سہ پہر — اندھیرا تھا چھایا ہوا ملک پر
باواز پھر اس نے فریاد کی — ازیں بعد یسوع نے جاں اپنی دی
جو مقدس کا پردہ تھا لٹکا ہوا — وہ پھٹ کر سراسر دو پارہ ہوا
چٹانیں گئیں پھٹ و لرزی زمیں — جو قبریں تھیں خود آپ سے کھل گئیں



انتخاب از غذائے رُوح

آزاد (پنجابی)

نام نامی منشی لبُوڑا مل تخلص آزاد۔ ساکن پنجاب۔ پنجاب کورٹ میں چیف مترجم تھے۔ ۱۸۵۹ء میں محافظ دفتر صاحب کمشنر جہلم مقرر ہوئے تھے۔ بہت ذہین۔ قابل اور تیز طبع شخص تھے۔ تین چار زبانوں میں دخل رکھتے تھے۔ ایک رسالہ التجائے عاصی شائع کیا جو نایاب ہے آپ نے خدائے واحد یسوع مسیح کی حمد و ثنا کی ہے اور حضرت مسیح کے چند معجزات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ کلام نہایت بلند و ارفع ہے۔ صنائع بدائع سے خوب کام لیا ہے۔

نمونۂ کلام

حمد و ثنا مسیح پاک

خلق و عالم کا مدعا ہے تو — مظہر ذاتِ کبریا ہے تو
چشمۂ آبِ زندگی تو ہے — میری آنکھوں کی روشنی تو ہے
رحم حد سے گذر گیا تیرا — شکر کیونکر کروں ادا تیرا
رنج میرے عوض اُٹھائے تو — جان سے میرے بدلے جائے تو
آہ میرے سبب پئے تعذیر — تو اٹھاوے صلیب بے تقصیر

تیرے پیارے بدن میں اے پیارے | ہائے میخیں گڑیں تظلّم سے
تیری الفت گماں سے باہر ہے | فہم و ادراک اس میں قاصر ہے
تا دمِ زیست کاش اے داور | رہے تیرا صلیب مدّ نظر
میرے ایمان کو زیادہ کر | اپنے رستے میں ایستادہ کر
دلِ غم گین کو تسلّی دے | اپنے عرفان میں ترقی دے

حمد و ثنا روح القدس

دلِ مردہ کی زندگی ہے تو | رہ عقبیٰ کی روشنی ہے تو
تیری بخشش ہے توبہ و ایماں | تجھ سے حاصل مسیح کا عرفاں
تو تسلّیِ دل کا ہے بانی | تو ہے مبدائے عشقِ ربّانی
دلِ ابتر کا موجبِ تفسیر | راز ہائے نجات کی تفسیر
پیشگیِ نشاطِ جنّت ہے | چشمِ باطن کی تو بصیرت ہے
کر تو روشن مرا دلِ ناشاد | میرے ظلمت کدہ کو کر آباد
مجھے ایمان تو عنایت کر | مجھ گنہ گار کی شفاعت کر
مرحبا مرغِ آسماں پرواز | مجھ کو تقدیس کے سکھا سب راز

کئی منظوم معجزوں میں سے لعزر کے مرنے کے بیان میں یہ اشعار دیکھئے اور محاسنِ شاعری کی داد دیجئے۔ (یوحنا ۱۱ : ۱ تا ۴۴)

چکھی لاذر نے موت کی تلخی | ہوگئے لاچار جانِ شیریں دی

ھ۱ واقعہ صلیب متی ۲۷ : ۳۲ تا ۴۴

وہ گُلِ تازہ ہوا صرفِ خزاں
چھوڑا داغِ الم بہ مہجوراں

دیکھ جو باغ باغ ہوتے تھے
شکلِ بلبل خزاں میں روتے تھے

ہائے افسوس وہ گُلِ رعنا
از سرِ شاخ غار میں پہنچا

یہ سنِ وسال کیجئے انصاف
یہ تنِ صاف یہہ رُخِ شفاف

یوں ملے خاک میں ہزاروں افسوس
ہائے صد حیف و بار بار افسوس

جب وہ مہرِ سپہرِ رعنائی
کر گیا یوں غرُوب اے بھائی

چشم ہم چشم ہائے کے نزدیک
سارا عالم ہی ہو گیا تاریک

کوئی منہ ڈھانپ ڈھانپ روتا تھا
کوئی کلفت سے جان کھوتا تھا

سینہ کوباں کوئی تھا فرقت سے
رو نہ سکتا تھا غم کی شدّت سے

کوئی ششدر بصورتِ دیوار
کوئی منہ تاکے حیراں آئینہ وار

وے نہ تسکیں پذیر ہوتے تھے
یاد کر کر کے سارے روتے تھے

خداوند کا ایک مریضِ استسقا کو شفا دینا (لوقا ۱۴: ۱-۶)

ایک محتاج پُر ز رنج و بلا
مبتلا در مریضِ استسقا

بھوکوں مرتا تھا وہ بہ ناداری
تھا شکم پُر مگر ز بیماری

جاتا کس پاس چارہ کیا کرتا
شرم سے وہ تو پانی پانی تھا

پیٹ پھُولا تھا مثلِ نقّارہ
عازمِ کوچ تھا وہ آوارہ

معتکف نزدِ آبشار تھا وہ
شکلِ ماہی کے بے قرار تھا وہ

پانی کیا اپنا خون پیتا تھا
انتظارِ اجل میں جیتا تھا

پانی جی کا وبال تھا اوس کو — چھوڑنا پر محال تھا اوس کو
کوئی کرتا جو اس کو وعظ و پند — کہ تو کر ترک آب کو تا چند
ورنہ پانی تجھے ڈبوئے گا — مُفت میں جان اپنی کھوئے گا
گر تیرا چندے آب و دانہ ہے — چھوڑ پانی کو گر تو دانا ہے
آب تجھ کو مُضر سراسر ہے — تیرے حق میں یہ آبِ خنجر ہے
تب وہ دریا بہا کے آنکھوں سے — یہی کہتا تھا سخت رو رو کے
حالِ دل کچھ کہا نہیں جاتا — بن پانی رہا نہیں جاتا
اس کے نقصان سے میں ہوں آگاہ — سخت لاچار ہوں مگر واللہ!
نہوں نزدیکِ آب مجھ سے ہے دور — کہ ہوں اپنے مَرض سے میں مجبور
اپنی حالت سے آگہی پاکر — دل سے ایماں مسیح پر لاکر
سبت کے روز اوس کے پاس آیا — حالِ پُر اختلال دکھلایا
آبِ صحت کا تشنہ لب ہوکر — آیا اوس بحرِ رحم کے در پر
رحم اوس پر مسیح کو آیا — پیار سے پاس اپنے بٹھلایا
دم میں اوس کو مرض سے صحت دی — چلنے پھرنے کو خوب طاقت دی
نہ وہ پانی نہ شوقِ آب تھا پھر — برلبِ جو نہ وہ خراب تھا پھر
دیکھ یہ قدرتِ مسیحا ہے — سوچ یہہ رحمتِ مسیحا ہے.
وہ جوئے آبِ زندگانی ہے — زیست کا اوس کے پانی پانی ہے
جس نے اوس سے پیا یہی پایا — نہ پیاسا ابد تلک وہ ہوا
پڑھ کے اب تو یہہ واقعۂ رحمت — سوچ اے دل تو اپنی بھی حالت

گر ہے کچھ فکر روح والفتِ جاں
تو اسے حسبِ حال اپنے جاں

ہے تو مستقی اور گنہ ہے آب
شکلِ ماہی تو اوس میں ہے غرقاب

گرچہ کتنی سعی کرے دل سے
نہیں ممکن کہ اوس سے باز آئے

ہے گناہ کا مرض تیرے اندر
جب تلک وہ نہ دُور ہو یکسر

نہیں ممکن گنہ سے باز آنا
ہے محال اوس کو سہل ٹھہرانا

نیک بننے کی گو سعی کیجئے
تا بجاں اوس میں تند ہی کیجئے

لیک مطلق نہ فائدہ ہو گا
آب سے کب مرض ہوا اچھا

پر مرض سے تو آگہی پا کر
گر مسیحا کے جا کے قدموں پر

صدق دل سے تو اُس پہ لا ایماں
تا کہ ہو دفع یہ مصیبتِ جاں

قصیدہ

شب کو میں بسترِ غم پر جو بشکلِ محروم
موت کی فکر میں تھا یا س سے ازبس مغموم

تھی گناہوں سے وہ مایوسی حرماں کہ نہ پوچھ
سر پہ لبس قہر کی تلوار رہی تھی اک ہجوم

کبھی ناپاکیٔ دل کی تھی شکایت مجھ کو
تھی کبھی عمر گذشتہ سے ندامت ملزوم

شعلۂ آتشِ دوزخ تھا تصور میں کبھی
تھی کبھی شورِ قیامت کی مرے کان میں دھوم

اپنی ہستی پہ کبھی تھا یہ تاسف کہ اے کاش
پیدا ہوتے ہی کیا کیوں نہ گیا میں معدوم

طوقِ گردن تو نہ ہوتا یہ گناہ گر میرا
گھونٹتی دایہ گلا جبکہ تھا بچہ معصوم

الغرض تھا اسی حالت میں میں حیراں کہ مجھے
کان میں آ کے لگا کہنے مسیحِ مخدوم

لا تو ایماں کہ پائے گا نجاتِ ابدی
گرچہ کیسے ہی کئے تو نے ہوں فعلِ مذموم

تشنہ لب تو ہے تو میں چشمۂ آبِ حیواں　　تو گنہ گار تو میں شافعِ عاصی ہجوم
سُن کے یہ مژدۂ تسکینِ مُبارک اوس سے　　لا کے ایمان کیا میں نے یہ مطلعِ منظوم
اے منجّی جہاں قادر و حی القیوم　　پاک تثلیثِ الٰہی کے مُبارک اقنوم[1]
ترس کھا ترس کہ بن جاؤں خدا ترس بہ زیست　　رحم کر رحم کہ ہوں موت کے پیچھے مرحوم
غم دے وہ غم کہ ملے جس سے تسلّی مجھ کو　　عیش وہ عیش کہ کر دے غمِ دُنیا معدوم
فکر وہ فکر کہ جس سے مِٹے فکرِ عقبیٰ　　سوچ وہ سوچ جسے سوچ نہوں میں مغموم
عقل وہ عقل کہ ہوں جہل گناہ سے معقول　　فہم وہ فہم کہ ہو رازِ شفاعت مفہوم
دے عمل ہاں وہ عمل جس سے ہو طاعت معمول　　علم وہ علم کہ ہو ہستئ دُنیا معلوم
محو کر محو مجھے وصل میں اپنا ایسا　　کہ ہو ہستی جُدا گانہ مری سب سے معدوم
نہ وہ افلاس دے جو تابِ قناعت نہ رہے　　نہ وہ دولت کہ رہوں دولتِ دیں سے محروم
میں گنہ گار بڑا ہوں تو منجّی[2] تو ہے　　عین لازم ہے جو سمجھوں اِسے لازم ملزوم
نہ مجھے دعوئ تقویٰ ہے نہ فخرِ خوبی　　نہ ہے شیخئ عبادت نہ بزرگئ علوم
صرف ناپاک ہوں خود اپنی نظر میں ایسا　　جیسا نفرت کوئی اپنے سے ہو کرتا مجذوم
دے مجھے طرزِ سخن وہ کہ سخن میں میرے　　ہوں تیرے رازِ شفاعت کے مسائل منظوم
بخش دے سادہ لوحی میں تو فضیلت کہ سدا　　لوحِ دل پر ہوں یہی تیرے فرائض مرقوم

کر مجھے قیدِ بغاوت سے تو ایسا آزاد
کہ رہوں تا بہ ابد حلم کا تیرے محکوم

---

[1] باپ۔ بیٹا اور روح۔ تینوں ایک ہیں۔　　[2] نجات دینے والا۔ لوقا ۲: ۱۱

غزل

کیوں نہ ہوئیں پاک رُوح وجسم وجاں تاثیر سے
مسئلہ تثلیث فی التوحید کی تحریر سے

شرم آتی ہے مجھے ناپاکی و تقصیر سے
ہوں مسیحا رو برو تیرے میں کس تدبیر سے

مٹ نہیں سکتی سیاہی نامۂ اعمال کی
لاکھ دفتر گو بھروں توبہ کی میں تحریر سے

آج تک میں ننگِ مذہب کرکے اعمالِ خراب
دین کو الزام ہی دیتا رہا تحقیر سے

کر تجلّی سے مجھے ایسا منوّر نورِ حق
جیوں شب دیجور اٹھتی مہر کی تنویر سے

گر گناہوں کا کفّارہ تو نہ کرتا اے مسیح
کس طرح بچتا کوئی اعمال کی تحریر سے

یا مسیح اب بخش دے آزاد کو اسکے گناہ
کرتا ہے توبہ وہ اب اپنے دلِ دلگیر سے

غزل

اے گورو اجل مجھ کو تیرا خوف نہیں ہے
یاں نقشۂ تصلیب مرے زیب جبیں ہے
مانا کہ گنہ گار کوئی مجھ سا نہیں ہے
پر میرے مسیحا سا منجی بھی کہیں ہے
دل میرا لگے کیونکر اب اشیائے جہاں پر
محبوب مرا جب بسرِ عرشِ بریں ہے
ہے فرقتِ تن وصلتِ جانانہ کا باعث
دیندار کی یہ زیست ہے کچھ موت نہیں ہے
ہوں گا نہ مسیحا سے کسی حال میں محروم
یہ نقش ہے اس پر جو میرے دل کا نگیں ہے
کر عفو میرے سارے گناہوں کو کرم سے
دل میرا جو اب انکے سبب سخت حزیں ہے
دُنیا کی نجاست سے جو آلودہ ہو ہر دم
سو وہ سگِ دُنیا تو کمینوں سے کمیں ہے
آزاد ہر اک چیز سے حاصل ہے سبق یاں
مکتب جسے کہتے ہیں وہ سب روئے زمیں ہے

اسبق

اسم گرامی رابرٹ گارڈنر ہے۔ یوریشین خاندان سے تھے۔ آپ کے دادا ہندوستان میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ آپ کے والدِ ماجد کا نام ہیری فرینگٹن گارڈنر تھا۔ آپ کی والدہ کریم النساء مسلمان خاندان سے مسیحی ہوئی تھیں آپ کے ایک بھائی پادری بارتھلمیو گارڈنر بھی شاعر تھے اور صبر تخلص کرتے تھے۔ ایک بہن صوفیہ گارڈنر تھیں ان کو بھی شعرو شاعری کا شوق تھا۔

آپ کے والد نے یو۔پی میں ضلع ایٹہ کے قصبہ مراچی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اسبق صاحب اسی قصبہ میں ۲۷ اگست ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ والد نے تینتیس برس کی عمر میں وفات پائی اور گھاونی میں گارڈنر خاندان کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

چنانچہ تینوں بچے صبر۔ اسبق اور صوفیہ ڈینیل سقراط نتھانی ایل گارڈنر کے پاس قصبہ گھاونی چلے گئے جہاں ان کی مستقل رہائش تھی۔ نتھانیل گارڈنر اور ان کے والد سلیمان شکوہ نے اِن بچوں کی پرورش کی۔

یہ خاندان اُردو علم و ادب کا دلدادہ تھا۔ خاندان میں شعروسخن کی محفل گرم رہتی تھی۔ ایسے ماحول میں ان بچوں کا شاعر بن جانا یقینی تھا۔

اسبق صاحب نے اپنے اشعار پر مرزا عباس حسین لکھنوی سے اصلاح لینا شروع کر دیا۔ پہلے آپ نے یکے بعد دیگرے شمیم اور نسیم تخلص رکھے۔ لیکن اپنے ماموں مرزا وحید الدین فلک کے مشورے سے شرق تخلص کیا اور ۱۹۰۵ء تک شوق نیے رہے لیکن ۱۹۰۵ء میں اپنا تخلص اسبق کر لیا جو آخر تک قائم رہا۔

بدایوں کے ایک مشنری امریکن پادری ڈاکٹر رابرٹ ہاسکنز اکثر گھاونی گارڈنر خاندان میں آیا کرتے تھے اسبق صاحب ان کی خدمت اور زندگی سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے بھی زندگی بھر مسیحی خدمت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فرماتے ہیں ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم ؛ شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

۲۰ر جون ۱۸۹۵ء میں آپ نے ایک امریکن مشنری کی بیٹی ایلن سے شادی کر لی اور اُن کے بڑے بھائی صابر نے کاسگنج کے پادری محبوب خاں کی بیٹی سے شادی کی۔ ان کی دوسری لڑکی کی شادی کاسگنج کے مشہور واعظ و مناظر پادری حسن رضا سے ہوئی تھی۔

۱۸۹۱ء سے اسبق صاحب نے کاسگنج میں پادری کا کام شروع کر دیا۔ ۱۸۹۵ء میں دہلی تبادلہ ہو گیا۔ لیکن چار ماہ بعد پھر تبادلہ ہوا اور مختلف مقامات میرٹھ، متھرا، علی گڑھ رہ کر ایٹہ آ گئے۔ ان دنوں ایٹہ میں مشاعروں کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ منور خاں ساغر، احمد خاں کیفی، شیخ حیات بخش رسا شاگرد داغ دہلوی، امیر حسن دلگیر اور تپش جیسے شعراء کا اجتماع تھا۔ رسا اور

اسبق کا شمار اساتذہ میں ہونے لگا اور دونوں میں نوک جھونک بھی ہوتی رہتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اسبق کا تبادلہ لاہور ہو گیا۔ اس وقت ان کی شہرت بام عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ کئی ادبی انجمنیں ان کی قیادت میں چلنے لگیں۔ لیکن ۱۹۱۷ سنہ میں ان کا تبادلہ ضلع سہارن پور و شاملی و تھانہ بھون ہو گیا۔ یہاں کی آب و ہوا ان کو راس نہ آئی اور ۱۹۲۳ سنہ تک شاعرانہ زندگی پر جمود کا عالم طاری رہا۔ ۱۹۲۴ سنہ میں آگرہ اور بلند شہر آگئے جہاں وہ مشن سپرنٹنڈنٹ بن گئے۔ اور غالباً ۱۹۲۹ سنہ میں ریٹائر ہوکر کاسگنج میں رہنے لگے۔ وہیں ۱۹۳۰ سنہ میں وفات پائی۔

قادر الکلام شاعر تھے۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے غزلیں۔ نظمیں۔ قصیدے۔ تاریخ۔ قطعے سب ہی کچھ کہا ہے لیکن سب نعتیہ اور اخلاقی ہے۔

عشقیہ کلام میں مجازی اور عارفانہ دونوں رنگ موجود ہیں۔ اشعار میں فصاحت و بلاغت ہے صرف و نحو کا درست استعمال ہے روز مرّہ اور محاورات کا استعمال برمحل ہوتا ہے۔ انداز بیاں دلنشیں ہے۔ انگریزی زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے۔

اُن کی اکثر غزلیں مسیحی گیت کی کتاب میں شامل ہیں۔ اور بوقت عبادت گائی جاتی ہیں۔

نمونۂ کلام

کہاں تک ہو بیاں شانِ مسیحا　　نبی تک ہیں غلامانِ مسیحا
جو مچھوڑے بھٹے ہوئے وہ ہادیِ دیں　　بنے آقا غلامانِ مسیحا
بہایا اس نے خوں دُنیا کی خاطر　　جہاں پر ہے یہ احسانِ مسیحا
فلک ہے قبضۂ قدرت میں اس کے　　زمیں ہے زیرِ فرمانِ مسیحا
خدا کا مرتبہ ہے اس کا رُتبہ　　خدا کی شان ہے شانِ مسیحا
تجھے اسبق بھلا کیا حشر کا ڈر　　کہ ہے تو زیرِ دامانِ مسیحا

غزل

تمہیں ظاہر ہو مجھ میں اور تم ہی باطن میں پنہاں ہو
مسیحا تم مرے دل ہو جگر ہو جسم ہو جاں ہو
خدا بھی ہو بشر بھی ہو بڑے بھی تم ہو چھوٹے بھی
تم ہی سے پوچھتے ہیں ہم کہو تم کیسے انساں ہو
کبھی مختار ہو آزاد ہو غالب ہو تم سب پر
کبھی تم دشمنوں کے ہاتھ میں سر در گریباں ہو
کبھی قادر ہو تم ایسے کہ مُردوں کو جلاتے ہو
کبھی خود مر گئے تم زیرِ زمیں اک جسم بے جاں ہو
یہی اسبق کا ہے ایماں تم مر کر ہوئے زندہ
پر ابد ہو خدا کے تخت پر تم شاہِ یزداں ہو

غزل

چھڑا کر سبکو یسوع کی محبت دِل میں آئی ہے
لُٹا کر مال دُنیا کا یہ دولت ہم نے پائی ہے
کہاں تعلیمِ انجیل اور کہاں تعلیم دُنیا کی
بھلائی پر بھلائی ہے بُرائی پر بُرائی ہے
شیاطین گھیرے رہتے ہیں گناہوں سے ہوں تنگ آ پنے
مسیحا کی دہائی ہے مسیحا کی دہائی ہے
لکھا یہ بھی ہوا پورا کہ یسوعؑ مَر کے جی اُٹھا
چھپائے موںؐہ اپنا کہ اس نے منہ کی کھائی ہے
نہ کیوں اب اسبق لاچار یسوع سے مدد مانگے
مقابل لوگ دُنیا کے ہیں شیطاں سے لڑائی ہو

کلام مجازی۔ غزل

پھر بہار آتے ہی زخم دل ہرا ہو جائے گا
ہو گی پھر وحشت نئی سودا نیا ہو جائے گا
اُس بُت بے پیر کی کیا دوستی کا اعتبار
آج میرا غیر کا کل آشنا ہو جائے گا
ہم حسینوں پر نہ ہونگے مر کے زاہد پارسا
اور تو حوروں پہ مر کے پارسا ہو جائے گا
مجھ سے سب ہو جائینگے راضی جو راضی ہوگا تو
مجھ سے سب ہونگے خفا جو تو خفا ہو جائے گا
کیا کہیں کیسے خدا والے پریشانی میں ہیں
جب سے یہ افواہ ہے وہ بُت خدا ہو جائے گا
دل گیا گر عشق میں جانے دے اسبق صبر کر
ورنہ اب نقصان تیری جان کا ہو جائے گا

غزل

جب ملے دونوں تو فرہاد سے مجنوں نے کہا
تو پہاڑوں کا ہے مالک میں بیابانوں کا

جب سے اے جان کیا وصل کا وعدہ تونے
ہاتھ بھر کا ہے کلیجہ مرے ارمانوں کا

داغِ اُلفت کے سوا دام و درم پاس نہیں
یہی سامان ہے ہم بے سروسامانوں کا

وقت ہے روشنیٔ طبع دکھا دو اسبق
آج اس رات میں مجمع ہے زباں دانوں کا



انجلو

اسم گرامی جان۔ تخلص انجلو۔ ساکن شاہجہانپور۔ ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے۔ بعد تعلیم انجینئر صاحب روہلکھنڈ کے دفتر میں کلرک ہوئے خداوند مسیح کی مدح سرائی بڑے جوش و خروش کے ساتھ کی ہے عین جوانی میں انتقال کیا۔

کلام سپاٹ ہے۔ محاسن شاعری سے زیادہ کام نہیں لیا گیا البتہ زبان صاف ہے۔ متروکات کا استعمال جا بجا نظر آتا ہے۔

نمونۂ کلام:۔

غزل

خدایا تیرا شہرہ تو کو بکو ہے
ہر اک سنگِ خارا میں تیری ہی بُو ہے

گناہوں سے مجھ کو بچا اے خدا تو
فقط تیرے ہاتھوں میری آبرو ہے

جدھر اٹھ گئی آنکھ پایا تجھی کو
ہر اک جا پہ حاضر فقط تو ہی تو ہے

بھلا کون آنکھوں سے تیری نہاں ہو
عیاں راز دل بھی ترے روبرو ہے

دل و جان سے جو کرے یاد تیری
تو روزِ قیامت وہی سرخرو ہے

ترا رحم کا شیوہ ہے میرے خالق
گناہوں کی افسوس ہے مجھ میں خو ہے

خطا انجلو کی تو کرنا عفو سب
نہ شرمندہ ہو جب تیرے روبرو ہے

غزل

عیسیٰ کا نام گر مرے وردِ زباں نہ ہو
وہ بے کلی ہو دل کو کہ جس کا بیاں نہ ہو
ممکن نہیں کہ نارِ جہنم سے بچ سکے
وہ شخص جس پہ جلوۂ عیسیٰ عیاں نہ ہو
کیا لطف زندگی کا جہاں میں اُسے ملے
عشقِ مسیح میں جو کوئی نیم جاں نہ ہو
مُردے جِلا دیئے لبِ جاں بخش سے تو پھر
مدحت طراز کیوں صفِ کرّ و بیاں نہ ہو
ممکن نہیں گنہ کے مرض سے کوئی بچے
دار الشفا مسیح کا گر آستاں نہ ہو
شیطاں کو نقدِ عشقِ مسیح لوٹنا ہو سہل
روح القدس کا دل پہ اگر پاسباں نہ ہو

اے انجلو تو ایک غزل اور لکھ شتاب
جس میں کہ اس ردیف کا نام و نشاں نہ ہو

غزل

بیاں ہو کس زباں سے شکرِ عیسیٰ ابنِ مریم کا
کہ جس نے رفع ہم پر سے کیا فتویٰ جہنم کا

زباں کو کب مری یارا ہے اتنا کر سکے جو اک
ذرا بھی ذکر مہر و الفتِ خلّاق عالم کا

اِدھر آیا اُدھر نکلا ازل سے ہوتا آیا ہے
بھروسہ کچھ نہیں اے دوستو انسان کے دم کا

گریزاں گر رہے شیطاں سے تو اے دل تو بہتر ہے
کیا خانہ خراب اوس نے ازل سے ابن آدم کا

گنہ گاروں کی خاطر جاں دریغ اپنی نہ کی جس نے
عمانوئیل[1] نام اس کا ہے وہی شافع ہے عالم کا

جو عاقل ہیں سمجھتے ہیں بخوبی اس سخن کو وہ
جسے کہتے ہیں دُنیا ہے مقام اندوہ و ماتم کا

نہیں اے انجلو خطرہ مجھے کچھ روزِ محشر کا
بھروسہ ہے مجھے پکا شفیعِ ہر دو عالم کا

[1] حضرت مسیح کا نام۔ متی ۱ : ۲۳

اشرف

نام اشرف علی تخلص اشرف مسیحی مذہب قبول کرنے کے بعد مبشر کلام یعنی پادری ہو گئے اور پنجاب میں تبلیغ کے کام میں مصروف رہے۔ زباں داں تھے۔ کلام تشبیہ و استعارات سے پُر ہے۔ خیالات پاک اور ارفع ہیں۔

حمد و ثنا و دعا

یارب مجھے طاقتِ بیاں دے
اور خامہ کو میرے وہ زباں دے

اسرارِ خفی جلی ہوں جس سے
انوارِ خفی جلی ہوں جس سے

آغاز کروں میں قصّہ نور
تو دل کو دکھائے جلوۂ طور

خامہ ہو مرا وہ تیز پرواز
عنقا کی نہ پہنچے جہاں یہ آواز

ہر رنگ میں جلوہ ہے سراسر
قدرت سے تیری ہے کون باہر

بلبل کو کیا ہے گل کا جویا
قمری کے گلے میں طوق ڈالا

نرگس ہے مثالِ دیدۂ وا
ظاہر ہے کسی کی ہے وہ جویا

جس پھول کو سونگھتا ہوں داور
بُو ہوتی ہے اوس سے تیری ظاہر

کلمہ ہے خدا کا کیا ہی یالا
جس نے ہے جہان کو بنایا

اوّل ہے وہی، وہی ہے آخر — کچھ اوس سے نہیں ہے اور باہر
اک نورِ ازل ہے وہ مقدم — اک نورِ بشر ہے یعنی آدم
جو شاہِ ازل تھا اُوس کو افسوس — رسّی سے تھا باندھا اُوس کو افسوس
جن لوگوں کو وہ بچانے آیا — اُن لوگوں نے تھا اُوسے ستایا
کانٹوں کا بھی تاج اُسے پہنایا — سرکنڈا بھی اُوس کے سر میں مارا
سرکے میں مِلا کے پت پلایا — ہر شخص نے اوس پہ ٹھٹھا مارا
دُنیا میں مصیبتیں اوٹھائیں — ہر طرح کی آفتیں اوٹھائیں
ہو منجّی حق پہ یہ مصیبت — صد حیف کہ وہ نہ پائے راحت
مصلوب ہوا ہماری خاطر — لکڑی پہ ٹنگا ہماری خاطر
یہ رنج سہے ہماری خاطر — مظلوم ہوئے ہماری خاطر
تکلیف اٹھا کے آخرِ کار — انسان کا ہوا ہے اب وہ مختار
اے منجّی حق مسیحِ دوراں — ہر وقت یہہ دل ہے تیرا جویاں
اے رُوحِ معلےٰ اور عالی — دل میرا نہ ہوئے تجھ سے خالی
عصیاں سے تو پاک کر دے مجھ کو — مقبولِ خدا بنا دے مجھ کو

اشرف پہ تو رحم کر سراسر
اس دِل کو تو گھر بنا لے آکر



غزل

میرے دل میں گذر گر ہو ترے روحِ درخشاں کا
تو یہ سینہ بھی بن جائے نمونہ باغِ رضواں کا
تو ہے خالق جز و کل کا تو ہے مالک دل و جاں کا
تری قدرت عیاں کرتا ہے ہر پتہ گلستاں کا
بیاں ہو کس طرح اس بارگاہِ نورِ یزداں کا
پتا بھی عقل کو ملتا نہیں ہے جس کے ایواں کا
مہ و خورشید و انجم سے نمایاں نور ہے تیرا
تو ہی ہر شے کا خالق ہے تو ہی مالک ہے انساں کا
مقدس ساتویں دن کو کیا اس واسطے تونے
کہ ہر انساں ہو مداح اس دن ترے احساں کا
بشر کی کیا لیاقت ہے جو تیری ذات کو جانے
ملک پر بھی نہیں ظاہر ہوا یہ راز یزداں کا
تو ہی حاضر ہے اور ناظر تو ہی عادل ہے اور صادق
تو ہی حافظ ہے اور حامی تو ہی رہبر ہے انساں کا



بیمآر

اسم گرامی مولوی امداد حسین عرف محمد مُراد۔ تخلص بیمآر۔ اجمیر میں اقامت پذیر رہے۔ مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا اور آخر میں حضرت مسیح کو تمام دُنیا کا نجات دہندہ قبول کر کے دینِ عیسوی میں شامل ہوئے۔ کلام متین اور سنجیدہ ہے۔

غزل

مسیحا فلک پر تیرا دبدبہ ہے — خدا کے برابر تیرا مرتبہ ہے
عجب دونوں جانب سے ہے رازِ الفت — تو پیارا خدا کا وہ عاشق ترا ہے
کہا تجھ کو خالق نے فرزندِ دلبند — یہ ارض و سما تیرے باعث ہوا ہے
کہیں اوج تیرا ہے موسیٰ سے بڑھ کر — کہ تو عرش پر حق سے گویا ہوا ہے
کسے رُتبہ تیرے برابر کہ تو تو — حبیبِ خدا سرورِ انبیا ہے
یہی اعتقاد اور مذہب ہے اپنا — کہ عیسیٰ خدا ہے مسیحا خدا ہے
تو روحِ مقدس کو کر ہم پہ نازل — گناہوں سے اب حال بدتر ہوا ہے
شفاعت کی ہے اِسلئے تجھ سے امید — گناہوں کے بدلے تو قرباں ہوا ہے
ترا نور وہ ہے کہ نورٌ علےٰ نور — نہ خورشید گردوں میں ایسی ضیا ہے

ہو بیماں کیسے وصف کیونکر کہ تیرا
ثنا خوانِ جلّ و علیٰ کبریا ہے

غزل

زباں سے وصف ہو کیونکر خدایا تیری صنعت کا
کہاں طاقت قلم کو لکھ سکے دیوان قدرت کا
اٹھے گر آنکھ سے اپنی کہیں پردہ یہ غفلت کا
تو کثرت میں نظر آئے تماشہ اس کی وحدت کا
اٹھا کر آنکھ بھی دیکھے نہ پھر وہ تختِ شاہی کو
ہوا جو دل سے طالب اوس مسیحا کی محبت کا
رہیں گریاں سدا آنکھیں ہماری یاد میں تیری
مسیحا درد دے دل میں تو ایسا اپنی الفت کا
خطا مجھ سے ہزاروں دیدہ و دانستہ ہوتی ہیں
پڑا ہے یا خدا پردہ میری آنکھوں پہ غفلت کا
نہیں امید بخشش اپنے اعمالوں سے کچھ ہم کو
ولیکن ہے وسیلہ حضرتِ عیسیٰ کی رحمت کا
مسیحا آبرو یاں ہم سیہ کاروں کی رکھ لینا
نہایت سخت تر ہے معرکہ روزِ قیامت کا
بشکلِ آدمی بن کر ہوا قربان وہ خالق
عجب ہی جوش تھا اللہ کے دریائے رحمت کا

تو ہی سمجھائے تو سمجھے نہیں انسان عاجز کو
بہت مشکل سمجھنا ہے تیری تثلیث و وحدت کا
جمال اپنا دکھا جلدی میں ہوں بیمار فرقت سے
کہ دل کو شوق ہے مدت سے تیری ہی زیارت کا

غزل

خواہش نہ سیر باغ نہ گلزار کی ہوس
ہم کو تو ہے مسیح کے دیدار کی ہوس
پابندِ خطا ہو کے جلے آگ میں آدم
ہردم یہہ ہے شیطانِ ستمگار کی ہوس
گذری گناہ کرتے ہی کرتے تمام عمر
پوری ہوئی نہ اب بھی گنہگار کی ہوس
بے فائدہ ہوس کے ہو پابند دوستو
دُنیا کی جو ہوس ہے وہ دن چار کی ہوس
رُوح القدس کے نور سے معمور جب ہوا
خواہش رہی نہ سبحہ و زنّار کی ہوس
ہو جس کے دل میں الفتِ عیسیٰ اسے بھلا
پھر کس طرح سے ہو کے اغیار کی ہوس
باغ و محل کو چھوڑ کے ویراں میں اُٹھ گئے
کرتے تھے جو یہاں در و دیوار کی ہوس

ہو زخم جس کے دل میں مسیحا کے عشق کا
اس کو بجز نمک نہ ہو نگار کی ہوس

کچھ سوچ دل میں اب بھی ذرا اے حریصِ نفس
آخر کو مار ڈالے گی ہر بار کی ہوس

لگتی نہیں پلک سے پلک اپنی ایک دم
کیا جانے کیا ہے دیدۂ بیدار کی ہوس

دل کے غریب ہوں گے مبارک بروزِ حشر
بر آئے گی یہاں کے نہ زردار کی ہوس

ہو وقت نزع لب پہ مرے نام یا مسیح
اب تو یہی ہے اس دلِ بیمار کی ہوس

غزل

عیسیٰ کی عنایت سے ہوا کام ہمارا
آخر کو ہوا خوب ہی انجام ہمارا

خالق کی حضوری میں بجز حضرتِ عیسیٰ
پہنچا نہیں سکتا کوئی پیغام ہمارا

عیسیٰ کی پرستش کے سوا کام نہیں اور
زاہد یہی ہے دین اور اسلام ہمارا

کس منہ سے کریں شکر عنایت کا خداوند
لبریز ہے بخشش سے تری جام ہمارا

بیمار کسی طور ہم اچھے نہیں ہوتے
پر خونِ مسیحا میں ہے آرام ہمارا

پطرس

نام بابو کیدار ناتھ دت۔ تخلص پطرس۔ بنگالی نژاد تھے۔ بھنڈارہ (ناگپور) میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ بچپن سے اصنام پرستی پسند نہیں تھی اس لئے ۱۸ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ لیکن وہاں بھی سکونِ قلب نصیب نہیں ہوا تب ۲۰ جون ۱۸۷۸ء کو بپتسمہ لیکر دین مسیحی میں شامل ہو گئے۔

بنگالی ہونے کی وجہ سے زبان گنجلک ہے۔ کلام میں گہرائی اور گیرائی نہیں۔ البتہ دل سے جو نکلا اسے شعر کا جامہ پہنا دیا ہے۔

غزل

بتاؤ حضرت عیسیٰ کو ہم سمجھیں تو کیا سمجھیں
اُسی کو ابنِ آدم بھی اُسی کو ہم خدا سمجھیں

حکیموں کو کیا دنگ اور بیماروں کو صحت دی
حکیموں کا حکیم اس کو مریضوں کی شفا سمجھیں

کیا مُردوں کو زندہ جس نے اپنے حکم سے فوراً
قیامت اس کو سمجھیں اور اسی کو ہم بقا سمجھیں

وہی نورِ قدم ہے اور وہی کلمہ خدا کا ہے
اُسی کو ابتدا سمجھیں اُسی کو انتہا سمجھیں

شفیع اپنا وہی ہے اور منجی بھی وہی پطرس
وہی تو راہ ہے حق کی اسی کو رہنما سمجھیں

غزل

کرو تم شکرِ حق یارو ہے عیسیٰ پاسباں اپنا
اُسی کے جان دینے سے بچا ہے جسم و جاں اپنا

دلا نازاں نہ ہو دُنیائے فانی پر تو غفلت سے
یہاں ہے چند روزہ اے محبّو آشیاں اپنا

کرو تم فکر اے لوگو کہ ہووے خاتمہ بالخیر
رکھو ایمان عیسیٰ پر کہ وہ ہے پاسباں اپنا

جو دیکھا معجزہ حضرت کا اس مجلسؑ کے مالک نے
کیا صدقہ مسیحا پر گھر اپنا خانداں اپنا

کرو توبہ گُناہوں سے عزیزو دوستو دل سے
مسیحا آج حاضر ہے بچانے کو تو جاں اپنا

یہ پطرس کی گذارش ہے مسیح ناصری تجھ سے
بنائے رکھ اسے تو کمترین بندگاں اپنا



ط ا عمال ۱۶ ۔ ۱۹ تا ۳۴

۵۹

خادمؔ

نام کشن سنگھ (پادری) موضع دلوکھرہ ضلع آگرہ میں ۱۵ دسمبر ۱۸۲۴ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد فوج میں صوبہ دار تھے۔ ابتدائی تعلیم ایک پنڈت سے حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد بڑے بھائی فوج میں لے گئے اور وہ اپنے بھائی کے ہمراہ لڑائی پر چلے گئے جہاں بھائی مارے گئے بعد میں ان کو فوج میں بھرتی کر لیا گیا اور آگرہ میں تبدیل ہو کر آ گئے۔ یہاں کچھ مسیحی واعظوں سے ملاقات ہو گئی جن میں پادری مانڈر صاحب سے انجیل شریف پڑھی اور کچھ کتابیں مطالعہ کی غرض سے حاصل کیں پھر فوج کے ساتھ پنجاب کی لڑائی پر گئے اور ہری پتن پر بندوق پھٹ جانے کی وجہ سے شدید زخمی ہو گئے اس وقت تمام رشتہ داروں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ ایمان کے ساتھ اپنی شفایابی کے لئے خدا سے دعا کرتے رہے چند دنوں بعد انھیں صحت کلی ہو گئی۔ آپ نے بڑی خوشی اور شکر گذاری کے ساتھ بپتسمہ لیکر دین عیسوی قبول کر لیا۔ مسیحی ہو جانے کے بعد آپ کو عزیز و اقربا کی جانب سے بہت ایذا رسانی کی گئی۔ بلکہ فوج کے کچھ سپاہی بھی آپ کے خلاف ہو کر جان کے درپے ہو گئے لیکن ایک مشنری اسٹیپرڈ نے اُن کی جان بچائی اور اپنے گھر لے گئے۔ پھر غدر کے ایام میں بھی ایک باغی آپ کو قتل کرنے ہی والا تھا کہ اس کو گرفتار کر لیا گیا لیکن آپ نے اُسے معاف کر دیا اور آزاد کرا دیا۔ اس بات سے لوگوں کے دلوں پر بڑا اثر ہوا۔

آپ کا کلام جوش سے پُر نہایت سادہ و عام فہم ہے۔

غزل

بندہ ہوں دل سے میں ترا ہر آن یا مسیح
دشمن ہے میری جان کا شیطان یا مسیح

کیونکر میں جنگ لشکرِ ابلیس سے کروں
یہ سخت کام تجھ کو ہے آسان یا مسیح

اُلفت میں تیرے مجھ کو مصیبت کا غم نہیں
ہے تجھ پہ میری جان بھی قربان یا مسیح

وہاں مجھ کو بخشیو تو ہمیشہ کی زندگی
میں یاں تو چند روز ہوں مہمان یا مسیح

خادم کو خوفِ غلبۂ شیطاں ہے رات دن
ہونے نہ دے تو اس کو ہراساں یا مسیح

غزل

محبت دل میں عیسیٰ کی کرو اے دوستو پیدا
کیا ہے حکم سے جس نے زمین و آسماں پیدا

کیے روشن فلک پر ہیں اُسی نے رات میں تارے
قمر کو رات پر اس نے کیا ہے حکمراں پیدا

میسر ہو ہمیں گلگشت یارب باغِ عیسیٰ کی
کہ ہے سرسبز وہ گلشن نہیں جس میں خزاں پیدا

مجھے اُس نے بچایا ہے کرم سے اپنے اے یارو
نہیں ثانی کوئی اس کا ہوا ہے مہرباں پیدا

نہیں چھوڑوں گا میں اسکو کرونگا جاں نثار آکے
مرے دشمن کریں گر لاکھ دورِ آسماں پیدا

کروں گا حمد اے خادم میں عیسیٰ کی دل و جاں سے
کیا جس نے جہاں میں مجھ کو اپنا مدح خواں پیدا

خاکؔ

نام پادری زبردست خاں. فرخ آباد کے رہنے والے تھے۔ مدتوں پولیس میں سب انسپکٹر رہے پھر صدر ضلع میں ہیڈ کلرک کا کام کیا۔ بعد میں پنشن لیکر کانپور میں بشارت کا کام کرتے رہے۔ دورانِ ملازمت بھی وعظ و نصیحت کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ پہلے آپ کے بڑے بھائی مسیحی ہوئے آپ اس کے بہت عرصہ بعد حلقۂ مسیحیت میں داخل ہوئے۔ ایام غدر میں مسیحی ہونے کے باعث بہت تکلیفیں برداشت کیں مال، اسباب، زیور، نقدی سب لُٹ گیا اپنے گھر والوں کے ہاتھوں بہت ایذائیں اُٹھائیں غریبوں کا مُفت علاج کیا کرتے تھے۔ دُوا کے پیسے بھی نہیں لیتے تھے نہایت سچے رحمدل اور شفیق انسان تھے۔ مسیحی ہونے سے قبل بھی طبع آزمائی کیا کرتے تھے مسیحی ہونے کے بعد توصیفِ مسیحا میں کلام کہنے لگے۔ ہر سال بڑے دن کے موقع پر ایک غزل سُرخ کاغذ پر چھپوا کر دوستوں اور عزیزوں کو بطور تحفہ اور نیک خواہشات بھیجا کرتے تھے۔

کلام سادہ عام فہم با محاورہ ہے جس میں آمد ہے آورد نہیں۔ اسلئے پُر تاثیر ہے۔

نمونۂ کلام :۔

غزل

پیدا ہوا جو آج مسیح اس جہان میں ۔ گانے لگے فرشتے ثنا آسمان میں
گھر گھر خوشی مناؤ عزیزو کہ آج دن ۔ منجی سے جان آگئی ہم سبکی جان میں
بربط و بین لیکے خوشی سے بجاؤ آج ۔ دلشاد ہو کے گاؤ مسیحا کی شان میں
تعریف و حمد حق کی کرو خوشدلی سے آج ۔ طاقت ہے جسقدر ملی تم کو زبان میں
چرچے کرو خوشی سے کرو ذکر آج دن ۔ منجی مسیح آگیا ہے اس جہان میں
بلبل چہک رہے ہیں خوشی سے سنو کہ آج ۔ بے مثل گل کھلا ہے اب اس بوستان میں
ہے بھاری عید ہم کو ملی آج مخلصی ۔ حمدِ خدا یہاں ہو ثنا آسمان میں

اس خاک کی دُعا ہے بدی سے مجھے بچا
یارب نہ پڑنے دے تو مجھے امتحان میں

غزل

ہے آج کا دِن نیا مبارک کہ سال پچھلا جُدا ہوا ہے
اُسی کی رحمت سے ہیں سلامت ہمارے کرنے سے کیا ہوا ہے
خوشی سے مِل کے شادیانے بجائیں گھر گھر کہیں مُبارک
خوشی سے گائیں مسیحی پیارے کہ سال اب سے نیا ہوا ہے

خدایا تیرا جلال ہوئے کہ سال اب پھر نیا دکھایا
ہمارے دل بھی نئے تو کر دے کہ تجھ پر اب دل فدا ہوا ہے
پھنسے تھے جب ہم گناہ میں سارے چلے نہ کوئی ہمارے چارے
خدا نے دیکھے یہ دُکھ ہمارے کرم سے مسیح عطا ہوا ہے
گناہ کی گٹھڑی تھی جو ہماری مسیح نے آکر اسے اتاری
لہو ہوا جبکہ اس کا جاری گناہ کا قرض ادا ہوا ہے
صلیب اوپر ہوا وہ قرباں ادا ہوئے حق کے سارے فرماں
مسیح نے توڑا ہے بندِ عصیاں یقیں کرو یہ لکھا ہوا ہے
ہزارہا شکر ہو عزیزو کہ ہر مصیبت سے بچ گئے ہو
اسی کی رحمت سے کارخانہ ہمارا سب کچھ بنا ہوا ہے
دُعا ہے اب سال بھر سلامت رہیں سبھی خوش دپُر محبت
بَری گناہوں سے تا قیامت یہ آسرا اب لگا ہوا ہے

جھکا کے سر اپنا خاک سایل دُعا کر اس سے ملے نیا دِل
رکھا کے اُمید رَب سے کامل اُسی کے در کا گدا ہوا ہے



سفیر

نام منشی حسین علی صاحب۔ تخلص سفیر۔ نصیر آباد ضلع اجمیر کے باشندے تھے۔ ۱۸۶۴ء میں نصیر آباد چھاؤنی میں بپتسمہ پاکر دین عیسوی میں داخل ہوئے۔ سات برس تک بے پور میں کلام خدا لوگوں کو سنایا اسکے بعد وطن نصیر آباد میں تبلیغ کا کام انجام دیتے رہے۔

کلام پُر مغز۔ فصاحت وبلاغت سے پُر ہے۔ لوگوں میں کلام بہت مقبول تھا۔

قطعہ۔ حمدِ مسیح

بشر کیا کر سکے تعریف اس کی ملائک ہیں ثنا خوانِ مسیحا
بچایا عاصیوں کو ہو کے مصلوب کہ رحم و عدل ہے شانِ مسیحا
بہایا خون اوس نے اس لئے ہے گنہ گاروں پہ احسانِ مسیحا
مقرر بخشا جائے گا دلا وہ جو پکڑے دل سے دامانِ مسیحا
گناہوں کے عوض میں ہاں ہمارے گئی دیکھو تو ہے جانِ مسیحا

سفیرِ پُر خطا مایوس مت ہو
بھلا مت دل سے فیضانِ مسیحا

غزل

کون ہے اس جناب کی مانند — شۂ گردوں رکاب کی مانند
چشمۂ زندگی مسیحا ہے — اور سب ہیں سراب کی مانند
مہرِ عیسیٰ سے ذرّہ بے قدر — ہو گیا آفتاب کی مانند
اپنے لوگوں کو اس نے بخشے ہیں — تیز باز و عقاب کی مانند
بحرِ دنیا میں ہم سمجھتے ہیں — اپنی ہستی حباب کی مانند

نظر آیا سفیر پیری میں
تھا شباب اپنا خواب کی مانند

غزل

دونوں جہاں کا مالک و مختار ہے مسیح — خلقت کی، کائنات کا سردار ہے مسیح
ابرِ کرم شفیعِ اُمم ماحیِ الم — ہم سے تھکے ہوؤں کا مددگار ہے مسیح
انسان بن کے بچوں پہ ظاہر کیا ہے بھید — ذاتِ خدا کا کاشفِ اسرار ہے مسیح
گنجِ حیات مول لیا دے کے نقدِ جاں — محتاج ساری خلق ہے زردار ہے مسیح
ہمدرد آزمائشوں میں رنج میں شریک — سردار کاہن اور وفادار ہے مسیح
تاریکیِ لحد میں نہیں کچھ مقامِ خوف — روشن ہمارا مطلعِ انوار ہے مسیح

بارِ گناہ سے گرچہ دبا ہے یہ کیا ہے غم
عاصی ہے گر سفیر تو غفّار ہے مسیح

غزل

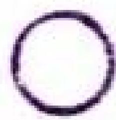
کیوں مشکلات وعقدۂ لاحل نہ ہوئیں حل
عیسیٰ کی مثل جب مجھے مشکل کشا ملے

دُنیا میں کون ایسا ہے عصیاں کا مریض
دستِ کرم سے اوس کے نہ جس کو شفا ملے

کردار کردگار ہے شانِ صلیب رہ
انصاف و رحم دونوں بہم ایک جا ملے

مانگیں تو پائیں ڈھونڈیں تو بیشک ملے گا وہ
پرسُست واہلِ شک کو بجز یاس کیا ملے

یہ ہے دُعا سفیر کی اب تجھ سے اے مسیح
توصیف تیری لکھنے کی طبع رسا ملے



سالکؔ

نام پادری حمید الدین صاحب۔ چرچ مشن اسکول ناروال میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۶ برس کی عمر میں دینِ عیسوی قبول کیا۔ اسکے بعد تین سال مشن نارمل اسکول۔ امرتسر میں تعلیم پائی اور ناروال میں ریاضی کے استاد ہو گئے۔ بعد میں چار سال مدرسہ علم الٰہی میں تعلیم پائی اور اکتوبر ۱۸۸۶ء میں پادری ہو گئے۔ دینداری کا شوق اور دینی تعلیم اور تلقین کا شیوہ طالب علمی سے تھا۔

زبان پر قدرت رکھتے ہیں اور بہت سلیقہ سے دلکش انداز میں شعر کہتے ہیں۔

غزل

مہرباں ہم پر ہوا ہے آپ رحماں اِن دِنوں
رحمتِ اللہ کا ہے جوشِ باراں اِن دنوں

ہو مُبارکباد تم کو اے گنہگارو سنو
ہو مجسّم آ گئے ہیں آپ یزداں اِن دنوں

شہر میں داؤد کے پیدا ہوا ابنِ خدا
یہ خبر ہم کو سناتے ہیں وہ چوپاں اِن دنوں

وادیٔ تاریک میں بیٹھے تھے جو ہم لوگ سب
نورِ حق سے ہو گئے ہم خود درخشاں اِن دنوں

غفلتِ عصیاں میں سوتے تھے اندھیرے غار میں
ہم پہ روشن ہو گیا ہے مہرِ تاباں اِن دنوں

شکر کرتے ہیں خدا کا ہے زباں پر یہہ کلام
کہ خدا نے کر دیا ہے ہم پہ احساں اِن دنوں

اے مسیحا تو نے بخشے ہیں میرے سارے گناہ
میرے دل سے مدتوں کے نکلے ارماں اِن دنوں

تجھ کو پا کے اے مسیح مشکل کشا مولا میرے
ہو گئی ہیں مشکلیں سب میری آساں ان دنوں

غزل

محامد میں مسیحا کی بھلا تحریر کیا کیجے۔ گماں سے وہم سے برتر ہے پھر تسطیر کیا کیجے
قلم طاقت نہیں رکھتا مسیح کی حمد لکھنے کا زباں یاری نہیں دیتی تو پھر تقریر کیا کیجے
مسیحی اپنے کاموں سے زمانہ میں ہوا روشن وہ خود روشن منور ہے اسے تنویر کیا کیجے
کلامِ حق میں آیا ہے مسیحا اس کا بیٹا ہے خدا کا وہ پیارا ہے تو پھر تعبیر کیا کیجے
خداوند[1] اور پڑوسی سے دل و جاں سے محبت کر شریعت کا خلاصہ ہے یہی تفسیر کیا کیجے

مسیحا مہربانی سے کہیں گے روزِ محشر میں
ہماری بھیڑ ہے سالک اسے تعزیر کیا کیجے۔

۱؎ لوقا ۱۰/۲۷

شاد

نام جیمس جیکب۔ فرزندِ ارجمند پادری یعقوب کشن سنگھ ۲۶ دسمبر ۱۸۶۳ء بمقام روڑکی پیدا ہوئے اور وہیں اسکول میں چھ سات سال تعلیم حاصل کی۔ فارسی اور انگریزی کے ساتھ انٹرنس پاس کیا اور سرکاری ملازمت قبول کرلی۔ شاعری کے ذریعے سے خداوند کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ اسلئے کلام حمدِ مسیح سے پُر ہے۔ نہایت سلیس اور موزوں ہے۔

غزل

جہاں میں شور ہے یعنی تیری شیریں کلامی کا
تیری مہر اور محبت کا تیری معجز بیانی کا

ملائک آسماں پر ہیں ثنا خواں تیری عظمت کے
عبث ہے جو کرے کوئی تجسس تیرے ثانی کا

ملایا خاک میں اپنے تئیں تو نے یہاں لیکن
کیا وعدہ خدا نے تجھ سے تاجِ آسمانی کا

ندا غیب سے آئی کہ یہ فرزند ہے میرا
دیا یوحنا نے بپتسمہ تھا تجھ کو جبکہ پانی کا

خبر اب جلد لے ربی کہ میں لاچار و حیراں ہوں
نہیں پوشیدہ تجھ سے حال میری ناتوانی کا

یقیں ہے یہ میں پاؤنگا حیاتِ دائمی تجھ میں
بھروسہ ایک دم کا بھی نہیں اس زندگانی کا

ہوس ہو دل میں کیوں سیم و زر و لعل و جواہر کی
یقیں پورا ہو جسکے دل میں گنجِ آسمانی کا

متی ۶: ۱۹، ۲۰

ہے

خدایا شاد دل کو شاد رکھ فضل سے اپنے
نہ ہو ہرگز نشانہ یہہ بلائے ناگہانی کا

غزل

کعبہ کا زنار یارو دل سے توڑا چاہیئے
راہِ بد سے توسنِ خواہش کو موڑا چاہیئے

ظلم شیطاں سے بچانے کو ہمیں آیا مسیح
زندگی بھر ایسے حامی کو نہ چھوڑا چاہیئے

بخشنا عصیاں کا اس کو کچھ بھی مشکل ہے نہیں
اسکے آگے عجز سے ہاتھوں کو جوڑا چاہیئے

ہر بدی کے جال سے دُنیا میں لازم ہے گریز
نفسِ امّارہ کی گردن کو مروڑا چاہیئے

وصل کی امید میں اے شاؔد کیوں ہے بیقرار
عاشقِ صادق کو اوّل صبر تھوڑا چاہیئے



شرف

اسم گرامی شرف الدین۔ شرف تخلص نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ایک مثنوی قصّہ لیسوعی مسافر اپنے دوست منشی جمیل الدین نیئر کی مدد سے تحریر فرمائی جو نایاب ہے۔ عمر کے آخری حصّے میں وہ اسلام میں واپس چلے گئے

زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ صنائع بدائع سے کام لیا ہے۔

رموزِ شاعری سے آگاہ ہیں۔

مثنوی حمد اور دُعا

لکھوں پہلے حمدِ خدائے قدیر
نہیں جس کا کوئی عدیل و نظیر

کیئے خلق خورشید و چرخ و زمیں
پر انسان کو سب سے افضل تریں

بشر کو عطا کر کے عقل و شعور
بھرا گوہرِ دل میں ایماں کا نور

بتاؤں اُسے راستبازی کی راہ
دکھایا اوسے اپنا تمکین وجاہ

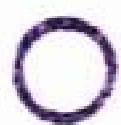
مقابل میں اوس کے نہیں دوسرا
نہیں کوئی معبود اوسکے سوا

زباں میں مری ایسی طاقت کہاں
کہ کچھ حمد اوسکی کروں میں بیاں

کیا پیدا تو نے مجھے اے کریم
میں عاصی ہوں تو ہے غفور الرحیم

کہاں تک کروں شکر اے رب میرے — تیری نعمتوں کا جو دی ہیں مجھے
خدایا تو ستّار و غفّار ہے — ستائش کا تو ہی سزاوار ہے
ترے دستِ قدرت کے ہیں سب کمال — نہیں ذات والا کو تیرے زوال
تو ہے نورِ قدرت سے بالکل بھرا — نہیں ہے کوئی روشنی تجھ سوا
خدایا ہے درکار رحمت تیری — ملے نطق کامل زباں کو مری
کرا فزوں میری جودت طبع کو — کہ تا گفتگو میں تکلّف نہ ہو
نہ برباد یارب ہو یہ مشت خاک — الٰہی عطا کر مجھے رُوحِ پاک

کفیل اپنے فرزند کو کر مرا
بر آئے مرا تا دلی مُدّعا



شہباز

نام منشی امام الدین شہباز تخلص. فوجی چھاؤنی انبالہ کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے. آپ کی پیدائش ظفروال ضلع سیالکوٹ میں ہوئی. دس برس کی عمر سے انھیں پادریوں کی منادی سننے سے اور ان کی صحبت میں بیٹھنے کا شوق تھا. جب عزیزوں نے مخالفت کی تو چھپ چھپ کر ان کے پاس جانے لگے ساتھ ہی مولویوں کے پاس جاکر ان کی باتیں بھی سنتے اور دونوں کا دل میں مقابلہ کرتے تھے وہ مسیحیوں کی سادگی، صبر و برداشت، حلیمی و انکساری سے بہت متاثر ہوتے تھے ۱۸۶۰ء کے آخر میں آپ کو گورنمنٹ نارمل اسکول لاہور جانے کا اتفاق ہوا. وہاں کے مدرس مشہور پادری و مصنف مولوی ڈاکٹر عماد الدین لاہز کو تحقیق مذہب میں مشغول پایا. ایک سال بعد آپ امرتسر مشن اسکول میں ریاضی کے استاد ہو گئے. وہاں ۲ ستمبر ۱۸۶۶ء کو پادری کلارک صاحب کے ہاتھ سے بپتسمہ لیا. ۱۸۷۴ء تک محکمہ تعلیم میں ملازمت کی. پھر ۱۸۷۵ء کے آغاز میں مقدس انجیل کی بشارت کا کام شروع کر دیا اور ۱۸۸۶ء میں پادری ہو گئے آپ نے زبور کی کتاب منظوم کرنا شروع کیا تھا.

مسیحی شاعری میں مغربی شاعری کا طرز پیدا کرنے کے شائق تھے کلام میں نئی نئی ایجاد کرنے کے قائل تھے.

زبور ۹۸

گیت گاؤ نیا خدا کے لیئے — کہ عجوبہ ہیں کام سب اس کے
اپنے ہی دستِ راست سے وہ غیور — بازوئے پاک سے ہوا منصور
اس نے اپنی نجات ظاہر کی — راستی اُمتوں کو دکھلادی
فرقۂ اسرائیل کی نسبت — یاد لایا صداقت و اُلفت
سب حدودِ زمین نے دیکھی — ہاں نجات اس خدائے اقدس کی
اے زمینو تمام اسکے لیئے — نعرہ زن ہوکے گاؤ فرحت سے
تم خوشی کی کرو بُلند آواز — حمد گاؤ بجاؤ حمد کا ساز
بربطیں تم بجاؤ اس کے لیئے — اور سُریں باندھ گاؤ بربط سے
خوب نرسنگے اور تُرہی بجا — اسکے آگے کرو خوشی کی صدا
سب سمندر اور اس کی معموری — ساری دُنیا اور اس کی بھرپوری
غل مچادیں لگائیں نہریں تال — گادیں مل کر پہاڑ ہوں خوشحال
کیونکہ آتا ہے وہ بشوکت وشاں — کرنے کو راستی سے عدلِ جہاں

صدق اور راستی سے پاک خدا
ساری قوموں کی داد دیوے گا

غزل

کیونکر رقم ہو وصف مسیحِ امیر کا — در جس کا سجدہ گاہ ہے برنا و پیر کا
جو شخص کہ مسیح مُنجی کا ہے مُقر — ڈر اس کو پھر کہاں رہا منکر نکیر کا

نہ قبر کی نہ موت کی پرواہ ہے اسے — دامن ہے پکڑا جس نے مرے دستگیر کا
ایسی مسیح ہو میری پیدائشِ جدید — ذرّہ بھی رہ نہ جائے پُرانے ضمیر کا
شہباز مت ہو بے پروبالی سے مضطرب
ہے تیرے سر پہ ہاتھ تیرے دستگیر کا

غزل

مری خطائیں تھیں حد سے باہر، تھا بوجھ سر پر ہزار من کا
مَیں میر مجلس تھا عاصیوں میں گناہ گاروں کی انجمن کا
ہوا تھا زخمی یہاں تلک میں بچا نہ تھا کوئی عضو خالی
عجب ہی تھا حال میرے دل کا مری زباں کا مرے دہن کا
خراب ایسا تھا دوستو میں۔ تھی اپنے سے آپ مجھ کو نفرت
زمانہ بھر میں کوئی نہ ہوگا مرے موافق بُرے چلن کا
غرور تھا مجھ کو زندگی پر۔ سمجھتا تھا دُنیا اپنا ہے گھر
خموش رہتا تھا مسکرا کر جو ذکر سُنتا تھا اُس وطن کا
نہ موت کا مجھ کو کچھ تھا خطرہ۔ نہ خوفِ محشر مجھے تھا بالکل
خلاف مرضیِ حق تعالےٰ مآل تھا میرے ہر سُخن کا
اگر اسی حال میں میں مرتا۔ تو دوستوں سے یہ عرض کرتا
سیاہ کاروں میں میں ہوں یکتا، ہو کالا کپڑا مرے کفن کا
ہزار شکر اے مسیح پیارے! عجیب ہے رحم تیرا مجھ پر
کہ مجھ پہ ایمان لائے عاصی ہوا ہے پودا ترے چمن کا

جو بارِ عصیاں تھا میرے سر پہ اُتر گیا تجھ کو دیکھتے ہی
سرائے فانی ہے دارِ دُنیا۔ رہے شوق دل میں اب اس وطن کا
تیری محبت ہے میرے دل میں۔ فقط تجھی کو میں چاہتا ہوں
ہوں پیار کرتا ترے سخن کو۔ ہوں دل سے عاشق ترے چلن کا
فلک پہ شہباز! اپنا گھر ہے۔ مسیح اپنا ہے شاہزادہ
بفضلِ ایزد ہوں ایک ممبر مسیحیوں کی میں انجمن کا

غزل

محبت کا تری عالم میں اے پیارے فسانہ ہے
تو دلداری میں یکتا ہے وفا میں تو یگانہ ہے
عجب آزادگی ہے بندگی میں تیری اے مولا
ترے عشاق کا خلدِ بریں میں آشیانہ ہے
بہت افلاک سے اونچا ترا عرشِ معلّٰی ہے
تصور سے بھی باہر ترا عالی آشیانہ ہے
ستائش تیری گاتے ہیں فلک پر لاکھوں ملکوت
یہاں مداح اے بڑے ترا سارا زمانہ ہے
گذرنا ایکدن سبکو ہے اس دُنیائے فانی سے
کوئی آگے روانہ ہے کوئی پیچھے روانہ ہے
خدا کے سامنے جب حالِ دل تم سب کا روشن ہے
بتاؤ کیا تمہارے پاس غفلت کا بہانہ ہے
گنہ سے اے تھکے ماندو مسیحا پاس آجاؤ
سوا اسکے تمہارا اور نہیں کوئی ٹھکانہ ہے

نہ دیکھا تجھ کو پیارے تو بھی مَیں ایمان لایا ہوں
دلِ شہباز کو تجھ سے محبت غائبانہ ہے

۱؎ حضرت عیسیٰ کا لقب۔ یوحنا ۱/۲۹

صَابر

نام منشی چمن لال. مقیم لکھنؤ محلہ گنیش گنج. متصل امریکن اسکول۔ کم سخن اور سنجیدہ مزاج انسان تھے۔ عنفوانِ شباب سے دُنیا کے فانی ہونے کا خیال دل پر منقش ہو گیا تھا جو جا بجا آپ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ کلام نہایت سادہ و سلیس ہے۔

غزل

خوشی اور زندگی کا ہم نے یہ پیغام پایا ہے
بشر کے قالبِ خاکی میں عیسیٰ آج آیا ہے

بشارت دی فرشتوں نے گڈریوں کو بیاباں میں
کرو سجدہ مسیحا کو عجب یہ وقت آیا ہے

مجوسی چل دیئے اُس دم ستارہ ہو گیا رہبر
انھیں تھی جستجو جس کی پتا اس کا لگایا ہے

چلے وے رات دن خوشدل نہ ٹھہرے پھر کسی جا پر
ہوا پیدا جہاں عیسیٰ ستارہ ان کو لایا ہے

پرستاروں نے فوراً مُرّ نکالا کھول کر جھولی
یہ خوشبو ہاتھ میں لیکر مسیح کو سر جھکایا ہے

مجوسی اسقدر خوش تھے کروں میں کیا بیاں اُنکا
فرشتوں نے خوشی کا آسماں پر گیت گایا ہے
کوئی مُرادر کوئی لوبان لایا ہے چڑھانے کو
نہیں کچھ پاس صابر کے فقط دِل اپنا لایا ہے

غزل

گناہوں سے دل میں بڑی بیکلی ہے
مسیحا سے لیکن تسلی ملی ہے
اُٹھائے نہیں بوجھا اُٹھتا گناہ کا
نہ بنیاد اس کی ہلائے ہلی ہے
ہزاروں علاج اسکے لائے عمل میں
نہ تدبیر کوئی ہماری چلی ہے
اُگا ہے وہی جو کہ بویا تھا دل میں
اُسی نخل کی شاخ پھولی پھلی ہے
جو آیا ترے در پہ اے پاک عیسیٰ
پناہ اس کو بے شک تجھی سے ملی ہے
نہیں کوئی کوچہ جہاں میں عاصی
مگر خاص عیسیٰ تمہاری گلی ہے

غزل

مَیں چونکا جو اک رات کو سوتے سوتے
نہ آنسو تھمے تا سحر روتے روتے
حقیقت میں ہے خواب دُنیائے فانی
سمجھ اب بھی تو زندگی کھوتے کھوتے
تو مہمان ہے شمع ساں ایک شب کا
یہ جلسہ کہاں پھر سحر ہوتے ہوتے
ہمارے گناہوں کا ایسا ہے دفتر
فرشتے بھی عاجز ہوئے دھوتے دھوتے

ندامت گناہوں کی ایسی بڑی ہے　　　کہ دریا بہیں سینکڑوں روتے روتے

گئی عمر غفلت میں صابر تو اب بھی

غضب ہے نہ چونکے مگر سوتے سوتے

غزل

ہوئے خاک سروِ رواں کیسے کیسے　　　مٹے باغ اور باغباں کیسے کیسے

نہ غنچہ نہ قمری نہ بلبل نہ گل ہے　　　چمن ہو گئے ہیں خزاں کیسے کیسے

اجل کے ہوئے لقمہ دارِ فنا میں　　　زباں آور اور بے زباں کیسے کیسے

عجائب ہے رنگ اس ریاضِ جہاں کا　　　خوشی میں ہیں غم کے بیاں کیسے کیسے

جو اسلوبِ خوبی سے آراستہ تھے　　　وہ خالی پڑے ہیں مکاں کیسے کیسے

وہاں منعقد محفلِ خرمّی تھی　　　بیاباں ہوئے ہیں وہاں کیسے کیسے

اجل سے ہر اک شخص کُشتی میں ہارا　　　ہوئے زیر ہیں پہلواں کیسے کیسے

قدم چُومے عیسیٰ کے صابرؔ نے کیونکر

جھکائے ہیں سر کو وہاں کیسے کیسے

○

صفدر

نام صفدر علی۔ مولف "غذائے رُوح" مطبوعہ ۱۸۸۹ء سنہ ۶ وطن جبلپور خاندان میں والدہ ماجدہ اور یکے بعد دیگرے کئی عزیزوں کی موت دیکھ کر اور خود والد صاحب اور چند دیگر دیندار لوگوں کی تعلیم و تلقین سے دل دُنیا سے اُکتا گیا۔ اور فکرِ عاقبت طاری رہنے لگی۔

پڑھنے کا شوق بے انتہا تھا۔ رات کو دیر تک پڑھتے رہتے اور گھر والے ہاتھ سے کتاب چھین لیتے اور چراغ گل کر دیتے تھے۔ چودھا برس آگرہ میں تعلیم حاصل کی وہاں سرکاری کالج میں داخل ہو کر فارسی عربی، ہندی اور سنسکرت کی تکمیل کی۔ انگریزی میں اتنی ترقی کی کہ شہر میں شہرت ہوگئی۔ اور مفتی صاحب نے حُرمت کا فتویٰ دے دیا۔ چنانچہ انگریزی تعلیم کو ترک کرنا پڑا۔ فلسفہ۔ سائینس اور دینیات کی کتابیں اپنے ذوق سے گھر پر پڑھتے تھے۔ دورانِ تعلیم متعدد انعامات وظیفے، میڈل وغیرہ حاصل کئے۔ کالج میں فارسی کے پروفیسر کے لئے سینکڑوں اُمیدواروں کے مقابلے میں اوّل آکر ملازمت حاصل کی۔ ساتھ ہی ایک مطبع میں ترجمہ اخبار اور دیگر کام کرتے رہے اور دینیات کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ سکونِ دل کی جستجو کرتے رہے۔ آپ پادری عماد الدین کے ہمراہ اُس مناظرہ میں موجود تھے جو آگرہ میں پادری فانڈر اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی کے درمیان ہوا تھا۔

۱۸۵۶ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوکر راولپنڈی گئے وہاں سے جہلم اور پشاور بھی تعینات رہے۔ یہاں بہت سے صوفی اور درویشوں سے ملاقات کی۔ اور مرشد کی تلاش میں نکلے۔ جب ملتان تبدیلی ہوئی تو مظفر گڑھ کی آبادی اور جنگلوں اور خانقاہوں میں دل کا مقصد تلاش کرتے رہے مگر کہیں اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔

۱۸۶۰ء میں وطن ضلع جبلپور کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوکر گئے حرمین شریف جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ آپ کی ملاقات پادری فادر کمیاہ گورے صاحب سے جو نیل کنٹھ شاستری کے نام سے مشہور تھے، ہو گئی۔ اُن سے گفتگو کے بعد قریب تین سال تک مذہبی تعلیم۔ بحث و مباحثے اور تحقیق و جستجو کرتے رہے۔ کئی مسئلوں کے متعلق مشہور دینی عالموں کو لکھ لکھ کر بھیجا۔ کہیں سے تشفی بخش جواب نہ ملا۔ لیکن شاستری صاحب کی ہمدردی۔ تعلیم اور دُعاؤں نے دل پر بہت اثر کیا۔ آخر کار بپتسمہ لیکر مسیحی ہو گئے۔ ان کے عزیز و اقربا اور ہم مذہب لوگوں نے طرح طرح سے ایذا پہنچائی۔ لیکن آپ پیچھے نہ ہٹے۔

شاعری کا شوق زمانۂ طالب علمی سے تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے جو خود ایک شاعر تھے حاصل کی۔ اُس وقت ان کے مکان پر مشاعرہ بھی ہوا کرتا تھا مسیحی ہونے کے بعد تمام تر توجہ دینی موضوعات اور محامد مسیح کی طرف لگا دی۔ بہت کچھ لکھا۔ قادر الکلام شاعر تھے۔ صنائع بدائع اور محاسنِ شعری سے کلام مزین ہے۔ زبان شیریں اور سلیس ہے۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ مسدس۔ مخمس وغیرہ ہندی گیت اور بھجن نیز

فارسی میں بھی کہا ہے۔ کلام کا کافی ذخیرہ تھا جس میں بہت کچھ نایاب۔ کتاب "غذائے روح" میں شامل ہے۔

فارسی کلام

اے یسوع ناصری شتاقِ دیدارِ توام — عاشق زارِ توام وزجاں خریدارِ توام
جانِ من جانانِ من بادا فدایت جانِ من — باجملہ خالو مانِ من من عاشقِ زارِ توام
نسبتے دیگر ندارم باجناب پاکِ تو — غیرازینکہ تو عفو ہی من گنہ گارِ توام
گر بہ تلخیہائے دوراں بجان لاہم من ہاکِ نیست — زندگی بخشد لب لعل شکر بارِ توام
عالمے را از مریضاں صاف بخشیدی شفا — اے طبیبِ مہرباں من نیز بیمارِ توام
نیست مسلم جنس ناکارہ بہ بازارِ جہاں — گفت عیسیٰ من بجاں دل خریدارِ توام

مُبارکبادیاں یعنی خداوند یسوع مسیح کا پہاڑی وعظ

متی ۵: ۳ تا ۱۲

مُبارک وہ ہیں جو ہیں دِل کے غریب — کہ شاہی عرش ہے اُنہیں کو نصیب
مبارک وہ ہیں جو ہیں غمگیں و زار — کہ پائیں گے تسکین و صبر و قرار
مبارک وہ ہیں جو ہیں مردِ حلیم — کہ وارث زمیں کے وہ ہوں گے فہیم
مبارک ہیں پابندِ طرزِ نکو — سچائی کے بھوکے پیاسے ہیں جو
کہ آسودہ بے شک کئے جائیں گے — حروفِ الم حک کئے جائیں گے
مُبارک جو ہیں رحم دل نیک خواہ — کہ رحم ان پہ ہوگا بلا اشتباہ

مبارک وہ ہیں جو کہ ہیں دل کے پاک ۔ کہ دیکھیں گے خالق کو بے خوف و باک
مبارک جو ہیں صُلح جو صُلح کار ۔ کہ کہلائیں گے ابنِ پروردگار
مبارک ہیں جو راستی کے سبب ۔ ستائے ہیں جاتے بجوشِ غضب
کہ افلاک کی بادشاہت تمام ۔ انہیں کی ہے میراث اے نیک نام
مبارک ہو تم اور فرخندہ فال ۔ کہ میرے سبب جب بصد قیل و قال
کریں لعن طعن اور ستائیں تمہیں ۔ بُری باتیں حق میں تمہارے کہیں
ہو تم شادماں اور خوش بیکراں ۔ تمہارا بڑا اجر گردوں پہ ہے
کہ نبیوں کو جو تم سے تھے بیشتر ۔ ستایا یونہی سب کو ہے سر بسر

غزل ۔ بڑا دن

بلبلا مژدہ کہ سرسبز گلستاں ہوگا
رونق افزائے چمن وہ گُلِ خنداں ہوگا
نخلِ اُمّید ہرا ہوگا ترا اے مریم
رشکِ گلزار ترا کلبۂ احزاں ہوگا
عندلیبانِ نواسنج چمن ہوں گے مست
اور ہر اک مرغ خوش الحان غزل خواں ہوگا
جمع ہر طرف سے ہو دینگے یہاں مرغ چمن
گُلِ رعنا کو ہر اک دیکھ کے حیراں ہوگا

باغِ عالم میں خزاں آئی گناہوں کے سبب
فیض اوس کے سے یہہ پھر روضۂ رضواں ہوگا
کفر اور کذب کی شب کا نہ رہے نام و نشاں
ایسا خورشید صداقت کا درخشاں ہوگا
جس کے دیدار کے مشتاق تھے آدم حوّا
بطن اطہر سے ترے پیدا وہ جاناں ہوگا
حق نے داؤد سے جس کا کہ کیا تھا وعدہ
تخت اور تاج کا وارث وہ سلیماں ہوگا
نام رکھے گی یسوعؔ اوس کا ضرور اے خاتون
کہ بچائے گا جہاں آپ وہ قرباں ہوگا
کہ صلیب اوپر اُسے قتل کریں گے ظالم
فدیۂ اہل جہاں شاہِ شہیداں ہوگا
اُترے گی رُوحِ خدا تجھ پہ کرے گی سایہ
تجھ سے پیدا پسر ایزد سبحاں ہوگا

مومن اوس شیر کے ہو ئیں گے بہادر صفدر
کوئی شیطان سے ترساں نہ ہراساں ہوگا

۱۰ مئی ۱۹۱۲

صدا لکھنوی

اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کرنے والوں میں حضرت صدا لکھنوی کا نام پیش پیش ہے آپ کی شہرۂ آفاق تصنیف انگلستان کے شاعرِ اعظم ملٹن کی مشہور کتاب فردوس گمشدہ و فردوس بازیافتہ PARADISE LOST & PARADISE REGAINED کے منظوم ترجمے ہیں جناب مولوی محمد عبدالحلیم شرر لکھنوی نے صدا صاحب کی سوانح حیات سے اس طرح روشناس کرایا ہے :-

آپ آگرہ کے ایک معزز خاندانی کائستھ تھے یکم اپریل ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے اور دیبی پرشاد نام رکھا گیا۔ آپ کے والد منشی اجودھیا پرشاد ایک معزز وکیل تھے اور پرانے مشرقی لٹریچر کے قدر دان تھے اسی وجہ سے صدا صاحب نے بچپن میں ایک مکتب میں فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۱ء میں والد صاحب نے انتقال کیا۔ اسکے بعد آپ انگریزی تعلیم کی تکمیل کے لئے سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخل ہوئے یہیں پر آپ کو مسیحی تعلیم سے واقفیت حاصل ہوئی۔ وہ اس تعلیم سے اسقدر متاثر ہوئے کہ کالج کے پرنسپل کے ہاتھ سے بپتسمہ لیکر مسیحی ہو گئے اور عیسیٰ چرن نام تبدیل کر لیا۔ اسکے بعد آپنے بیرنگ مشن اسکول بٹالہ ضلع امرتسر سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اسی مقام پر آپ کو اردو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ وہ اس طرح کہ

۱۸۸۹ء میں آپ کی امریکی اُستانی نے طلبہ سے ایک انگریزی نظم کا اردو میں منظوم ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ تمام ترجموں میں آپ کا ترجمہ سب سے عمدہ تھا۔ آپنے انعام حاصل کیا اب آپ کو شعر کہنے کا ذوق پیدا ہو گیا۔ کتب خانے سے شعر و سخن کی کتابیں لیکر مطالعہ کیا اور صفدرؔ تخلص رکھا۔

۱۸۹۶ء میں لکھنؤ تشریف لائے اور وہاں تعلیمی خدمت انجام دینے لگے۔ اسی دوران آپ کی شادی ہو گئی۔ لکھنؤ کے قیام نے آپ کے ذوقِ سخن پر تازیانے کا کام کیا اور آپ کو اُستادِ کامل کی تلاش ہوئی۔ جستجوئے کثیر کے بعد سیّد آغا حسن صاحب امانتؔ کے دوسرے فرزند سیّد عباس حسن صاحب فصاحتؔ کی خدمت میں باریابی ہوئی۔ اور فصاحت صاحب کے دامن میں شعر و سخن کے گل بوٹے کھلانے لگے۔

لیکن آپ کی شاعری مذہبی جوش کے اثر سے پیدا ہوئی تھی اسلئے عمر بھر مذہبی حدود سے باہر نہیں نکلے۔ آپنے بائیبل مقدس کے پُرانے عہدنامے کو منظوم فرمانے کا ارادہ کیا، پہلی کتاب پیدائش کا ترجمہ کر رہے تھے کہ آپ کا خیال ملٹن کی مشہور کتاب پیراڈائس لوسٹ (فردوسِ گمشدہ) کی جانب گیا اور آپ اُس ترجمے میں مشغول ہو گئے۔ ۱۹۱۴ء میں مکمل کر کے مطبع دلگداز لکھنؤ سے شائع کرایا۔ یو۔ پی ٹیکسٹ بک کمیٹی نے اس کو کتب خانوں کیلئے منظور فرمایا۔ ۱۹۲۴ء میں آپ نے اسے دوبارہ شائع کرایا۔ ۱۹۰۲ء میں مشن کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اُناؤ گورنمنٹ ہائی اسکول میں ٹیچر مقرر ہوئے۔ اسکے بعد ۱۹۰۴ء میں ضلع لکھنؤ میں سب ڈپٹی انسپکٹر ہو گئے۔ اسکے بعد فتحپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر تقرر ہوا۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۲۵ء کو اس عہدے سے سبکدوش ہوتے اس وقت شعر کہا۔

خیر و خوبی سے ہوا ختم میرا کام خدا	مجھ سے محمود ہمیشہ ہو تیرا نام خدا

اُسی سال لکھنؤ میں سوہن لال مرائی پاٹھ شالہ میں ہیڈ ماسٹر ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ کنٹونمنٹ بورڈ میں سپرنٹنڈنٹ تعلیم مقرر ہوئے۔

۱۹۲۶ء میں اپنے مکان کے ایک کمرے میں دارالمطالعہ "فری ریڈنگ روم" قائم کیا جس میں اردو، فارسی اور انگریزی کے مختلف موضوع کی کتابیں اور رسالے و اخبارات رکھے گئے تھے۔

۱۹۲۶ء میں ملٹن کی دوسری کتاب سمسن اگونسٹس کا منظوم ترجمہ سمسون مجزوں کے نام سے شائع کیا۔ ۱۹۲۸ء میں "نغمہائے صدا" شائع ہوا۔

بقول سید فخر موہانی وارثی مالک و مُدیر رسالہ "جام جہاں نما لکھنؤ"

آپ نے نغمہائے صدا شائع فرماکر ملک و قوم انسانی کی اخلاقی، معاشرتی اور تمدنی اصلاحات کے لئے ایسا دستور العمل مرتب کیا جس پر عمل پیرا ہونے سے انسان صحیح معنوں میں انسان کہے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اس کی نظمیں مصنف کے دِلی جذبات، عادات و اخلاق اور طرزِ عمل کا آئینہ ہیں۔ قومی محبت اور بادشاہِ وقت سے وفاداری کا نقشہ اپنی تحریر میں اِس طرح کھینچا ہے کہ دل بغیر متاثر اور اثر پذیر ہوئے رہ نہیں سکتا۔ ملک و قوم کی مروجہ بُرائیوں، زر پرستی، زن مریدی، بُت پرستی وغیرہ کی مکروہ تصاویر دکھا کر اس درجہ اِن افعال قبیحہ سے متنفر کیا ہے کہ ہر کس و ناکس ان سے از خود کنارہ کش ہو جائے۔ علاوہ ازیں دیگر اخلاقی مضامین کو نظم فرماکر کتاب کی رونق کو دوبالا کر دکھایا ہے۔ کلام نہایت پختہ اور بلند ہے۔ نیچرل شاعری کے نمونے گرانقدر ہیں۔ زبان نہایت شستہ اور شیریں ہے۔ تخیل کی بُلند پردازی عروج پر ہے۔ ●

نمونۂ کلام۔

حمد۔ غزل

رحمت تیری جہاں پہ خدائے عظیم ہے
مانند و مثل تیرا جہاں میں عدیم ہے

ہیں تجھ سے خلق ارض و سما اور کائنات
خالق ہے ساری خلق کا تو اور نعیم ہے

روشن ہیں تیرے فیض سے ارض و سما سبھی
عاصی ہیں سخت ہم تو مگر تو رحیم ہے

ہر جا ہے تیرے نور سے معمور یہ زمین
حاجت روا ہمارا تو ہے اور کریم ہے

رحمت سے اپنے بیٹے کو تو نے ہمیں دیا
خلقت کے واسطے نہیں نارِ جحیم ہے

غافل نہ اس نجات سے ہرگز ہو اے صدا
اب تو جہاں کے واسطے فیضِ عمیم ہے

زمین

اے زمیں کیسی خوشنما ہے تو
خوبصورت ہے دلربا ہے تو

ہے سمندر تری ہر اک جانب
فرشِ سیمیں پہ مہ لقا ہے تو

تجھ میں دریا ہیں جھیل اور جھرنے
ان کے زیور سے خوشنما ہے تو

سبزہ ہے تجھ پہ لالہ و گلزار
ان کی خوبی سے خوش ادا ہے تو

غلّہ ہے تجھ میں اور ہیں اثمار
حق یہ ہے نعمتِ خدا ہے تو

کوہ ہیں تجھ میں اور وادی ہیں
منظرِ دل کش خدا ہے تو

تجھ میں حیوان اور ہیں انساں
ان کی صنعت سے خوشنما ہے تو

حیرت انگیز ہے کرشمہ تیرا
اے بشر اس سے بھی بڑا ہے تو

اپنے خالق کو جان سکتا ہے
یاد رکھ بندۂ خدا ہے تو

اس سے اپنے کو تو الگ مت رکھ
حق کا بیٹا بھی اے صدا ہے تو

حمد مسیح

شہنشاہِ ہر دو جہاں ہے مسیحا
خداوندِ کون و مکاں ہے مسیحا

بشر اور ملائک ہیں بندے اُسکے
یہاں اور وہاں حکمراں ہے مسیحا

کرم بندۂ زار پر دم ہے کرتا
گنہگاروں پر مہرباں ہے مسیحا

مددگار ہر دم ہمارا وہی ہے
ہمارے لئے روح و جاں ہے مسیحا

ہمیں فکر کرنا مناسب نہیں ہے
ہمارے لئے نگہباں ہے مسیحا

ضرورت ہماری وہ کرتا ہے پوری
بہت مہرباں ہر زماں ہے مسیحا

ہدایت ہماری وہ کرتا ہے ہر دم
غرض ہادیِ مہرباں ہے مسیحا

مسیحا سے امید رکھ اے صفدر تو
کہ تجھ پر بہت مہرباں ہے مسیحا

صلیب

صلیبِ مسیحا ہے قدرت خدا کی
صلیبِ مسیحا محبت خدا کی

اِسی سے گناہوں کی ملتی معافی
ہمارے لئے ہے یہ رحمت خدا کی

ہمیں فخر ہر دم صلیبِ مسیحا
ہمارے لئے ہے یہ عظمت خدا کی

ہماری سزا بھی ہے اور مغفرت بھی
ہے رحمت بھی یہ اور عدالت خدا کی

صلیبِ مسیحا ملاتی ہے حق سے
یہ کرتی ہے پیدا رفاقت خدا کی

گناہوں کی نسبت ہوں مصلوب ہم بھی
کہ پیدا ہو ہم میں بھی صورت خدا کی

مسیح کا زندہ ہونا

دنیا میں جا بجا ہیں جو آثارِ زندگی — اب لا رہے ہیں سارے شجر بارِ زندگی
پھولوں سے اب بھی ہے زمیں مثلِ نو عروس — کل کائنات میں ہے یہ رفتارِ زندگی
اب موت کا اثر نہ نمایاں کہیں رہا — کل یہ جہاں بنا ہے چمن زارِ زندگی
منجیٔ جہاں کا قبر سے اس صبح جی اٹھا — دارِ فنا کو کر دیا اب دارِ زندگی

تم اے صدا اسی سے ہمیشہ کی زیست لو
ظاہر ہوں تم سے دہر میں اب کارِ زندگی

ہند کے لئے دعا

ہند پہ اپنا کرم فرما خدائے مہرباں — جلوہ اپنے نور کا دکھلا خدائے مہرباں
دور کر تاریکیٔ باطل پرستی اے خدا — مہرِ دل افروز چمکا اے خدائے مہرباں
ہو منور روزِ روشن کی طرح ہندوستاں — اپنا چہرہ فیض کا دکھلا خدائے مہرباں
دور ہو ظلمت گناہوں کی خدائے کبریا — ہو مکاں یہ ہند بھی تیرا خدائے مہرباں
تیری الفت اور انساں کی محبت ہم میں جو — ہم کو قائم اپنے میں رکھنا خدائے مہرباں

یہ صدا کی ہے دعا اور اس کی ہے یہ آرزو
ہند پر اب فضل ہو تیرا خدائے مہرباں۔

عاجز

نام منشی قاسم علی۔ عاجز تخلص۔ ساکن الہ آباد محلّہ مٹھی گنج مناجات کہنے میں کمال حاصل تھا۔ الہ آباد میں انجیل کی منادی کرتے تھے نہایت خلیق۔ مسافر نواز اور شفیق انسان تھے۔ آپ بھی انیسویں صدی کے شاعر ہیں۔ صحیح تاریخ ولادت اور وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

نمونۂ کلام

خداوند مسیح کا ایک مادر زاد نابینا کو بینائی بخشنا

کدھر ہے تو اے ساقیٔ حق شناس
شرابِ محبت کو لا میرے پاس

مسیحا کی الفت کے دے مجھ کو جام
کہ ہے زندگی میری اوس سے مدام

نہم باب یوحنا سے ہے عیاں
کہ ہیکل سے نکلے جو شاہِ جہاں

پڑا نا گہاں ایک اندھا نظر
کہ تھا مانگتا وہ سرِ راہ پر

کہے شاگرد ہمراہِ عالی وقار
لگے کہنے حضرت سے اے کردگار

گناہ اس نے یا باپ ماں نے کیا
جنم سے یہ اندھا جو پیدا ہوا

مسیحا نے اُس دم یہ ان سے کہا
نہ اس کا گناہ ہے نہ ماں باپ کا

مگر تم یہ جانو خدا کے یہ کام
کہ ظاہر ہوا چاہیئے لا کلام

که بھیجا ہے جس نے مجھے ہے ضرور — کروں اوس کے کاموں کو دن میں ظہور
که جب رات آتی نہیں کرتے کام — وہ ہے خواب گاہِ جہاں لاکلام
که دنیا میں جبتک ہوں میں نور ہوں — چراغِ کرم بہرِ جمہور ہوں
یہ فرما کے حضرت نے تھوکا وہاں — کیا گل سے مخلوط آبِ وہاں
پھر آنکھوں پر اوس کور کے مل دیا — نہانے کو حوضِ سلم میں کہا
یہہ سنتے ہی حضرت سے اے دوستاں — چلا شاد و خرّم نہانے وہاں
نہاتے ہی دیکھو وہ بینا ہوا — جو پنہاں تھا اوس پر ہویدا ہوا
مسیحا بُرائی سے پیدا ہوں میں — سراسر خطاؤں کا شیدا ہوں میں
مرے دل کی آنکھوں کو تو نور دے — مجھے نیک کاموں کا مقدور دے
نہیں ہے مرا کوئی تیرے سوا — تو کر رحم مجھ پر مسیحِ کبریا
مجھے سب گناہوں سے تو پاک کر — خطاؤں سے مجھ کو تُو بےباک کر
مجھے روح کا فضل دے اے شفیع — دکھا اپنی قدرت کا رتبہ رفیع
مسیحا تو ہی ہے ہماری سپر — بزرگی دہندہ سرافروز تر

یہی عرض عاجز کی ہے اے مسیح
گناہوں کا بخشندہ تو ہے صریح



عاؔصی

نام میر شجاعت علی۔ عاؔصی تخلّص۔ مونگیر کے رہنے والے تھے بہت ہمدرد۔ نیک۔ صُلح کار ہر دلعزیز اور مقبول خادم دین گذرے ہیں اُردو۔ ہندی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام پاکیزہ۔ مضامین سے پُر اور محبّت و اخلاص سے بھرا ہوا ہے۔ جو مقبولِ خاص و عام تھا ہیضہ میں مبتلا ہو کر انتقال فرمایا۔ تاریخ رحلت معلوم نہ ہو سکی۔

چونکہ بنگالہ نژاد تھے اسلئے زبان میں بنگالی اردو نظر آتی ہے۔ لیکن اشعار میں روحانیت اور دلی جوش وخروش ظاہر ہوتا ہے۔

غزل

گناہوں کو اپنے جو ہم دیکھتے ہیں
تو قہرِ الٰہی بہم دیکھتے ہیں

اگر غور کرتے ہیں فعلوں کو اپنے
تو لائق جہنم کے ہم دیکھتے ہیں

گناہوں میں اے دل رہا تو جو مائل
سزا اس کی پائے گا ہم دیکھتے ہیں

تمہارے گناہوں کی بخشش کی خاطر
مرا ہے مسیحا یہہ ہم دیکھتے ہیں

جو پکڑے وسیلہ شتابی مسیح کا
حیاتِ بقا اوس میں ہم دیکھتے ہیں

تیرے درد و غم کی یہی اک ہے دارو
مسیحا ہے شافی یہہ ہم دیکھتے ہیں

تو اس بات میں شک نہ کر دل میں عاصی
گواہی ہے انجیل ہم دیکھتے ہیں

غزل

مرا نہیں ہے کوئی مددگار یا مسیح
تو ہی ہم سبھوں کا مددگار یا مسیح

تیرے بغیر کوئی نہیں یار یا مسیح
بندہ ہوں تیرے در کا گنہگار یا مسیح

تو ہی ہے عاصیوں کا خریدار یا مسیح
ازبسکہ ہوں گناہ میں گرفتار یا مسیح

شیطان مجھ سے کرتا ہے تکرار یا مسیح
رُوح القدس کی دے مجھے تلوار یا مسیح

اب لے خبر شتاب کر بار یا مسیح
فریاد میری تجھ سے ہے ہر بار یا مسیح

کرتا ہے عاصیوں کو تو ہی پیار یا مسیح
ہم عاصیوں کی تجھ سے ہے گفتار یا مسیح

عاصی کو ہے فقط تو ہی درکار یا مسیح
تجھ بن کرے گا کون مجھے پیار یا مسیح

غزل

کروں حمد اے رب میں تیری سدا
رکھ اپنے ہی در کا مجھے تو گدا

تیرے فضل کا ہوں میں امیدوار
ہوں دل جان سے میں تو تجھ پر فدا

تجھی سے فقط مجھ کو امید ہے
گناہوں کا ہے بوجھ مجھ پر لدا

ہے افضل محبت تیری اے مسیح
تھا بخشش کو ہم سبکی تو ہی جُدا

بجز تیرے ہرگز نہیں اور ہے
تو ہی ہے گا بے شک سبھوں کا خدا

یہی التجا تجھ سے ہے اے مسیح
اس عاصی کو ہرگز نہ کیجو جُدا

عنایت

اسمِ گرامی عنایت مسیح۔ تخلص عنایت۔ راولپنڈی میں کلامِ خدا کی منادی کرتے تھے۔

نمونۂ کلام۔

سلام

بندۂ عاجز کا اوس فرزندِ داور کو سلام
مالکِ ہر دو جہاں سلطانِ اطہر کو سلام

خالقِ ارض و سما ذوالفضل اطہر کو سلام
میرا اس شاہنشاہِ مصلوب و مظہر کو سلام

رحمتِ حق قادرِ دارین سرور کو سلام

خون سے اپنے لیا ہے مول ہم کو اوسنے جب
دور کر سارے گناہ اور نعمتیں دیں کی سب

رفع کر کے رنج و غم اور دفع کر کے سب لقب
وارثِ خلدِ بریں اوسنے کیا ہے ہم کو اب

قادرِ مطلق مسیحِ پاک و اطہر کو سلام

ہم لہو سے اوس کے ہیں مقبول درگاہِ خدا
نام سے اوس کے ہی بخشی جاتی ہیں ساری خطا

ہے نہیں اوس کے سوا عالم میں کوئی دوسرا
جس سے ہم مل جائیں ذاتِ پاکِ حق میں برملا

بھیجتا ہوں دل سے اوس قدرت کے جوہر کو سلام

بخش عنایت کو تو صبر اور روحِ رحمت یا مسیح
نیکیاں اور خوبیاں حلم و محبت یا مسیح

دے مجھے تو فضل سے جو ہے ضرورت یا مسیح
مر کے جاؤں پاس تیرے پاؤں جنت یا مسیح

تاجِ رحمانی کے اوس تابندہ گوہر کو سلام

فرحت

اسم گرامی شنکر دیال فرحت تخلص، قصبہ بھوگاؤں ضلع مین پوری
کے کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مسیحی دین قبول کر لیا۔ آپ شاگرد رشید
منشی جواہر سنگھ جوآہر تھے۔ پہلے امریکن مشن اسکول میں ۲۷ برس تک ملازم
رہے اور پھر نولکشور پریس سے منسلک ہو گئے وہاں انہوں نے ۱۸۸۶ء میں
رامائن کے کچھ اجزاء کا منظوم ترجمہ کیا جو اردو زبان میں رامائن کا سب سے پہلا
ترجمہ ہے۔ انہوں نے گنیش پوران کا بھی منظوم ترجمہ کیا جو بہت مقبول ہوا
پہلی تین اناجیل کو نظم کا جامہ پہنایا۔ آپ کے اکثر اشعار شمس الاخبار
میں شائع ہوتے تھے۔ کئی تصنیفات تھیں۔ لیکن سب نایاب ہیں۔ دُنیا
کی ناپائیداری اور بے ثباتی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔

علم موسیقی میں اچھا دخل تھا اور علم موسیقی پر بھی آپ نے تصنیفات کیں
نواسنج۔ خوش کلام اور شیریں زبان تھے۔ کلام تمامتر روحانی اور
حقانی ہے۔ بعض لوگوں کو ان کے مسیحی ہونے پر شبہ ہے۔

۱۸۸۹ء میں رحلت کی۔

غزل

اے دل یہی مقولۂ ہر ذی حیات ہے　　دریائے فیضِ حضرتِ عیسیٰ کی ذات ہے
مختار ہے وہ جملہ سیاہ و سفید کا　　عیسیٰ کو اختیارِ حیات و ممات ہے
دنیا میں ہے وہ بہر لبشر باعثِ حیات　　عقبیٰ میں بھی اوسی سے حصولِ نجات ہے
اوس کے نسیم فیض کا اے دل یہ ہے اثر　　پھولا پھلا سدا چمنِ کائنات ہے
غافل خدا کے واسطے عیسیٰ سے لو لگا　　کیا اعتبارِ زندگیِ بے ثبات ہے

غزل

وصفِ عیسیٰ کہے کب طاقتِ گویائی ہے　　کب زباں کو یہہ بہم تابِ توانائی ہے
مارتا دل سے ہے گنجینۂ دنیا یہ وہ لات　　دولتِ دینِ مسیحا جسے ہاتھ آئی ہے
تجھ کو دیکھے یہ نہیں ہر کس و ناکس کی نگاہ　　ہاں وہ دیکھے کہ جسے قوتِ بینائی ہے
رمزِ حق کیا کوئی پہچان سکے جان سکے　　تابِ دانش ہے نہ واں دخلِ شناسائی ہے
دل کے آئینہ کو دے صیقلِ ایماں سے صفا　　اے مسیحا یہی اب وقتِ مسیحائی ہے

غزل

مسیحا نہ آسماں کرم ہے　　شہ کشورِ افتخار و حشم ہے
صفت کی قلم کو کہاں تاب طاقت　　زیادہ لکھے جسقدر کم سے کم ہے
وہ لاریب ہے مالکِ دین و دنیا　　اوسی سے ہے ہستی اوسی سے عدم ہے
اوسی سے ہے سرسبز گلزارِ دنیا　　وہی نخلِ بندِ ریاضِ ارم ہے

نہیں مطلق آغاز د انجام اُوس کا | اُو ہے اختیارِ حدوث و قدم ہے
جو ہے جان و دل سے مطیعِ مسیحا | نہ دُنیا کا کھٹکا نہ عقبیٰ کا غم ہے
بشر دل سے بھُولے جو احسانِ عیسیٰ | ستم ہے ستم ہے ستم ہے ستم ہے

مستزاد

دل سے جو حضرتِ عیسیٰ کے طلبگار ہوئے — عاشقِ زار ہوئے
بس وہی راہِ حقیقت سے خبردار ہوئے — مردِ ہشیار ہوئے
تو ہے سلطانوں کا سلطان رسولوں کا رسول — باغِ اخلاق کا پھول
تجھ سے صحرا ہوئے دریا ہوئے گلزار ہوئے — گل ہوئے خار ہوئے
تو جو عالم میں نہ ہوتا تو نہ ہوتا کچھ بھی — اپنا ہے قول یہی
سارے افلاک و زمیں تجھ سے نمودار ہوئے — دشت و کہسار ہوئے
آپ کی شان سے افلاک کی ہے شان دبی — سجدہ کرتے ہیں نبی
آپ کونین کے افسر ہوئے سردار ہوئے — کُل کے مختار ہوئے
جو مخالف کہ خداوند کو پہچانتے تھے — خُوب اُسے جانتے تھے
دشمنی کرکے وہ لعنت میں گرفتار ہوئے — داخل النار ہوئے
پر جو اُن میں سے بھی آخر کو پشیمان ہوئے — صاحبِ ایمان ہوئے
چھوڑ دُنیا کو وہ عیسیٰ کے طلبگار ہوئے — بیڑے سب پار ہوئے

مددحسین

صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ آپ عاشقِ خداوند مسیح تھے۔ طویل علالت کے باعث خانہ نشین ہو گئے تھے۔ بڑے دُعا گو تھے ہمیشہ خداوند مسیح کے مدلح اور شکرگذار تھے۔

غزل

جلوہ ہے تیرا کون و مکان میں
رونق ہے تیرے نام سے دونوں جہان میں

تعریف تیری کر سکے کس کی مجال ہے
ہمسر نہیں ہے تیرا زمین و زمان میں

تیری ہی ذاتِ پاک نے ہم کو بچا لیا
دوزخ سے اور کفر سے دونوں جہان میں

کیا رحم ہے صلیب پہ قاتل نے کھینچا جب
مانگی دُعا یہ باپ سے قاتل کی شان میں

اے میرے باپ رحم کر اِس قوم پر تو اب
ایمان و خُلق ان کو عطا کر تو آن میں

نادان ہیں یہ مجھ کو سمجھتے نہیں ذرا
اوہام فاسدہ ہیں بس انکے دھیان میں

رونے کی جا ہے دوستو اور غم کا ہے مکاں
کیسا شفیع یوں قتل ہوا اِس جہان میں

پانی کے بدلے سرکہ میں پت ڈال کر دیا[۱]
یہ ظلم تھا یہ جور مسیحا کی شان میں

جس نے یہ رنج و غم سہے امت سہے مدد
تو بھی فدا ہو دل سے اُسی پر جہان میں

۱ متی ۲۷/۳۴

غزل

دِلا کیوں روزِ محشر سے ہراساں اور لرزاں ہوں
وسیلہ مظہرِ حق ہے اُسی پر میں تو نازاں ہوں

میرا ایمان تو قائم ہے اس بحرِ شفاعت پر
تو پھر عیشِ دوامی کا دلا کیونکر نہ شایاں ہوں

پھنسا ہوں میں گناہوں میں سبھے صحرائے محشر میں
چھوڑانا تو ہی اے عیسیٰ اسیرِ دامِ عصیاں ہوں

بحقِ فدیۂ اُمت خطائیں کر عفو میری
مَیں نادانی سے اپنی اے خداوندا پشیماں ہوں

کھڑا ہوں بوجھ عصیاں کا لئے سر پر خداوندا
رہائی دے مجھے خالق میں گریاں اور نالاں ہوں

ندا دی ذاتِ مطلق نے کہ آؤ اے گنہگارو
حیاتِ دائمی لو مجھ سے میں فرزندِ یزداں ہوں

کہاں جاؤں میں غم دیدہ گناہوں سے ہوں شرمندہ
خدایا رحم کر مجھ پر مَیں پکڑے تیرا داماں ہوں

ہے فخرِ مرسلاں عیسیٰ مدد مَیں اس کا بندہ ہوں
اُسی کے عشق میں ہر وقت شاداں اور فرحاں ہوں

منّت

اسمِ گرامی کیدارناتھ۔ تخلّص منّت وطن گھنراج پور۔ پادری کے عہدہ پر فائز تھے۔ اُستادوں میں شمار ہوتا تھا۔ کلام بہت ممتاز ہے فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے ہیں۔ عروض سے واقف ہیں۔ زبان نہایت شُستہ و پاکیزہ ہے۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ فارسی زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ افسوس صحیح تاریخ ولادت اور وفات کا سُراغ نہ مل سکا۔

نمونۂ کلام:-

رُباعیات

گل جس کو سمجھتا تھا وہ داغ آج ہوا
باغی جو تھا گُل اس کا چراغ آج ہوا
منّت قدمِ ابنِ الٰہی کے طفیل
چرنی کا سر عرش دماغ آج ہوا

ہے موت گنہ صریح کیوں نہ سب اس سے ڈریں
ہے اس کا اثر قبیح اس کو ہرگز نہ کریں
ہے دھوم کلیساؤں میں یہ منّت سنو
زندہ ہوا پھر مسیح تاکہ ہم پھر نہ مریں

نظم — بیوہ کا بڑا دن

ہے تشویش بیوہ بیچاری بڑے دن کیلئے   کیا کرے وہ آہ تیاری بڑے دن کیلئے
ہے خوشی سبکو بہت بھاری بڑے دن کیلئے   روتی ہے یہ افلاس کی ماری بڑے دن کیلئے
کیا ہے غیر از گریہ و زاری بڑے دن کے لئے

خود تو بیوہ ہوگئی بچے بھی اسکے ہیں یتیم   کب سے فاقہ ہے افاقہ کیوں نہ ہو از حد سق
انکو ہے فاقہ کا خوف اور رات کو سردی کا بیم   ہے شریک افلاس اسکا مفلسی اسکی حر
آدھی ننگی ہے کہاں ساری بڑے دن کے لئے

اپنے بچوں کیلئے کپڑے کہاں سے لائے وہ   کیوں نہ پوشاکوں سے بچوں کیلئے شرمائے
شرم دامن گیر کس سے مانگنے کو جائے وہ   کس کے گھر پر جائے کس کے در پہ سر ٹکرائے و
کس سے ہے امید غمخواری بڑے دن کے لئے

کتنے ہی ہوں گے شراب ناب جو پی کے مست   بڑھ کے رندوں سے دکھائیں کیفیت
دولت حق داد کا کرتے ہیں کیا یہ بندوبست   کیا خبر انکو کہ ہے بیوہ بھی کوئی تنگ د
ہے عبث منت کی زرداری بڑے دن کے لئے

قطعہ تاریخ

بر تغیرہائے گیتی تکیہ کردن ناروا است
قلب از تحریک ساکن گشت الاآدم برفت

یارہ وفات ناگہانش تا سرِ عرشِ بریں
قدسیاں را ہم صدائے نالہ و ماتم برفت
بہرِ تاریخ وفاتش منتؔ آوازِ سروش
گفت واعظ لعل جوئیل آہ از عالم برفت

غزل ایسٹر

تو نے بدلی وہ زمانے کی ہوا تیسرے دِن
اے مسیح ابرِ اجل سر سے ہٹا تیسرے دِن
تو جو گیہوں[1] کی طرح گر کر اُٹھا تیسرے دِن
سو گنا ہو گیا تنہا نہ رہا تیسرے دِن
مُردے قبروں سے اُٹھے تو نے جو دم توڑ دیا
شہر والوں پہ یہ اسرار کھُلا تیسرے دن
لاش پر ملنے کو خوشبو کے جو آئی مریم
قبر میں غیر کفن کچھ نہ مِلا تیسرے دن
تو رہا بطنِ زمیں میں دہن حُوت میں وہ
تو نے یونس کا نشاں ہم کو دیا تیسرے دن
مر گئے آج تو کل دوسرا دِن ہے منتؔ
غیر کیا اپنے ہی بیٹھیں گے بھُلا تیسرے دِن

[1] یوحنا ۱۲: ۲۴

مسدس۔ گدڑ فرائیڈے

باغِ گتسمنی میں آمد ہے گلِ بے خار کی   بلبلوں نے کھول دی ہیں کھڑکیاں منقار کی
زار حالت ہو رہی ہے آج کیوں گلزار کی   سرو سنبل میں شباہت ہے رسن و دار کی
دم گھٹا جاتا ہے قمری کا گلے کے طوق سے
زیر و بالا غم کی رونق ہے تحت و فوق سے

کہتے ہیں پہلے پئے گلگشت عالم تھا یہ باغ   سیر کو آتے تھے اکثر کام سے پا کر فراغ۔
اسکی خوشبو سے معطر ہوتے تھے انکے دماغ   آج کیوں ہیں ہر گل و لالہ کے دل میں داغ داغ
سبزۂ بیگانہ کی صورت نہ دخلِ غیر ہو
چاک دامانِ گلِ تر کی الٰہی خیر ہو

بیکلی کیا ہے نہیں کھلتے جو غنچوں کے دہن   شاخِ گل پر بیٹھی ہے چپ عندلیب نغمہ زن
شبنم ترسے ہوئے افسردہ کیوں برگِ سمن   گھات میں کس گل کے ہے صیاد گلچین چمن
پائے گل کی بن گئی زنجیرِ موجِ بوئے گل
رہزنِ گل آ رہا ہے بوئے گل پر سوئے گل

آبیارِ بوستانِ دہر کا باغی رسول   باغ میں زیتون کی جس طرح ہو نخلِ ببول
طرّہ ہیں دستارِ وحشت کیلئے زرد اسکے پھول   تھا بیابانِ بغاوت کا یہی آوارہ غول
طامعِ زر نے زرِ گل کے لئے پرکھے روپے
گاہکوں نے جو کھرے کھوٹے دیئے پرکھے روپے

گلشنِ مریم کا باغی لے گئے گل توڑ کر   باغِ گتسمنی کا لوٹا خارخانی چھوڑ کر
مارِ سنبل وہ زرِ گل کے لئے سر پھوڑ کر   دیکھا گلچیں نے بھرا اجڑا چمن منہ موڑ کر

رونقِ گلزارِ عالم سے گیا صیاد آہ
خود ہی باغی اس سے پہلے ہو گیا برباد آہ

چپ ہو اے منت کہ ہیں اہلِ جہاں کچھ ایسے بخت
خشک تو ہے خشک یہ کاٹیں ہرا جڑ سے درخت

پارہ پارہ سینہ ہے اس غم سے اور دل لخت لخت
گفتگو شیریں کریں میٹھے لبِ شیریں کے کرخت

کاش عیسو کی گرفتاری میں تو آزاد ہو
گریہ وزاری سے اس غم کی ترا دل شاد ہو

غزل

گُلِ شیراز سے یہ نوک کی لے گا بیاں ہو کر
کرے گا حمدِ عیسیٰ کی سر مُو ہر زباں ہو کر

تلاشِ میشِ برگشتہ میں چوپانِ دراں ہو کر
زمیں کا بن گئے گنہ خالقِ ہفت آسماں ہو کر

تعالیٰ کی نہ چھوڑے گا دلِ رفعت پسند اپنا
رہیں گے جب زمیں پر ہم رہیں گے آسماں ہو کر

گناہوں کو ہمارے لے کے اُس نے کاٹھ پر ٹھونکا
مٹا حکموں کا دستاویز کیلوں کا نشاں ہو کر

بنا ہوں تب میں سجدہ گاہِ عالم انکساری میں
پڑا ہوں جب درِ عیسیٰ پہ سنگِ آستاں ہو کر

لوقا ۱۵ : ۲-۷

پہنایا خلعتِ نوزادگی شاہ دو عالم نے
بدن سے جامۂ پارینہ اترا دھجیاں ہو کر
نہیں ہے گردشِ تقدیر اے منتؔ تو کیوں ہر دم
بدلتا ہے زمانہ رنگ اپنا آسماں ہو کر

غزل

گدایانہ شہہ کونین کیا کنعاں میں آیا ہے
مہ نخشب ہے چاہِ نخشبِ کیہاں میں آیا ہے
وہ مفلس بن گیا ہے تاکہ دولتمند ہوں ہم سب
خزانہ ساتھ اپنے منزلِ ویراں میں آیا ہے
چھُوا، دیکھا، ٹٹولا اس کو ہم نے تاک بھی رکھا
کمال اس کی الوہیت کا جسم و جاں میں آیا ہے
ہم اس کو آمدِ ثانی سے پہلے کس طرح دیکھیں
ہمارا دم لبوں پر فرقتِ جاناں میں آیا ہے

خبر دینے کو طوفانِ تلاطم خیز اے منتؔ
بہا دل ہو کے پانی دیدۂ گریاں میں آیا ہے

ماسٹر رامچندر

قوم کے کائستھ تھے والد کا نام رائے ٹیک چند تھا خورد سالی میں مولوی کریم الدین
کے بموجب ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے تھے (تذکرہ فیلن صفحہ ۳۶۰) دہلی مدرسہ کے انگریز پرنسپل
جناب ٹیلر صاحب نے ان کے لئے وظیفہ مقرر کیا۔ کالج میں آپ نے انگریزی۔ ہندوستانی اور فارسی
زبانیں سیکھیں لیکن علم ریاضی میں کمال حاصل کیا اور بعد تحصیل علم دہلی مدرسہ میں معلم ہو گئے
۱۸۵۱ء میں ۳۵ سال کی عمر میں مسیحی مذہب قبول کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے یہ پہلے ہندو تھے
جنھوں نے مسیحی مذہب اختیار کیا۔ انکے مسیحی ہو جانے پر دہلی میں خاصی ہلچل مچ گئی۔ منشی
دیبی پرشاد نے بھی اپنے تاریخی تذکرے اشاعت ۱۹۵۷ء میں ماسٹر رامچندر کے مسیحی ہو جانے
پر سخت غصہ۔ تنگ نظری اور مذہبی تعصب کا اظہار کیا ہے جو ایک مصنف کے شایان شان
نہیں ہو سکتا۔ ادب، ادب ہے اسمیں بے ادبی کا دخل نہیں ہونا چاہیئے ماسٹر صاحب
متعدد کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ الجبرا۔ مثلث اور علم ہندسہ وعلم الحساب پر
مفید کتابیں لکھیں۔ دو رسالوں کے ایڈیٹر بھی رہے۔ عجائب روزگار۔ اصول علم ہیئت
تذکرۃ الکاملین اور اعجاز قرآن ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔

مدرسہ کی ملازمت کے بعد ریاست پٹیالہ میں پہلے مہاراجہ کے اتالیق مقرر ہوئے بعد میں سررشتہ تعلیم
کے ڈائرکٹر ہو گئے۔ بمطابق دیبی پرشاد ۱۸۸۰ء میں وفات پائی۔ شاعری کا بھی شوق تھا
ان کے صرف دو اشعار ہندوؤں میں اردو از سید رفیق مارہروی کے توسل سے حاصل ہو سکے۔

بلندی وہ خرداں ہے وہی ۞ شہی بخش شاہ شہاں ہے وہی
گدا کو وہ چاہے تو دے خسروی ۞ ضعیفوں کو وہ کر دے دم میں قوی

واعظ

نام منشی رحمت مسیح ۱۵ر مئی ۱۸۵۷ء قصبہ نارووال ضلع سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی پھر نارمل اسکول امرتسر میں۔ اسکے بعد سیالکوٹ میں علم الٰہی کی تعلیم حاصل کی۔ پادری بھولا ناتھ صاحب ہیڈ ماسٹر نارووال اسکول کی تعلیم اور صحبت نے دل پر بہت اثر کیا اور ۱۲ر مئی ۱۸۷۳ء معہ خاندان و والدین بتیسمہ لیکر دینِ مسیحی میں شامل ہو گئے۔ رسالہ نور افشاں لدھیانے کے نائب مدیر رہے۔ کچھ عرصہ مشن پریس سیالکوٹ کے مینجر رہے۔ کچھ مدّت تک مدرسی بھی کی۔ قریب آٹھ کتابیں تصنیف و تالیف و ترجمہ کیں۔ جن میں راحتِ دل بہت مشہور ہوئی۔ یہہ اردو اور پنجابی زبان میں ہے طبیعت میں مسیحی محبّت کا جوش۔ دلی صفائی۔ سیدھی سادی بول چال تھی۔ یہی اوصاف ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہیں۔

نمونۂ کلام:-

غزل

مسیحا مالکِ ہر دو جہاں ہے
مسیحا خالقِ کون و مکاں ہے

مسیحا بادشاہِ مرسلاں ہے
مسیحا سرورِ پیغمبراں ہے

مسیحا دستدارِ عاصیاں ہے
مسیحا چارہ سازِ بیکساں ہے
مسیحا حافظ و ہم پاسباں ہے
مسیحا جسم میں یا روحِ رواں ہے
مسیحا قدرتِ حق کا نشاں ہے
مسیحا نخلبندِ بوستاں ہے
مسیحا ہے شبیہہ حق عیاں ہے
مسیحا کا بیاں رب کا بیاں ہے
مسیحا رہنمائے گمراہاں ہے
مسیحا دستگیرِ بیکساں ہے
مسیحا سے ہرا ہے باغِ عالم
مسیحا آپ اس کا باغباں ہے
مسیحا ہے ازل سے ابد تک
مسیحا ہر زماں میں ایکساں ہے
مسیحا کی ثنا وردِ زباں ہے
مسیحا کا یہہ واعظ نغمہ خواں ہے

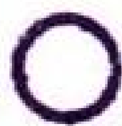
غزل

قند میں ہے ایسی شیرینی کہاں
ہے مسیحا جو تیری گفتار میں
تیری ٹھوکر سے لعاذر جی اُٹھا
زندگی ہے بس تیری رفتار میں
فرق ہے ارض اور سما سے بھی فزوں
حبِّ دنیا اور تیرے پیار میں
میرے دل میں آبسو میرے مسیح
تاکہ ہوں ہشیار تیرے کار میں
مجھ کو صحت دیجئے میرے مسیح
ہوں گناہوں کے بڑا آزار میں
خوابِ غفلت سے اٹھو کیوں سوئے ہو
فرق ہے خوابیدہ اور بیدار میں
دل مرا تاریک عصیاں سے ہوا
مجھ کو لے چل اپنے تو انوار میں

یا مسیح واعظ کو کر اپنے قبول
ہے وہ حاضر اب ترے دربار میں

غزل

تجھ ہی سے مسیحا میری التجا ہے
خطا بخش دیجئے یہی اب دعا ہے
سزاوار تجھ کو ہے شانِ خدائی
تری ذات قدوس اور کبریا ہے
ہمارے گناہ دور کرنے کی خاطر
ترا خون دنیا میں آکر بہا ہے
سفارش کرے انبیاء کی خدا سے
یہہ خالق نے رتبہ تجھی کو دیا ہے
ہوا تھا جو مصلوب دنیا میں عیسیٰ
حبیبِ خدا سرورِ انبیاء ہے
یہہ کس کے لئے رنج تو نے اٹھائے
ہمارے ہی بدلے یہہ سب کچھ ہوا ہے
پناہ ہو جیو روزِ محشر کو عیسیٰ
فدا نام پر تیرے واعظ ہوا ہے



شعرائے متاخرین

آثر بریلوی

نام اے وی ڈیوڈ۔ تخلص آثر ۲ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء بمقام مُرادآباد پیدا
ہوئے۔ تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ میٹرک پاس کرکے ریلوے میں ملازمت کرلی اور
ہیڈ کلرک کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اب بریلی میں سکونت پذیر ہیں۔
بچپن سے کتب بینی کا شوق ہے خصوصاً مذہبی کتابیں۔ پادری محبوب
مسیح بیدآر بریلوی مرحوم کے شاگرد رہے ہے۔ تہاراجہ بھرت پور کے موتی محل مشاعروں
میں شرکت کی ہے۔ کلام زیادہ تر نعتیہ ہے۔ گاہے گاہے مسیحی رسالوں میں نظر
آتا ہے۔ لکھنے کا بہت شوق ہے۔

نمونۂ کلام

قطرے سے الغرض مجھے دریا بنا دیا	...کو مسیح تونے خدا سے ملا دیا
قسمت کو میری دید کے قابل بنا دیا	...بنکے بخش دیئے تونے دو جہاں
رحمت نے تیری اس کو مگر حوصلا دیا	...تاب مشتِ خاک تھی کرتا کبھی گناہ

پھر اُٹھ سکا نہ دہر میں وہ اشک کی طرح — تو نے اگر کسی کو نظر سے گرا دیا
یارب تیرے جہاں میں یہ عصیاں کا ہے کمال — تجھ کو رحیم اور مجھے عاصی بنا دیا

کیونکر کہوں بُرا میں غریبی کو اے اثر
اس نے تو مجھ کو تحفۂ یادِ خدا دیا

توصیفِ مسیحا

ہم نے جب عیسیٰ کی صورت دیکھ لی — صانع عالم کی قدرت دیکھ لی
عاصیوں نے راہ جنّت دیکھ لی — خونِ عیسیٰ کی بدولت دیکھ لی
ہم تیری قدرت کے قائل ہو گئے — خالی جب لعزر[1] کی تربت دیکھ لی
جان کو ہم پر نچھاور کر دیا — دیکھ لی شانِ محبّت دیکھ لی
رو پڑا غیرت سے پطرس[2] ناگہاں — کیا تیری چشمِ مروّت دیکھ لی
جان دینے کی تمنّا ہے آثر — دار کی ہم نے حقیقت دیکھ لی

غزل

انداز بے رُخی ہی تیرا سازگار ہے — تو جتنا دُور دُور ہے اُتنا ہی پیار ہے
رنگت نہیں شباب کی ہے خونِ کمسنی — سُرخی جو تیرے رُخ پہ صنم آشکار ہے
گزرا ہے اس طرف سے کوئی پیکرِ جمال — ہے گرد پُر جلال منوّر غبار ہے
اس زندگی میں تلخیٔ غم ہے خوشی کے ساتھ — جیسے چمن میں پھول کی قربت میں خار ہے
ہر سُو کسی کے حسنِ تجلّی کا عکس ہے — جس شے کو دیکھتا ہوں سراپا بہار ہے
دوزخ کا خوف کیوں ہے آثر جب ترے لئے — لطفِ خدا ہے رحمتِ پروردگار ہے

---

[1] چار دن کا مردہ جس کو حضرت مسیح نے زندہ کر دیا۔ یوحنا ۱۱ : ۴۴
[2] حضرت مسیح کا ایک شاگرد جس نے استاد کا انکار کیا بعد میں اپنی بیوفائی پر نادم ہوا۔ متی ۲۶

اختر (سوشیل) لدھیانوی

نام سوشیل، تخلص اختر، ۱۷ جولائی ۱۹۳۴ء مسوری پہاڑ پر پیدا ہوئے۔ لڑکپن لدھیانہ میں گذرا۔ ۱۸ برس کی عمر تک اپنے بڑے بھائی سیموئیل عرشی کی سرپرستی میں زندگی گذری۔ عرشی صاحب صاحب ذوق تھے اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے یہاں اکثر ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ سوشیل اختر ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے اور اس طرح ان کے ادبی ذوق و شوق کی تربیت ہوتی رہی اور فنی شعور پیدا ہونے لگا۔

سنہ ۱۹۴۸ء میں جشن آزادی پر پہلی نظم کہی اور سنہ ۱۹۵۰ء میں ریڈیو کے لئے پہلا افسانہ "دھجیاں" لکھا۔ بمبئی میں فلم کمپنیوں میں کام کرنے کی کوشش کی مگر بے سود رہی۔ اب کرسچن میڈیکل کالج لدھیانہ میں ملازمت کرتے ہیں۔

کلام سمجھ کر کہتے ہیں۔ زبان صاف ہے۔ لدھیانہ کی ادبی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں اور مقبول ہیں۔ مسیحی رسالوں میں شاذونادر کلام شائع ہوتا ہے۔

نمونۂ کلام۔

توصیفِ مسیحا

مونس و غمخوار کیا کوئی تھا اس کا حبیب
جا بہ جا پھرتا رہا کاندھے پہ وہ رکھے صلیب

زندگی بھر جن کی خاطر وہ رہا محوِ نماز
یعنی ہم اور آپ ہی آخر ہوئے اس کے رقیب

اور اک جامِ شفاعت اور اک جامِ نجات
میں تو ہوں اے ساقیِ کوثر ترا رندِ غریب

اب بھی توبہ کی ہے ساعت ابھی ہے وقتِ عمل
بکھرے بیروں کو اٹھا لے ورنہ پھر تیرا نصیب

آپ کو مجھ کو زمانہ کس لیے پھر بخش دے
جب نہیں بخشا زمانے نے محبت کا نقیب

بجھتی بجھتی ہو گیا دامانِ دل تو غم نہ کر
درد کا درماں لیے وہ آ گیا حاذق طبیب

یہ وہی عیسیٰ ہے جو مصلوب ہو کر جی اٹھا
کس لیے ہو محوِ حیرت دیکھ لو آ کر قریب

ہر غزل اک فیض ہے اختر میرے محبوب کا
ورنہ میں شاعر نہیں ہوں اور نہ ہوں کوئی ادیب

غزل

نیاز و ناز کا عالم تلاش کرتے چلو
گزر گیا ہے جو موسم تلاش کرتے چلو

حرم و دیر کے کہنہ بتوں سے کیا حاصل
کسی کا حسنِ مجسم تلاش کرتے چلو

خدا تو شہر کے ہر راستے پہ ملتے ہیں
ہمارے واسطے آدم تلاش کرتے چلو

شراب و شعر ہی کافی نہیں ہیں محفل میں
کسی کے گیسوئے برہم تلاش کرتے چلو

اگر حیات کا مقصد ہے جستجو اختر
تو مشتِ خاک کیوں انجم تلاش کرتے چلو

انجم لدھیانوی

اسم گرامی یوسف مسیح۔ تخلص انجم۔ وطن لدھیانہ

۳۱ مارچ ۱۹۲۲ء فیروزپور چھاونی میں پیدا ہوئے پہلے ایف۔اے پھر ادیب فاضل پاس کیا اور مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔ زمانہ تعلیم سے شوقِ شاعری اور مصوری پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۹۶۸ء سے حضرت منور لکھنوی کے حلقۂ شاگرداں میں شریک ہوئے اُستاد کی وفات کے بعد حضرت مشیر جھنجھانوی سے فیض حاصل کرتے ہیں

آپ کے کلام کا مجموعہ "تابشِ انجم" شائع ہو چکا ہے دوسرا شعری مجموعہ "حیاتِ نو" (امر جیوتی) ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔

خانگی زندگی پُر درد ہے۔ شریکِ حیات نے دغا دی اور بے وفائی کی جس کی وجہ سے بہت دل شکستہ ہو گئے۔ پہلو میں زخمی دل رکھتے ہیں۔ اشعار کی شکل میں دل کے زخموں کا علاج اور سکونِ دل تلاش کرتے ہیں۔

قوم اور قوم کے لیڈروں سے سخت نالاں ہیں دُنیا والوں نے اُن پر اتنے ظلم ڈھائے ہیں کہ اب ان کو کسی جگہ امن و سکون نظر نہیں آتا۔ ان باتوں کے امتزاج سے اُن کی شاعری وجود میں آئی ہے۔

نظمیں زیادہ لکھتے ہیں کلام میں آورد زیادہ ہے۔ غزلوں میں بھی نظم کا رنگ آجاتا ہے۔ ترکیبیں چُست اور دلآویز ہیں بعض نظمیں بہت جوشیلی ہیں طنزیہ اشعار بھی کہے ہیں۔

کلام سے ان کے خیالات و عادات، مذہب، و اعتقادات، حالاتِ زندگی سب پر روشنی پڑتی ہے۔ کہیں کہیں ایسے اشعار بھی کہہ گئے ہیں جنکو پڑھ کر ان کے عقیدہ پر شبہ ہونے لگتا ہے جس کا اُن کو خود اعتراف ہے ؎

دنیا کے ملحدوں میں ہمارا شمار ہے ۔۔۔ منھ موڑ کے جو بیٹھے ہیں ابنِ خدا سے ہم
اگر کاہن سے ملتا ہے یہ تمغہ کفر کا بہتر ۔۔۔ خدا کا شکر ہے کاہن کی عظمت لیکے آیا ہوں
معمورِ تجلی سے آغوشِ نظر کر دے ۔۔۔ ہر ذرۂ گیتی کو خورشید و قمر کر دے

نمونۂ کلام

مناجات

دامن کو تجلی کے سیلاب سے تر کر دے ۔۔۔ ہر ذرۂ گیتی کو خورشید و قمر کر دے
توحید کے پرچم میں لہرائے ظفر مندی ۔۔۔ اقلیم دو عالم کو اس شان سے سر کر دے
منزل پہ بہر صورت اک روز پہنچ جائیں ۔۔۔ عیسیٰ کے کرم سے وہ سامانِ سفر کر دے
اس قوم کے کاہن کی ہو تیغ بکف نظریں ۔۔۔ اس قوم کے شاعر کے سینہ کو سپر کر دے
جمہور کے گلشن میں ہر چیز بدل جائے ۔۔۔ ویرانۂ ہستی کو یوں زیر و زبر کر دے

محتاج یہ کب سے ہے تابانی و رفعت کا
خورشید و منور کی انجم پہ نظر کر دے

٥

آگاہی و حکمت کا کچھ اب ذکر کرو ۔۔۔ انجیل و شریعت کا کچھ اب ذکر کرو
مریم کا پسر کہتا ہے جس کو دنیا ۔۔۔ اُس پیرِ طریقت کا کچھ اب ذکر کرو

غزل

کوئے جاناں میں ندامت کے سوا کچھ نہ ملا
ایک ناکام محبت کے سوا کچھ نہ ملا

رُوح کو وسعتِ کونین میسّر ہے اگر
جسم کو گوشۂ تربت کے سوا کچھ نہ ملا

کیا کوئی اور قیامت بھی ہے دُنیا والو
ہم کو ہر لمحہ قیامت کے سوا کچھ نہ ملا

دل کو تسکیں نہ ہوئی دیر و حرم سے اے دوست
ہر جگہ رسمِ عبادت کے سوا کچھ نہ ملا

عدل و انصاف کی حالت پہ ہنسی آتی ہے
دورِ جمہور میں ذِلّت کے سوا کچھ نہ ملا

جب سرِ بزم مجھے اُس نے پشیماں دیکھا
داورِ حشر کو رحمت کے سوا کچھ نہ ملا

ہم نے جنّت کے مزے دہر میں لُوٹے اخترؔ
شیخ کو حسرتِ جنّت کے سوا کچھ نہ ملا

وطنی اشعار

بیکار ہو گیا ہے سب فلسفہ ہمارا
بھارت سے ہو گیا ہے پنہاں خدا ہمارا

راون کے راج کا ابھی باقی ہے کچھ اثر
بیٹھے تھے انتظار میں ہم رام راج کے

بھارتی کے خون کے پیاسے ہوئے ہیں بھارتی
دیکھ لی ان آدمی زادوں کی فطرت دیکھ لی

اُف طالبانِ علم کی تخریب کاریاں
اب اور بھی زیادہ ہے فکرِ وطن مجھے

انور اجمیری

مسیحی شعرا میں صفِ اول کے اس شاعر کا اسم گرامی عمانوئیل جوزف تخلص انورؔ ہے۔ ۱۹؍نومبر ۱۹۲۸ء اجمیر شریف میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی۔ دورانِ تعلیم شاعری کا شوق پیدا ہوگیا اور شوقِ مطالعہ فطرتِ ثانی ہوگیا۔ ریلوے میں گارڈ ہیں اور سابرمتی (احمد آباد) میں مقیم ہیں۔

صحیح معنوں میں ادیب شاعر ہیں ہر صنفِ سخن میں خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ ہندی عروض سے واقفیت رکھتے ہیں اور ہندی اسلوب سے متاثر ہیں ہندی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ کلام میں درد اور مایوسی ہے۔ صلیب ان کا محبوب موضوع ہے اور اس موضوع میں بہت بلند پرداز ی کرتے ہیں۔

سادہ اور عام فہم زبان کے قائل ہیں۔ بندشیں دلاویز اور تراکیب چست و دلکش ہیں۔ زبان پیاری اور لطیف ہے جس میں حلاوت و شیرینی پائی جاتی ہے ہندی اور اردو کے امتزاج نے کلام کو بے حد حسین بنا دیا ہے۔ مقالے اور افسانے بھی لکھتے ہیں۔ افسانوں کا مجموعہ "شش تما" دیوناگری میں شائع ہو چکا ہے۔ مزاح نگاری میں ان کا قلم جولانیاں دکھاتا ہے۔

گاؤں والوں کی حالت۔ زندگی۔ جذبات و احساسات کی بڑے خوبصورت ڈھنگ سے عکاسی کی ہے۔

صلیب

کیا کہوں رفعتِ بارگاہِ صلیب
سدرۃ المنتہیٰ گردِ راہِ صلیب

منزلیں خیر مقدم کو خود آگئیں
دو قدم ہی چلے ہم جو راہِ صلیب

کس کی ہمت تھی جو راستہ روکتا
ہٹ گئے خود بخود سنگِ راہِ صلیب

لاکھ یلغار کرتے رہیں اہلِ شر
صف شکن ہی رہے گی سپاہِ صلیب

یہ تو ممکن ہے تن سے نکل جائے جاں
دل سے ممکن نہیں نکلے چاہِ صلیب

پاس انورؔ کے اور کیا ہے دل کے سوا
بہر نذرانہ بارگاہِ صلیب

غزل

لاشۂ شب کمرے میں پڑا ہے
باہر دن بیٹھا روتا ہے

دیکھنا باہر کون کھڑا ہے
کوئی نہیں ہے سناٹا ہے

پکڑی گئی چوری پھولوں کی
خار تہہ داماں نکلا ہے

دل بھی عجب ہے طفلِ ناداں
ہاتھ چھڑا کے بیٹھ گیا ہے

پھول کھلا کر پھر یادوں کے
زخمِ جگر کتنا مہکا ہے

دل کی آگ بجھاتے تب تھا
کہتے رہے سب کیا جلتا ہے

چاروں طرف پتھر ہی پتھر
کیا انساں کا کال پڑا ہے

انورؔ کی ہر بات پرانی
ہاں کہنے کا ڈھنگ نیا ہے

آزاد نظم

بڑھا دو کچھ اور لو دیئے کی
کہ پھر اندھیروں کی چیرہ دستی
چمکتے نیزوں پہ سر اُٹھائے
شعارِ مہر و وفا کے آگے
دہکتی مشعل لئے کھڑی ہے

عجیب آہوں کا شور و غل ہے
لہو میں بارود کی ہے بدبو
سلگتے جسموں کی پھول جھڑیاں
گداز باہوں کی ٹوٹی لڑیاں
سڑک پہ بکھری ہوئی پڑی ہیں
ہے کتنا دلکش فریب منظر
ہتھیلیوں میں دیئے جلائے
اُجالا لے تقسیم کرنے والو
کبھی تو اپنے دلوں میں جھانکو
کبھی تو یہ اعتراف کر لو
کہ شب گزیدہ تمہاری روحوں
میں کتنی پُر ہول تیرگی ہے

قطعات

کرشن کنہیا نے بھی کیا کیا کھیل رچے
ہم تو جب سوچیں ہیں لجا آوے ہے
گوردھن گردھاری اکی رکھیو لاج
گوری پھر ندیا پہ نہانے جاوے ہے

کس کس کو بھاوے پنہارن
گاگر چھلکے آنچل ڈھل کے
دونوں میں لبریز جوانی
ایک کو پکڑے تو اک چھلکے

جمی دار کے ہرکارے آئے تھے
بھوک ہوئی کچھ ایسی ایکے پیٹ دگان
ہمرا تو سب خون پسینہ ایک ہوا
بیٹی کو بھی سمجھ لیا کھیتوں کا دھان

بدر بریلوی

آپ کا نام فتح بہادر چند۔ بدر تخلص ہے۔ ۲۸ر فروری ۱۹۳۲ء ضلع بریلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں بسئی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مشن اسکول لودھی پور ضلع شاہجہاں پور میں حاصل کی۔ اوائل عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اسلئے پندرہ سال کی عمر میں محنت مزدوری کرکے برادرِ خورد کی تعلیم مکمل کرائی ۱۹۴۵ء میں فوجی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے سبکدوش ہوکر اتر پردیش گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کی۔ کچھ عرصے بعد ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک مدرسہ علم الٰہیات بریلی میں دینی تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے فارغ ہوکر ۱۹۶۰ء میں پادری بن گئے۔ ہندی و اردو دونوں زبانوں میں قابلیت پیدا کی ۱۹۸۰ء میں ادیب کامل پاس کیا۔

سولہ سترہ سال کی عمر سے شعر کہنے کا شوق ہے۔ مناظر فطرت کی عکاسی کی طرف طبیعت زیادہ مائل ہے ابتدا میں حکیم ظفر اورنگ آبادی (بلند شہر) کے شاگرد ہوئے۔ اب کبھی کبھی بہارِ سخن جناب موج زیبائی سے استفادہ کرتے ہیں۔

غزل

باغِ عالم میں نہیں ثانی ترا پیدا ہوا
بوٹہ بوٹہ پتا پتا ہے میرا دیکھا ہوا

اب کسی کروٹ کسی پہلو نہیں آتا قرار
آسرا پایا نہ پھر دردِ جگر پیدا ہوا

جوشش دیوانگی کی صاف یہ تصویر ہے — آج تک دامن میرا کانٹا میں ہے الجھا ہوا
واہ رے خصوصیت تجھ سے میری روداد غم — پوچھتے جاتے ہیں وہ پھر کیا ہوا پھر کیا ہوا

بدر دنیائے دنی کی دور ہیں تاریکیاں
وہ تصور میں جو آئے نور کا تڑکا ہوا

غزل

ناخدا ہے نہ اب سفینہ ہے — اب تو نام خدا پہ جینا ہے
اشک غم کی جھڑی کو کیا کہیے — گویا برسات کا مہینہ ہے
ہم کو بحر الم میں چھوڑ دیا — خوب یہ آپ کا قرینہ ہے
تم نہیں پاس ہو کا عالم ہے — ایسا جینا بھی کوئی جینا ہے

غزل

دیر و حرم میں دیکھا ڈھونڈا چمن چمن میں — وہ شوخیاں کہاں جو ہیں تیری انجمن میں
واصل ہوا جہاں میں جنکو شعور باطن — صد حسن دیکھتے ہیں اک گل کے پیرہن میں
بربادیوں کا اپنی شکوہ نہیں کسی سے — یارو زباں ہم بھی رکھتے ہیں گو دہن میں
جب رہبر و وفا کو ہمراز بن کے لوٹیں — تفریق کیسے کیجے رہبر ہیں راہزن میں

اے بدر ان کے در پر ہے فخر باریابی
کر ترک آنا جانا غیروں کی انجمن میں

بیتاب سنسارپوری

اسمِ گرامی بی ڈی فرینکلین۔ تخلص بیتابؔ۔ وطن سنسار پور ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ علامہ مخمور جالندھری کے خیال سے سن ولادت ۱۹۰۸ء ہوتا ہے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ جناب مخمور جالندھری سے تلمذ ہے۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں ایک مجموعہ کلام "منزلِ نجات" شائع ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے

کلام میں پختگی ہے زبان صاف، شستہ اور پاکیزہ ہے تخیل کی بلند پروازیاں روح پرور ہیں اشعار میں کیف و تغزل بدرجہ اتم ہے۔ سادگی و سلاست کلام کا جوہر ہے۔ الفاظ کا انتخاب خوب ہے۔ بائبل کے اکثر حصوں کو حسن و خوبی کے ساتھ نظم کے سلیقے میں ڈھالا ہے۔ بعض حقائق کو بغیر تصرف شعر کا جامہ پہنایا ہے بقول حضرت لچھمن داس نازؔ "یکے پھلکے بدن کا مالک۔ ہنس مکھ چہرا افکار دنیا سے آزاد مسیحی گیتوں کا شیدائی۔ نعتیہ غزلوں کا فدائی۔ ہارمونیم باجہ کا عاشق۔

افسوس ۳ ستمبر ۱۹۷۶ء کو آپ راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔

پادری جلال الدین کے الفاظ۔

"میں بیتاب کا مداح رہا ہوں۔ اس کے اشعار میں بڑی پاکیزگی و شگفتگی ہے۔ جس سے میں بہت متاثر ہوں اس کے اندازِ بیان کی سادگی میں بڑی جاذبیت ہے وہ مسیحی خیالات کی ترجمانی کمال حسن

کے ساتھ کرتا ہے اور یہی اس کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ اُس کی شاعری میں ایک ایسا ضبط ملتا ہے جو تاثیر سے خالی نہیں ہوتا"

علامہ محمور جالندھری فرماتے ہیں:-

"اُس نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ غزلیں۔ نظمیں۔ رُباعیاں اور قطعات بھی کچھ کہا ہے۔ اس میں شعر کہنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ اس نے نعت میں تغزل، نغمگی اور شعریت پیدا کی ہے۔ بیتاب سنسارپوری کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت حقیقت پسندی کی ہے۔ اس کی شاعری زندگی سے بہت قریب ہے اس میں زندگی کے تلخ و شیریں دونوں حقائق ملتے ہیں۔"

توصیفِ مسیحا

ہمیشہ تجھ کو مرے دل سے احتراز رہا — جہاں سے ترے بیتاب بے نیاز رہا
مسیح سا نہ کہیں کوئی پاکباز رہا — جہاں میں وہ کے گناہوں سے بے نیاز رہا
بدل دیئے مرے غم راحتوں میں عیسیٰ نے — ہر ایک حال میں میرا وہ کارساز رہا
خوشی میں رنج میں راحت میں اور مصیبت میں — ہمیشہ مجھ کو مسیحا پہ فخر و ناز رہا
ہزاروں ظلم و ستم سہہ کے اس زمانے کے — پیمبرانِ زمانہ میں سرفراز رہا

سُنا ہے آپ ہیں رحمت کا بحرِ بے پایاں
مگر کرم سے یہ بیتاب بے نیاز رہا

بڑا دِن

و پیدا مسیحا ہمارا نہ ہوتا
محبت کا راز آشکارا نہ ہوتا

گر فیض عیسیٰ تمہارا نہ ہوتا
زمانے میں کوئی ہمارا نہ ہوتا

لک پہ جو تو بزم آرا نہ ہوتا
درخشاں مسیحی ستارا نہ ہوتا

مسیحا جو ہادی ہمارا نہ ہوتا
بہشت بریں کا نظارا نہ ہوتا

آتے اگر دہر میں ابنِ مریم
تو بیتاب کوئی ہمارا نہ ہوتا

صَلیب

تمہارے سامنے منزل جوانانِ صلیب
لوحِ دل پر نقش کر لو آج فرمانِ صلیب

ز ہمدردی معافی غم گساری انکسار
کسقدر نکلے ہیں جاں افروز عنوانِ صلیب

بہالے جائے گا ہر ذرہ کفر و شرک کا
جوش میں آیا ہے کیسا آج طوفانِ صلیب

اگر آتے نہ اس دُنیا میں اے ابن خدا
کون کرتا منکشف انساں پہ عرفانِ صلیب

ت بھی لاتی ہے زندگانی کا پیام
موت سے ڈرتے نہیں ہیں سرفروشانِ صلیب

زیرِ پا ہوتے ستارے اور فلک ہوتا مقام
ہم جو اے بیتاب ہوتے خاکِ پارانِ صلیب

ایسٹر

جی اُٹھا میرا مسیحا جی اُٹھا / لو دو عالم کا شہنشا جی اُٹھا
تیسرے دن فتح پا کر موت پر / دردِ عصیاں کا مداوا جی اٹھا
سر خوشی کا دور ہے چاروں طرف / ساری دُنیا کا دُلارا جی اٹھا
پھر سے مُردہ جسم میں جاں آگئی / قلبِ مضطر کا سہارا جی اٹھا
مالکِ کُل کائینات ابنِ خدا / شان و شوکت سے دوبارا جی اٹھا
شاد ہو مریم یہ آنسو پونچھ دے / لے تری آنکھوں کا تارا جی اٹھا
بیکسوں کو دو خبر اب مُسکرائیں / بے سہاروں کا سہارا جی اٹھا

شاد ہو بیتاب تو بھی شاد ہو
جس نے عالم کو سنوارا جی اُٹھا

غزل

خلوت سرائے قلب میں تیرا ظہور ہے / جبھی یہ زندگی مری لبریز نور ہے
تنہا نہ چھوڑ یورشِ طوفاں میں ناخدا / کشتی مری حیات کی ساحل سے دُور ہے
دل خود ہجومِ رنج سے طوفاں میں گھر گیا / میرا قصور ہے نہ تمہارا قصور ہے
ہر وقت دیکھتا ہوں تجھے دل میں جلوہ بار / مجھ سے نہیں تو دور گو آنکھوں سے دُور ہے

کہتے ہیں بادہ نوش مجھے اس لئے تمام
بیتاب کی نگاہ میں تیرا سرور ہے

پارس فیروزپوری

نام پریم مسیح ولد گلزار مسیح ۔ تخلص پارس ۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۴۲ء فیروزپور میں پیدا ہوئے ۔ اور وہیں سے میٹرک پاس کیا ۔

شاعری کا شوق زمانۂ تعلیم سے شروع ہوا ۔ بعد تحصیل علم جناب بیتاب سنسارپوری سے اصلاح لینے لگے ۔ ان کی وفات کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لیتے آجکل لدھیانہ میں مقیم ہیں ۔ کلام میں سادگی ہے ۔ زبان کی غلطیاں کم ہیں ۔

بڑا دن

مریضِ گناہ کی دوا بن کے آیا
خدائی کا حاجت روا بن کے آیا

مریضوں کو آمد ہو اس کی مبارک
ہر اک مرض کی وہ دوا بن کے آیا

نہ منزل سے بھٹکے گا کوئی مسافر
مسیح جہاں رہنما بن کے آیا

غریبوں، یتیموں کا وارث ہے عیسیٰ
وہ مشکل میں مشکل کشا بن کے آیا

بھری جھولیاں آرزوں سے اسکی
جو در پر تمہارے گدا بن کے آیا

لپٹ جاؤ دامانِ عیسیٰ سے پارس
تمہارے لئے وہ خدا بن کے آیا ۔

وطن

جو سینچے خون سے اُن باغبانوں کی ضرورت ہے
وطن پر مٹنے والے نوجوانوں کی ضرورت ہے

اُڑا دیں دھجیاں ایسی چھٹی کا دودھ یاد آئے
عدو کے واسطے کچھ تازیانوں کی ضرورت ہے

گریں جو بجلیاں تو جذب ہو جائیں نشیمن میں
جو جلنے پائیں نہ اُن آشیانوں کی ضرورت ہے

فرائض سے رہیں جو دور ہمدم اُن کا کیا کہنا
حفاظت کرنے والے پاسبانوں کی ضرورت ہے

ہمیں اب لے کے جانا ہے فلک تک اپنے پرچم کو
اُٹھانے کے لئے ہمدم دیوانوں کی ضرورت ہے

یہ کیا پارس لئے بیٹھا ہے تو قصے پرانے سب
جو پیدا جوش کر دیں ان ترانوں کی ضرورت ہے

غزل

مسرت چاہی تھی تجھ سے مگر پائی غمی میں نے
ترے انصاف میں ہر بات کی پائی کمی میں نے

ذرا ٹھہرو چلے جانا میری ایک بات سُن جاؤ
ابھی چھیڑی کہاں ہے داستانِ زندگی میں نے
نہیں تقدیر سے شکوہ نہیں گردش سے کچھ کہنا
مجھے شیطاں نے روکا جب بھی کی ہے بندگی میں نے

جہاں میں ہیں سخنور تو بہت سے اے دلِ پارس
محو ہو کر محبت میں ہے سیکھی شاعری میں نے

غزل

درد بن کر رہ گئی یہ زندگی تیرے بغیر
ہو نہیں سکتی میسر اب خوشی تیرے بغیر
کس سے جا کر ماجرائے دردِ عصیاں کا کہیں
کوئی بھی سُنتا نہیں دل کی لگی تیرے بغیر
تو سراپا نور ہے مجھ کو سراپا نور کر
رہ گئی بے نور ہو کر زندگی تیرے بغیر
تیرا ثانی اے مسیحا دوسرا کوئی نہیں
کون پا سکتا ہے مر کر زندگی تیرے بغیر
جامِ الفت سے مسیحا تو ہمیں سرشار کر
بجھ نہیں سکتی ہماری تشنگی تیرے بغیر
ہے مسرت خیز دُنیا اور اسکی محفلیں
تیر بن کر چبھ رہی ہے ہر خوشی تیرے بغیر

زخمِ دل کی داستاں پارس کہے کس سے کہے
کوئی بھی سُنتا نہیں ہے ناصری تیرے بغیر

تسکین اجمیری

اسم گرامی ہیرلڈ کمفرٹ ڈینیل تخلص تسکین۔ آبا و اجداد کا وطن بھرت پور راجستھان ہے وہیں ۲۹ جنوری ۱۹۱۶ء ولادت ہوئی والد محترم اجمیر شریف میں آکر سکونت پذیر ہو گئے اسلئے یہیں تعلیم پائی۔ ابتداء میں مولوی محمد ایوب خاں صاحب احسن اجمیری سے پانچ سال تک اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اسکے بعد ۱۹۴۴ء میں آگرہ یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم۔ اے پاس کیا۔ ملازمت کے سلسلہ میں آپ پنجاب چلے گئے اور وہاں انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ تقسیم ملک کے بعد آپ وطن تشریف لے آئے اور ۱۹۴۸ء میں الہ آباد سے ایل ٹی کیا۔ اُسوقت سے ہسبینڈ میموریل ہائر سیکنڈری اسکول میں انگریزی کے اُستاد مُقرر ہوئے۔ اور ۱۹۷۴ء میں پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

آپ خلیق خوش طبع اور زندہ دل قسم کے انسان ہیں غزلیں زیادہ کہتے ہیں اور ہر رنگ میں کہتے ہیں۔ مزاحیہ رنگ میں بھی کہنے کی سعی فرمائی ہے۔ غزلوں میں پُرانی روایات سے کام لیتے ہیں۔ جدید روش کو قبول نہیں کرتے۔ زبان صاف و بامحاورہ ہے۔ بندشیں چست اور ترکیبیں دلکش ہیں۔ اردو میں انگریزی طرز کے سانیٹ (SONNET) بھی لکھے اجمیر شریف کے مولوی محمد ایوب خاں صاحب احسن سے اصلاح لیتے رہے۔ فارسی میں بہت اچھی استعداد رکھتے ہیں۔ •

بڑا دن

نورِ عالم جو ہوا جلوہ نما آج کے دن
دہر سے پردۂ ظلمات اُٹھا آج کے دن

گلشنِ دہر نے یہ پھول کھلایا کیسا
ہیں جو مرغانِ چمن نغمہ سرا آج کے دن

عرش سے فرش پہ اُترا ہے خدا کا بیٹا
اسلئے رقص میں ہیں ارض و سما آج کے دن

بحرِ عصیاں میں پڑی تھی جو ہماری کشتی
ناخدا بن گیا خود ابنِ خدا آج کے دن

آمدِ ابنِ خدا میں ہیں ملائک گاتے
تو بھی تسکینؔ کوئی راگ سُنا آج کے دن

غزل

تو نگہباں ہے الٰہی گلشنِ ایمان کا
امتحاں پر امتحاں ہے آج کل انسان کا

ایک مشتِ خاک پر یہ حادثاتِ زندگی
سامنا تنکا کرے گا کیا بھلا طوفان کا

نفس کا محکوم ہو کر ہو گیا کتنا ذلیل
تھا ملائک سے بھی اونچا مرتبہ انسان کا

نبیوں کی قدر اپنے ملک میں ہوتی نہیں
مصر میں چمکا ستارہ یوسفِ کنعان کا

بندگی ہر حال میں لازم ہے اے بندے تجھے
اک طریقہ ہے یہی اللہ کے عرفان کا

مسیحی ہو کے بھی تثلیث[۱] کا قائل نہیں
ابنِ عیسیٰ وہ نہیں فرزند ہے شیطان کا

جوہرِ ذاتی سے گر انسان تسکیںؔ کام لے
وار چل سکتا نہیں اس پر کبھی شیطان کا

۱ خدا۔ مسیح اور رُوح پاک ملکر ایک ہیں۔

غزل

ہیں رشکِ لالہ داغِ دلِ داغدار کے
کیسے حسیں ہیں نقش تری یادگار کے

شاید حریمِ ناز میں پہنچا خیالِ شوق
گم ہوش ہو رہے ہیں شکیب و قرار کے

ہر ہر قدم پہ شوقِ تمنا کا ہے ہجوم
ملنے لگے نشان تری راہ گزار کے

موجود تھے وہ میرے جہانِ خیال میں
قربان جاؤں اپنی شبِ انتظار کے

تم نے کچھ اس نگاہ سے دیکھا خدا گواہ
نقشے بدل رہے ہیں دلِ بے قرار کے

تسکیںؔ کمالِ شوق کی شانِ دگر ہے آج
قصے نہ تازہ ہوں کہیں منصور و دار کے

ایسٹر

زندہ ہو کر قبر سے عیسیٰ نکل آیا ہے آج
اک نرالا راستہ جینے کا دکھلایا ہے آج

کہہ رہا ہے ہر نفس کے کان میں پائندہ باد
ساتھ اپنے جاودانی زندگی لایا ہے آج

پھنس گیا تھا موت کے چنگل میں بس انساں جو
اسکی آزادی کا مژدہ ایسٹر لایا ہے آج

موت بھی حیران ہو کر جا چھپی ظلمات میں
دیکھ کر زندہ مسیح سر اس کا چکرایا ہے آج

ہر مسیحی کے لئے ہے موت پیغامِ وصال
وصلِ حق کا اک نرالا راستہ پایا ہے آج

ایسٹر کی نظم سن کر کیوں نہ ہوں سب شادماں
کیا انوکھی سی غزل تسکیںؔ لکھ لایا ہے آج

ثاقبؔ۔ فیروزپوری

اسم گرامی جون ہیرلڈ بھجن اور تخلص ثاقبؔ۔ ۸ رجون ۱۹۲۹ء بمقام بوہر ضلع فیروزپور میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول تک تعلیم اجمیر میں حاصل کی۔ بعدازاں پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل کا امتحان اور دہلی یونیورسٹی سے ایم۔اے اُردو کرچکے ہیں۔ شاعری کا شوق لڑکپن سے ہے۔ زبان صاف اور سلجھی ہوئی ہے۔ کم لکھتے ہیں۔ کلام پرچوں میں شاذونادر نظر آتا ہے۔ اگر مشق کریں تو اچھا کلام پیش کرسکتے ہیں۔ انڈسٹریل فائننس کارپوریشن نئی دہلی میں اچھے عہدہ پر فائز ہیں اور مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہیں۔

نمونۂ کلام

بڑا دن

اری سرزمیں پہ مالکِ کون ومکاں آیا
بشر کی شکل میں یعنی شفیعِ عاصیاں آیا

راسر ہوگئی اب دُنیا منور نورِ یزداں سے
مٹانے دہر سے وہ کفر کا نام ونشاں آیا

یاں ہوگیا روشن پریشاں ہوگئے چرواہے[1]
خبر دے کر خوشی کی جب فرشتہ ناگہاں آیا

ہاں دل تھا ابتک جسکے جلووں کا تمنائی
مجسم ہوکے وہ ہم خاکیوں کے درمیاں آیا

ی شانِ کریمی ہے اسی کا نام رحمت ہے
گنہگاروں کو دینے وہ حیاتِ جاوداں آیا

سب ہی خورد وکلاں پیر وجواں ہیں وجد میں ثاقبؔ
یہ محفل میں ہماری کون ایسا خوش بیاں آیا

ا حضرت مسیح کی پیدائش پر گڈریے آپ کو سجدہ کرنے گئے تھے۔

صلیب

ہم گنہگاروں کو بخشا تو نے عرفانِ صلیب
پھر خوشی سے کیوں نہ ہم ہو جائیں قربانِ صلیب

صرف اس انساں کو ملتی ہے حیاتِ دائمی
جو بجا لاتا ہے صدقِ دل سے فرمانِ صلیب

ہو گیا قربان تو ہم عاصیوں کے واسطے
خون سے سینچا ہے اپنے یہ گلستانِ صلیب

اس نے بخشی ہے گنہ کے درد و کلفت سے نجات
کس قدر ہے ہم گنہ گاروں پہ احسانِ صلیب

اب ترے ایثار و قربانی کے سُن کر تذکرے
ہوتا جاتا ہے زمانہ بھی ثنا خوانِ صلیب

تیرے در پر ثاقبِ خستہ جگر آیا ہے آج
اس پہ ہو جائے نگاہِ رحم سُلطانِ صلیب

ایسٹر

تیری الفت میں یہ تاثیر عجب پائی ہے
مَیں تمنائی ہوں اور تو بھی تمنائی ہے

مر کے پھر تیسرے دن ابنِ خدا جی اُٹھا
موت مغلوب ہوئی خوب مسیحائی ہے

حسرتِ دیر و حرم مٹ گئی میرے دل سے
ابنِ مریم سے کچھ اس طرح شناسائی ہے

اپنی قدرت کا کرشمہ یہ دکھایا تو نے
موت کو موت اگر آئی تو آج آئی ہے

زندگی ثاقبِ خستہ کو یہ بخشی تو نے
رات دن تیری محبت میں وہ سودائی ہے

ثمرؔ دہلوی

مسیحی شعراء میں استادوں کا درجہ رکھنے والے اس شاعر کا نام وکٹر آئی نیوٹن تخلص ثمرؔ ہے۔ ۲۱؍جون ۱۸۹۹ء الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار پادری ایم سی نیوٹن بھی شاعر تھے اور گلؔ تخلص فرماتے تھے اسی مناسبت سے آپ نے ثمرؔ تخلص رکھا۔ والدہ مرحومہ اردو۔ فارسی و انگریزی داں تھیں ابتدائی تعلیم ان کی آغوشِ محبت میں حاصل کی۔ پھر مرادآباد میں تعلیم حاصل کی بعد میں علم الٰہیات حاصل کیا۔ اور ہندو مسلم فلسفہ کا غائر مطالعہ کیا۔ عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں بسر ہوا۔ اسی مناسبت سے دہلوی کہلائے۔ انگریزی فوج میں اردو پڑھانے کیلئے میرمنشی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ آخر عمر میں دہرہ دون میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ لیکن ضعیفی میں باوجود صاحبِ جائیداد ہونے کے نہایت بے بسی اور کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ آخر ۱۳؍اکتوبر ۱۹۷۸ء صبح امرتسر میں انتقال کیا۔

نہایت کہنہ مشق شاعر تھے استادوں میں شمار ہوتا تھا۔ اردو کے بلند پایہ شعراء اور ادیبوں کی ہم نشینی کا فخر حاصل تھا۔ نادر شاہجہان پوری سے تلمذ تھا فنِ شاعری سے کماحقہ واقف تھے۔ ہر رنگ میں طبع آزمائی کی ہے۔ زبان نہایت صاف و شستہ اور بامحاورہ ہے۔ تخیل میں بلند پروازی ہے۔ بندش چست اور ترکیبیں دلآویز ہیں۔ •

چرنی

کیا کہوں اے دل کہ کیا چرنی میں ہے — مظہرِ نورِ خدا چرنی میں ہے
جسکے قدموں پر ہیں لاکھوں دِل نثار — وہ جہاں کا دلربا چرنی میں ہے
طور پر ڈالے تھے جو منہ پر نقاب — وہ تجلی برملا چرنی میں ہے
کیوں تلاشِ خضر میں کھو جائیں ہم — جب ہمارا راہنما چرنی میں ہے
عقدہ لاحل کو جو کرتا ہے حل — وہ مرا مشکل کشا چرنی میں ہے

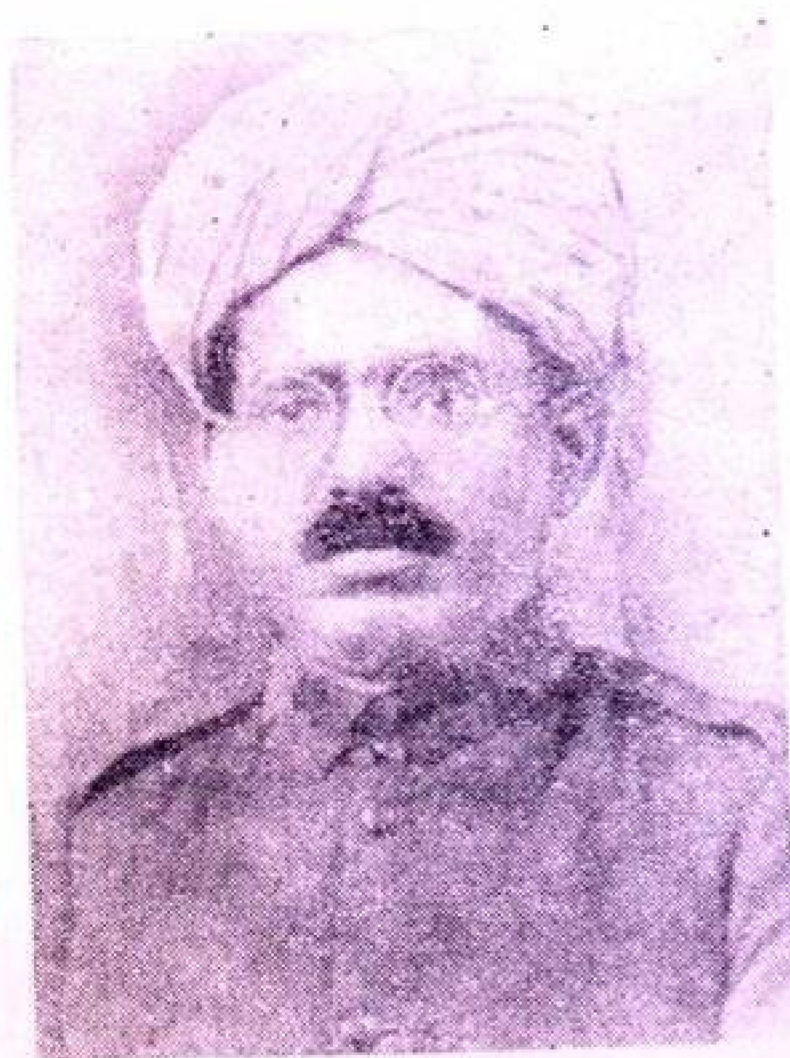
طور پر تھی اے تمثر جو روشنی
آج وہ نامِ خدا چرنی میں ہے

کلوری

مانا مسیحِ پاک سردار مر گئے — قرضہ مرے گناہوں کا یکمشت بھر گئے
آنکھوں میں اشکِ غم کے یہ جوہر جو بھر گئے — میری شبِ الم کے ستارے نکھر گئے
کیلوں سے اسکے خون کے قطرے جو گرم تھے — جب اُس نے آہ کی تو فلک تک شرر گئے
روزِ ازل سے تھی یہی تدبیرِ مخلصی — تدبیر مخلصی کی وہ تکمیل کر گئے
رو رو کے کہہ رہی تھی یہ مریم تہہ صلیب — آنکھوں کے تارے دل کے دُلارے کدھر گئے
قسمت جلی ہوں میں میرا ہمدرد کون ہے — یہ تو بتاؤ کس پہ مجھے چھوڑ کر گئے
لاچار سرنگوں تھے خیالِ مسیح میں — دُشوار منزلوں سے مسافر گذر گئے
تم نے لہو بہا کے کیا مجھ کو سرفراز — جس کا نہ شکر ادا ہو وہ احسان کر گئے



J.A. RAHI Page-165.



RASA Page-168



RAZA Page-172



BADR Page-121



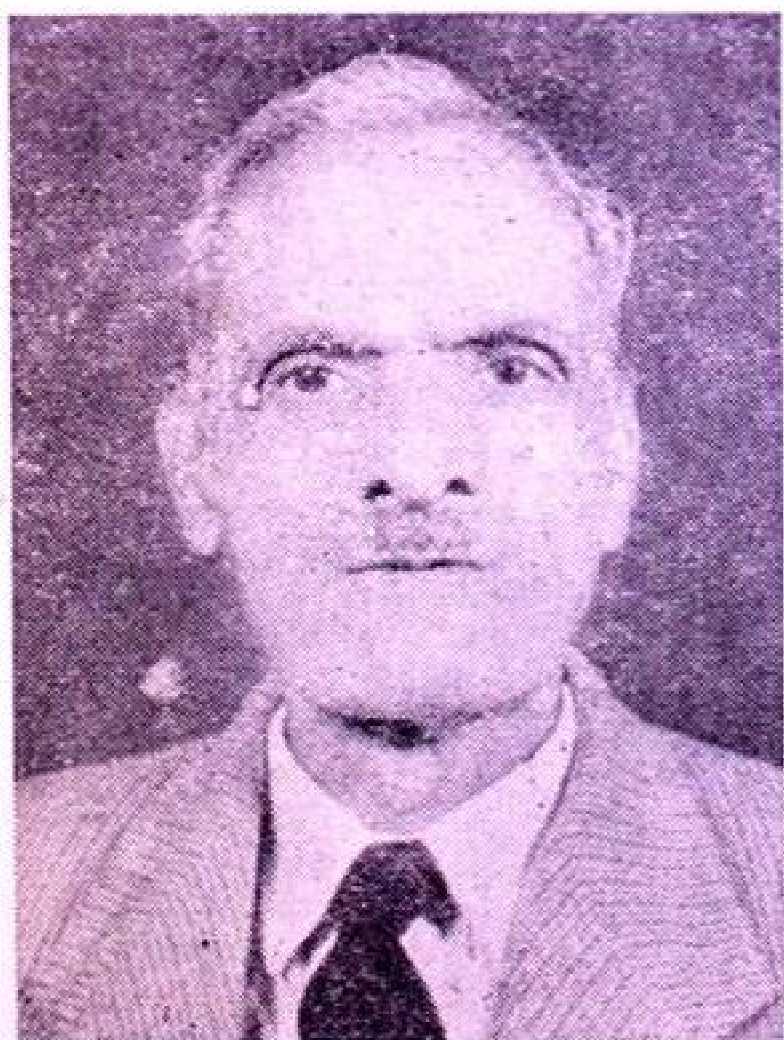
SAQIB Page-133.



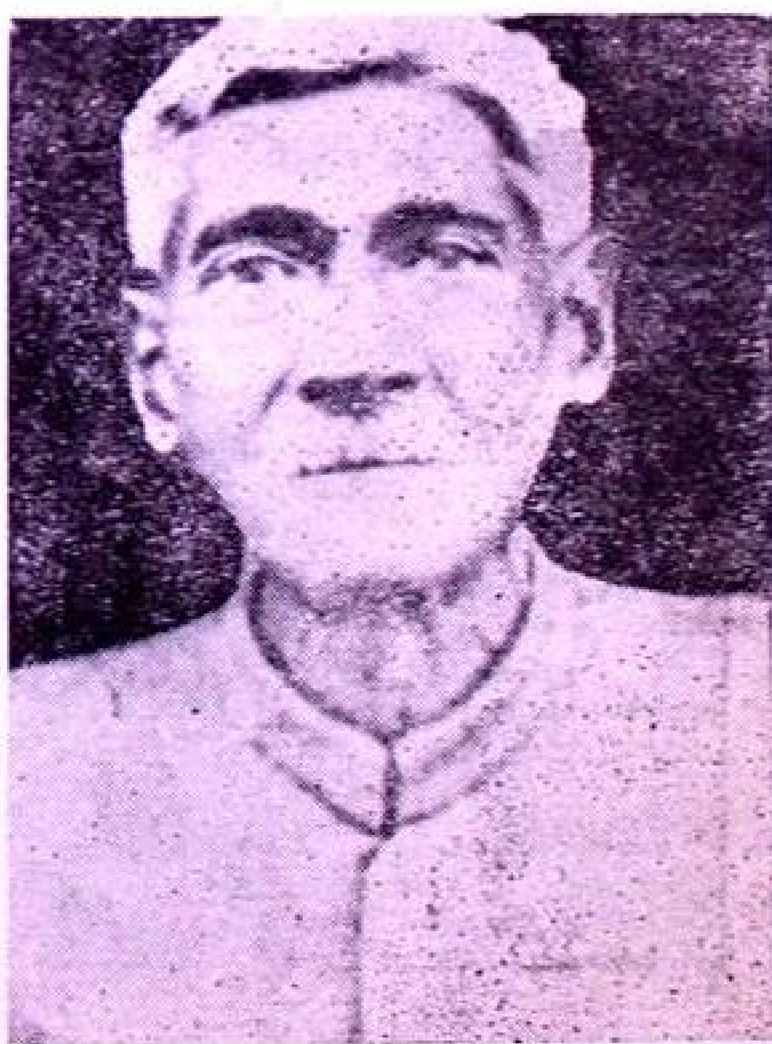
SAMAR Page-135.



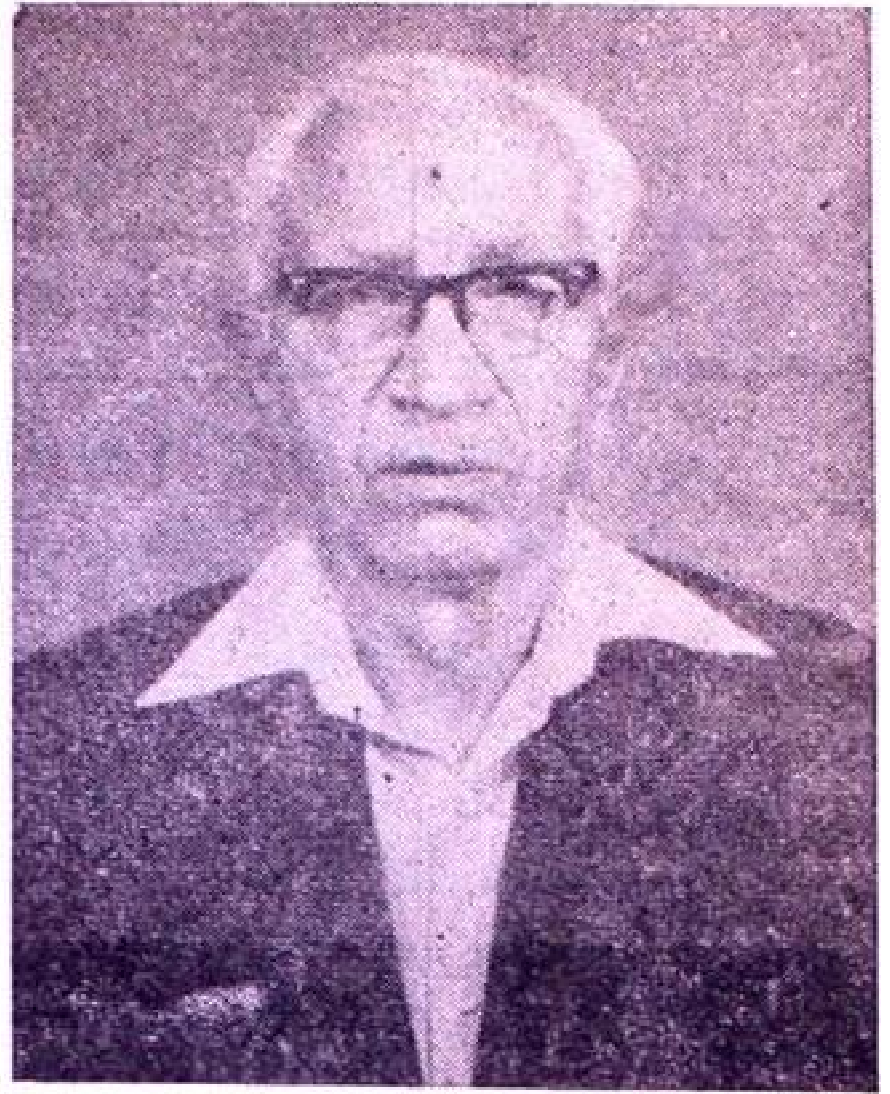
DILGIR Page-151.



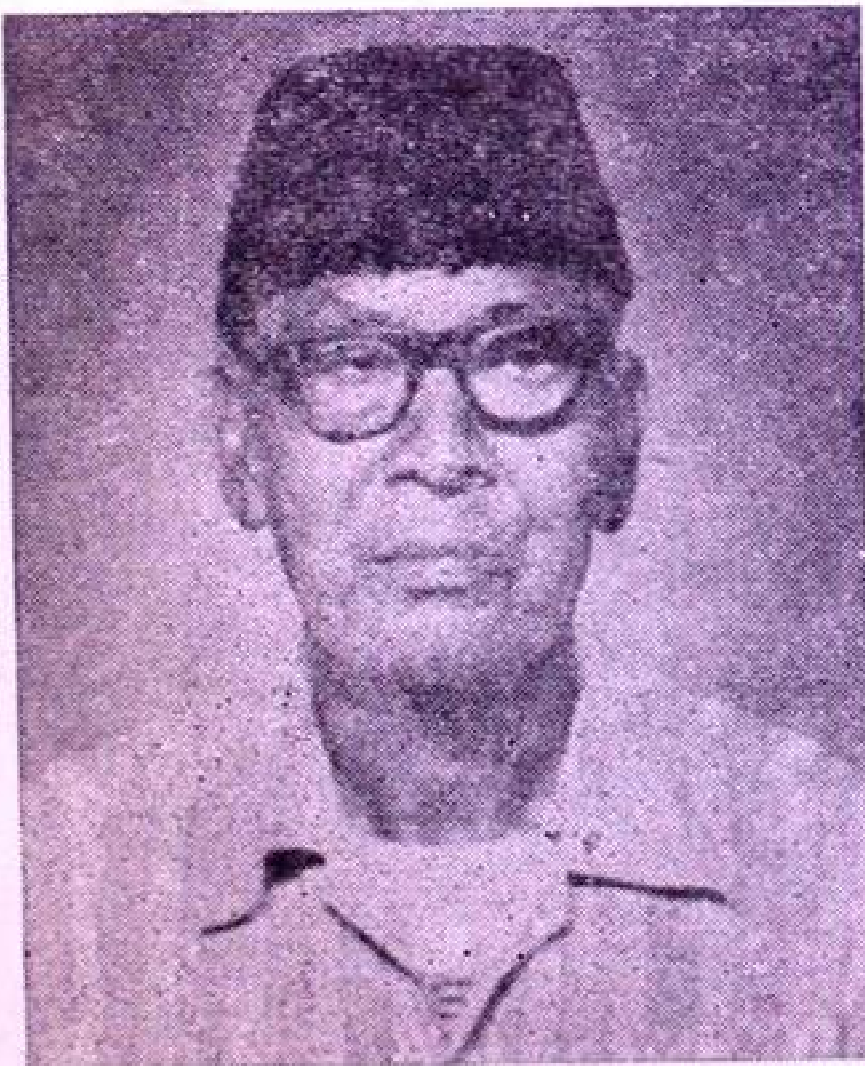
GEORGE Page-139



KHASTA Page-149.



ROZ Page-175



SHAMSHAD Page-202.

اس زندگی کی ہم سے نہ تعبیر پوچھیئے
اتنا سا دور تھا اِدھر آئے ادھر گئے

ہم تھے مسافرانِ عدم راہِ عشق میں
دو چار ساعتوں کو یہاں بھی ٹھہر گئے

یہ عالم فنا بھی ہنسی کا مقام ہے
مصروفِ گریہ آئے تھے باچشم تر گئے

اپنی جبیں پہ خونِ مقدّس کا تھا نشاں
محشر میں ہم گئے جو ثمرؔ تو نڈر گئے

غزل

لگتا ہے ان کا شعلۂ عارض حجاب میں
ہم تو نہیں رہیں گے مقیدِ نقاب میں

پھر ان کی یاد دیتی ہے سینہ میں چٹکیاں
پھر درد سا اٹھا دلِ خانہ خراب میں

سب ختم کر دی اس نے محبت کی داستاں
قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں

بس خاک اور ذوقِ تماشہ لئے ہوئے
وہ برقِ حسنِ نازِ تجلی حجاب میں

لیا اور کچھ نہیں تھا قسیم ازل کے پاس
کیوں درد بھر دیا دلِ الفت مآب میں

ساقی سے کہدو آمدِ فصلِ بہار ہے
خستہ نہ اب کرے وہ شرابِ کباب میں

میرے سوالِ بوسہ پہ کیا سوچنے لگے
تاخیر کیجئے گا نہ کارِ ثواب میں

وہ اُنکا خوابِ ناز میں شورش فزا سکوں
یہ میری خامشی کی روش اضطراب میں

اے غافلو ضرور ہے انفاس کا لحاظ
پیری کا ذکر چاہیئے عہدِ شباب میں

ہے کشمکش ہی زیست کی وجہ قیامِ زیست
پنہاں سکونِ قلب ہے پھر اضطراب میں

شکوہ بتوں سے جو کہ ہے اے ثمرؔ فضول
میں مُبتلا ہوں اپنے ہی دل کے عذاب میں

غزل

دریچہ میں لگا رکھا ہے اک سنگِ گراں اے تو
بھلا کیوں سر نہ پھوڑیں جاکے فریاد و فغاں اے تو

زباں پر پڑ گئے کانٹے ہوئے چھالے عیاں اے تو
کھلاتی ہے عجب گل شدتِ سوزِ نہاں اے تو

جگہ سے اپنی ہلتا ہی نہیں یوں جم کے بیٹھا ہے
تمہارا پاسباں بھی ہو گیا سنگِ گراں اے تو

فراقِ یار کے صدمے نہیں اٹھتے نہیں اٹھتے
خداوندا نکل جائے مرے قالب سے جاں اے تو

بڑی مدت سے بیٹھا ہے تمہارے آستانے پر
خدا کے واسطے سن لو ثمرؔ کی داستاں اے تو

غزل

خواہشِ حور نہیں شوقِ جناں چھوڑ دیا
جی ترے ہجر میں اے جانِ جہاں چھوڑ دیا

کوئی ہمدرد ہے اپنا نہ کوئی ہمدم ہے
مجھ کو اے جوشِ جنوں لا کے کہاں چھوڑ دیا

روز پیاسے ہی ترے در سے چلے آتے ہیں
ہم پہ کیوں لطف و کرم پیرِ مغاں چھوڑ دیا

درد کیوں دل میں مرے ہوتا ہے بیٹھا بیٹھا
کیا کما ندار کوئی تیرِ نہاں چھوڑ دیا

اے ثمرؔ آپ کا ارشاد ہے سر آنکھوں پر
جوشِ وحشت سے مگر میں نے مکاں چھوڑ دیا

جارج آبوی

نام بی ایس جارج۔ تخلص جارج ۲۹ر جولائی ۱۹۰۲ء راولپنڈی (پاکستان) میں پیدا ہوئے والدین وہاں سے منتقل ہوکر دہلی آگئے اسلئے آپ کی تعلیم دہلی میں ہوئی۔ بی۔اے پاس کیا اور منشی فاضل کی سند حاصل کی۔
لڑکپن سے شوقِ سخن پیدا ہوگیا تھا۔ حضرت مختار احمد عباسی اجمیری سے تلمذ رہے۔ راجستھان کے مشہور شاعر حضرت عرشی اجمیری سے قریبی تعلقات ہیں ملازمت سے سبکدوش ہوکر مستقل طور پر آبو پہاڑ پر سکونت اختیار کی۔
کہنہ مشق شاعر ہیں۔ کلام صاف سلجھا ہوا اور دلکش ہے زبان صحیح استعمال کرتے ہیں غزلوں میں وجد آفرین تغزل پایا جاتا ہے۔ مختصر مجموعۂ کلام "تیری یاد"۔ اردو۔ اور ہندی میں چھپ چکا ہے۔
۲۹ر مئی ۱۹۸۲ء شام پونے سات بجے آبو روڈ میں رحلت فرما گئے۔

نمونۂ کلام

اتنا شرابِ عشق سے مخمور ہوگیا
دیوانہ میں مسیح کا مشہور ہوگیا

پوشیدہ جب ترا رُخِ پُر نور ہوگیا
مری نظر میں دن شب دیجور ہوگیا

دیکھا ہے ہم نے بلا جب کوئی غم نصیب
آیا درِ مسیح پہ تو مسرور ہوگیا

اس کو کہیں جہاں میں ٹھکانہ نہیں ملا
عیسیٰ کے آستانے سے جو دور ہوگیا

جس کو جہاں مسیح کا نقشِ قدم ملا
وہ سر وہیں جھکانے پہ مجبور ہوگیا

کیا جانے کیوں وہ جارج دکھا کر بس اک جھلک
مری نگاہِ شوق سے مستور ہوگیا

بڑا دن

دردِ فجور و فسق کا درماں لئے ہوئے — تسکینِ روح و قلب کا ساماں لئے ہوئے
شمعِ یقین و مشعلِ ایماں لئے ہوئے — آئے مسیح رحمتِ یزداں لئے ہوئے
محتاجِ نان صاحبِ املاک ہو گیا — آئے مسیح گنجِ فراواں لئے ہوئے
مُردے جلا دیئے دمِ معجز طراز سے — آئے مسیح چشمۂ حیواں لئے ہوئے
فطرت کو پھر وہ جوہرِ فطرت عطا ہوا — آئے مسیحا داروئے عصیاں لئے ہوئے
معمورِ نور ہو گیا ہر گوشۂ چمن — آئے مسیح شمعِ فروزاں لئے ہوئے

ایسٹر

اے چشمِ فلک رشکِ قمر ہو گیا زندہ — جو عرش کی ضو ہے وہ گہر ہو گیا زندہ
یہ شور ہے مریم کا پسر ہو گیا زندہ — نخلِ چمنِ دیں کا ثمر ہو گیا زندہ
مرنا ہی جو برحق ہے تو مر کے بھی دکھایا
اللہ نے پھر تیسرے دن زندہ اُٹھایا

رکھتا تھا جو رحمت کا سدا قوم پہ سایا — مصلوب ہوا اُف نہ کی اور لب نہ ہلایا
بے چین ہوا قبر میں فرقت نے ستایا — انساں کا پسِ مرگ اسے دھیان جو آیا
تو قبر سے وہ قوم کا رہبر نکل آیا
وہ ہادیِ دیں شافعِ محشر نکل آیا

حقیر میرٹھی

نام جیکب پیٹر۔ تخلص حقیر ۱۴ فروری ۱۹۳۱ء قصور (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ عمر کا بیشتر حصہ میرٹھ میں گذارا۔ بچپن سے شوقِ شاعری تھا حضرت رسا لکھنوی کے شاگرد رشید تھے۔ ماہنامہ مادرِ فضائل کے نائب مدیر رہے۔ ادارہ اصلاحی بورڈ مصنفینِ ہند رام پور نے شاعرِ قوم کے خطاب سے نوازا۔ کلام مسیحی پرچوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اور پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ کیتھولک چرچ کے کاموں سے منسلک رہے۔ پہلے مسلمان تھے بعد میں مسیحی ہو گئے اسلئے کلام میں اسلامی عقائد کی جھلک نظر آتی ہے۔

کلام حقانی اور نعتیہ ہے۔ جو آپکے پختہ ایمان و عقیدے کا آئینہ بردار ہے مریم مقدسہ سے آپ کو بے انتہا عقیدت ہے۔ توصیفِ مسیحا میں بہت کچھ لکھا ہے۔ شاعری رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ شعر سہل اور عام فہم ہوتے ہیں۔ کلام میں روانی اور سادگی ہے۔ سخن شناس اور سخن سنج تھے۔

اب وفات پا چکے ہیں۔

بڑا دن

مجسم ہو کے دُنیا میں خداوند خدا آیا
شہنشاہِ دو عالم مالکِ ارض و سما آیا

خدا کی ذات سے وابستہ جو کلمہ ازل سے تھا
وہ بہرِ خلق بن کر آیتِ مہر و وفا آیا

دیا جبریل نے پیغام جس کا آکے مریم کو
صحائف نے خبر دی جس کی وہ نورِ خدا آیا

خزاں دیدہ چمن کو کر دیا پھولوں سے بہرہ ور
بہارِ جاوداں کا وہ پیامِ جانفزا آیا
خس و خاشاک چمن کے منور ہو گئے ایسے
تجلّی کی جبیں پر بھی پسینہ بے خطا آیا
نہ دولت ہے نہ حشمت ہے کہ تجھ کو تحفتاً دیدوں
حقیرِ ناتواں ہوں لے کے دل در پر چلا آیا

ایسٹر

ایک خبر لایا ہوں میں شافی مرا زندہ ہوا
موت کی پہنائیوں سے دلربا زندہ ہوا
بات یہ اہلِ جہاں سے چھپ نہیں سکتی کبھی
جو کرے مُردوں کو زندہ وہ مرا زندہ ہوا
سر جھکائے موت شرمندہ ہے اسکے سامنے
قبر سے میرا مسیحا برملا زندہ ہوا
وادیٔ رنج و محن کی انتہا میں ڈوب کر
کشتیٔ بحرِ جہاں کا ناخدا زندہ ہوا
جس نے تیری مشکلیں سب کھینچ ڈالیں دار پر
دیکھ انساں وہ ترا مشکل کشا پیدا ہوا
شادمانی کی خبر دیتا ہوں تجھ کو اے حقیر
دیکھ لے تیرا وہ مختارِ بقا زندہ ہوا

غزل

کس طرح بھلا کہیئے یہ نائبِ یزداں ہے
اس دور کا ہر انساں انساں سے ہراساں ہے
اس دور کی بیچینی چہروں سے نمایاں ہے
اِس دور میں حاصل کب تسکینِ دل و جاں ہے
صیّاد کا خطرہ ہے اور برق کا اندیشہ
اے اہلِ چمن آخر یہ کیسا گلستاں ہے
کس طرح بتائیں ہم کیا ہم پہ گذرتی ہے
جاں وقفِ غمِ اُلفت دل کشتۂ ارماں ہے

اس دور کا کیا ہوگا اس دور کو کیا کہیئے
ان کے دلِ نازک پر بارِ غمِ دوراں ہے

ب جذبۂ وحشت کی کس طرح تسلی ہو
اے جوشِ جنوں اب تو داماں نہ گریباں ہے

ہم جس کے لئے ہر سُو دُنیا میں ہوئے رُسوا
اب تک وہ حقیرؔ آخر کیوں ہم سے گریزاں ہے

غزل

عاشق ہوں کیا تھا عشق پہلے بالیقیں میں نے
سرِ بزمِ ازل دیکھا تھا حسنِ اولیں میں نے

سینا پہ دیکھا ہے کبھی سدرہ پہ دیکھا ہے
ہزاروں بار دیکھا ہے تجھے اے نازنیں میں نے

وواں کا لے لیکر سہارا عشق و الفت میں
بدل کر رکھ دیا آخر مزاجِ آتشیں میں نے

جب بہکی بہکی سی لب پر آنے لگتی ہیں
یہی محسوس ہوتا ہے گنوایا دل کہیں میں نے

دیدار کی حسرت میں یہ معلوم ہوتا ہے
تمناؤں کو دفنایا ہے خود زیرِ زمیں میں نے

ائل پردۂ غفلت تجھے میں دیکھتا کیونکر
کھلی جب آنکھ تو پایا رگِ جاں سے قریں میں نے

ے کھول کر مانی کے جب فردِ عمل دیکھی
سوائے داغِ عصیاں اور کچھ دیکھا نہیں میں نے

معصومیت سے پوچھا تھا حسرتِ دل کو
یہ کب معلوم تھا پالا ہے مارِ آستیں میں نے

حقیرؔ اتنی خطا بھی ہے بڑی ہی سخت گستاخی
نظر سے کہہ دیا خود اپنا حالِ دل نشیں میں نے

حیرت بدایونی

نام رابنسن جون۔ والد بزرگوار کا نام الن جون جو خود شاعر تھے اور مخلص تخلص فرماتے تھے شاعر خیز سرزمین بدایوں میں ۲۳ ستمبر ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی اور بدایوں میں صحت عامہ کے محکمہ میں ملازم ہو گئے ۱۹۴۵ء سے شعر کہتے ہیں ابتدائی دور میں حضرت جامی بدایونی سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ اب حضرت رونق بدایونی سے استفادہ کرتے ہیں۔

آپ کے کلام میں سلاست و روانی ہے۔ زبان نہایت شُستہ۔ رموز شاعری سے واقفیت رکھتے ہیں۔ کلام میں گہرائی اور گیرائی دونوں پائی جاتی ہیں

بقول خود ؎

بہار راس نہ آئی گلوں کو جب حیرت
تو آگئے وہ میری شاعری کے دامن میں

نمونۂ کلام :-

توصیفِ مسیحا

میری یہی حیات ہے میری یہی نجات ہے
آپ کا غم میرے لئے دولت کائنات ہے

چہرہ کا عکس صبح ہے زلفوں کا عکس رات ہے
یعنی بنائے کل جہاں آپ کی اک ذات ہے

کلمہ مسیح پاک کا پڑھتا رہوں گا عمر بھر
مَیں نے سمجھ لیا ہے خوب اسمیں میری نجات ہے

شمس و قمر میں نور ہے لالہ و گل میں رنگ و بو
آپ کی ذاتِ پاک سے زینتِ کائنات ہے

ڈھونڈتا پھر رہا ہے کیوں راہِ جناں اِدھر اُدھر
تھام لے دامنِ مسیح یہی رہِ نجات ہے

آپ کی زندگی ہی سے پائی ہے سب نے زندگی
وجہ وجودِ دو جہاں آپ کی ایک ذات ہے

روزِ ازل سے پیشتر روزِ ازل سے آج تک
آپ کی ایک ذات تھی آپ کی ایک ذات ہے

ہوش میں حیرتِ حزیں منزل قریب آئی ہے
یہ مقامِ عشق ہے موت جہاں حیات ہے

غزل

بے مکاں ہو کے رہے بے سروساماں ہونا
مَیں نہ بھولوں گا کبھی جشنِ بہاراں ہونا

کارِ مشکل ہے کسی کام کا آساں ہونا
اس سے مشکل ہے کہیں صاحبِ ایماں ہونا

جو ترے غم کو سمجھتا ہو خوشی کا حاصل
ایسے بیمار کا ممکن نہیں درماں ہونا

زندگی گردشِ دوراں کے حوالے کر دے
ہو جو منظور تجھے نازشِ دوراں ہونا

ہر طرف چھا گئے نفرت کے اندھیرے اب تو
شمعِ الفت کا ضروری ہے فروزاں ہونا

جذبِ صادق کا نہیں اس سے بڑا کوئی ثبوت
میری حالت تیری صورت سے نمایاں ہونا

آ گئی جوش میں اللہ کی رحمت حیرت
کر گیا کام گنہگار کا گریاں ہونا

غزل

پہنچے نہ فرشتوں کے جہاں وہم و گماں تک
اللہ رے انساں کی رسائی ہے کہاں تک

گزرے ہیں بہت فخرِ جہاں نازشِ ہستی
باقی نہ رہا ان کا کہیں نام و نشاں تک

میں روز بناؤں گا نشیمن پہ نشیمن — اے برقِ شرربار جلائے گی کہاں تک

للہ مرے حال پہ اب چشمِ کرم کر — لے آئی مجھے تلخیٔ غم آہ و فغاں تک

آپس کی شکایات کو آپس ہی میں رکھیئے — یہ راز نہ پہنچے کہیں غیروں کی زباں تک

مٹتے جو رہے یونہی نشیمن پہ نشیمن — یہ سلسلہ پہنچے گا خدا جانے کہاں تک

وہ رند ہوں میخانۂ جامی کا میں حیرت
اُٹھتا ہے پلانے کو مجھے پیرِ مغاں تک

پیامِ بخشش

آج دُنیا میں وہی ظلِ کرام آیا ہے — جس کا نبیوں کے نوشتوں میں پیام آیا ہے

جب بھی عیسیٰ کا زباں پر مری نام آیا ہے — غیب سے خلد میں جانے کا پیام آیا ہے

وقتِ آخر جو زباں پر ترا نام آیا ہے — کیا گناہ گار کی بخشش کا پیام آیا ہے

ہم گناہ گاروں کو دُوزخ سے بچانے کیلئے — عرش سے فرش پہ وہ بن کے امام آیا ہے

چلتے پھرتے ہوئے مُردوں کو جلایا کس نے — یہ سوال آیا جہاں آپ کا نام آیا ہے

نور کی رات تھی چوبیس (۲۴) دسمبر کی رات — جس میں مریم کو فرشتوں کا سلام آیا ہے

جاؤں حضرت کی زیارت کیلئے بیت الحم — یہ تصور تو مرے دل میں مُدام آیا ہے

مجھ کو پُرسشِ کا سرِ حشر ذرا خوف نہیں — صاف کہہ دوں گا مسیحا کا غلام آیا ہے

چھوڑ اس بادہ پرستی کو خدارا ساقی — اس کا انجیل میں چھُونا بھی حرام آیا ہے

کہیں ڈرتے ہیں پرستارِ مسیحا حیرت
غم نہیں موت کا آنے دو پیام آیا ہے

خادم فیروزپوری

نام گوردیال مسیح تخلص خادم۔ بمقام موضع مانا سنگھ والا ضلع فیروزپور میں ۱۷ رمئی ۱۹۳۱ء پیدا ہوئے۔ مشن اسکول موگا میں تعلیم حاصل کی۔ تحصیل علم کے بعد ۱۹۵۲ء سے سول اسپتال لدھیانہ میں بہ حیثیت لیبارٹری اسسٹنٹ ملازم رہے اور پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم کا امتحان پاس کیا۔ شعروشاعری کا شوق پرانا ہے۔ ماسٹر شیر سنگھ فرہاد کے شاگرد ہیں۔

کلام مسیحی پرچوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ زندگی بھر مشکلات اور دقتوں کا مردانگی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے ہیں۔

ولادت مسیح

خدا ہو کر مجسم شکل انساں دہر فانی میں
ہمارے درمیاں آئے ہیں ہم پر مہرباں ہو کر

پیمبر اولیاء رہبر بڑے آئے زمانے میں
مسیح آئے جہاں میں مالک کون و مکاں ہو کر

بشر مُردے میں جاں ڈالے کبھی یہ ہو نہیں سکتا
مسیح مُردے جلاتا ہے خدائی کا نشاں ہو کر

وہی ہے زندگی اور موت کا مختار محشر میں
وہی مشکل کشا ہوگا خدائے دو جہاں ہو کر

خدا کو شکل و صورت میں کبھی خادم نہیں دیکھا
ہمارے درمیاں آئے مسیحائے زماں ہو کر

صلیب

لٹکا ہوا صلیب پہ ہاتھوں میں کیل ہے — یہ داستانِ درد تو کافی طویل ہے
پسلی چھدی تو پیار کا چشمہ ابل پڑا — دھارا لہو کا واقعی آبِ سبیل ہے
آنکھوں میں کلوری کا نظارہ لئے ہوئے — اشکوں سے دھو رہا ہوں جو داغِ ذلیل ہے
اس کی طلب میں عمر گذاری ہے رات دن — جس کی نگاہِ ناز کا یہ قتیل ہے

خادم اس انقلاب میں جا مل سکوں کہاں
چلنا خدا کی راہ میں اچھی سبیل ہے

غزل

تیرے نقشِ پا کی تلاش میں مَیں کہاں کہاں سے گذر گیا
کبھی اس جہاں سے گذر گیا کبھی اس جہاں سے گذر گیا

کبھی دردِ دل کے وجود میں کبھی چشمِ تر کے نمود میں
کبھی راہِ گرد و غبار میں ٹھہرا امتحاں سے گذر گیا

جو بھی مل گیا ترے ہاتھ سے وہ خوشی سے ہاتھ میں لے لیا
مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے ترے آستاں سے گذر گیا

مجھے دربدر نہ رلائیے مَیں ترے ہی در کا فقیر ہوں
رہا کام رنج و ملال سے مَیں جہاں جہاں سے گذر گیا

خستہ بریلوی

ای۔ ایس۔ فالس نام خستہ تخلص۔ ۲۲ر فروری ۱۹۰۵ء بجنور میں پیدا ہوئے لیکن عمر کا بیشتر حصہ بریلی میں بسر ہوا۔ مُراد آباد پارکر ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ دَورانِ تعلیم شعروشاعری کا شوق پیدا ہوا اور اسکول کے مولوی صاحب جناب ظفر حسین عاصی امروہوی سے اصلاح لینے لگے۔ بعد میں اصلاح لینا بند کردی۔ کلام نعتیہ ہے جو حمدِ مسیح اور مذہبیات کے دائرے میں ہے۔ اگر باقاعدہ کسی اُستاد کے شاگرد ہوتے تو اچھے شاعر ہوسکتے تھے۔ اوائل عمر میں آشوبِ چشم کے مرض میں گرفتار ہوگئے اور آخر میں بینائی جاتی رہی تھی۔

۴ر جولائی ۱۹۷۴ء بریلی میں انتقال کیا۔

سلام

زمیں سلام کرے آسماں سلام کرے
مسیحِ پاک کو سارا جہاں سلام کرے

ہر اک زمین پہ بادِ وزاں سلام کرے
ہر ایک بحر میں موجِ رواں سلام کرے

جدھر ظہور کرے ذاتِ پاک عیسیٰ کی
ادھر زباں سے ہر ایک بے زباں سلام کرے

تجھے یہ مرتبہ بخشا خدا تعالیٰ نے
بشر یہاں تو فرشتہ وہاں سلام کرے

ادب کا یہ تقاضا تھا کہ نام پر تیرے
ہر ایک پیر جھکے اور جواں سلام کرے

مسیح جب میرے گلشن کے باغباں ٹھہرے
تو کیوں نہ دور سے بادِ خزاں سلام کرے

جو پاس آئے نہ صورت دکھائے خستہ کو
تو یہ غریب کسے اور کہاں سلام کرے

غزل

آج دنیا کیلئے باعثِ افکار ہوں میں
بات اتنی ہے صداقت کا پرستار ہوں میں

یہ حقیقت ہے سیہ کار و خطا کار ہوں میں
میرے عیسیٰ تیری رحمت کا طلبگار ہوں میں

مجھ سے وابستہ رہا گلشنِ عالم کا نظام
آج حیرت ہے کہ گلشن کیلئے بار ہوں میں

عالمِ یاس میں پتھرا گئیں آنکھیں میری
رحم فرمایئے اب طالبِ دیدار ہوں میں

مجھ سے اسے گردشِ دوراں نہ الجھ ہوش میں آ
آج پھر حق کے لئے بر سرِ پیکار ہوں میں!

اور کیا چاہیئے انجامِ محبت خستہ
شکر صد شکر کہ رسوا سرِ بازار ہوں میں

غزل - بڑا دن

یہ عجب تارہ فلک پر کیوں نظر آیا ہے آج
باخبر ہوئے خبر رب کا پسر آیا ہے آج

دیکھ لو چرنی میں گر تم نے خدا دیکھا نہیں
بر بنائے رحم وہ بنکر بشر آیا ہے آج

وہ ہے سلطانوں کا سلطاں کون ہے اس کا حریف
کیا نرالے تاج کا ایک تاجور آیا ہے آج

بالیقیں بگڑے ہوئے اب کام سب بن جائیں گے
میری قسمت کا ستارہ اوج پر آیا ہے آج

سجدہ ہائے شکر ہوں عیدِ ولادت کے ادا
اس نئے گرجے میں خستہ گھر کا گھر آیا ہے آج

دلگیر بریلوی

روپن بی فاس نام۔ دلگیر تخلص۔ وطن بریلی میں ۹ مارچ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ سے ایم۔اے اور الہ آباد سے ایل۔ٹی پاس کیا۔ مراد آباد یادگر ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے وہاں کے ہیڈ مولوی جناب ظفر حسین عاصی کی ترغیب سے شاعری کا شوق پیدا ہوا اور شعر کہنے لگے۔ لیکن ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد تعلیمی مشاغل اور ملازمت کی مصروفیات نے شوق کو پروان چڑھنے نہ دیا اور کسی استاد کی جانب متوجہ نہ ہوئے اسلئے کلام معمولی اور بہت کم ہے۔

ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز کے عہدہ سے سبکدوش ہوکر بریلی میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں۔ نمونۂ کلام

بڑا دِن

آئی ہے چرخ سے یہ دِلکش صدا
آج پیدا ہوگیا ابنِ خدا

جس تجلّی کی جھلک تھی طور پر
ہے ہویدا آج وہ نورِ خدا

ہے مسیحا شافعِ کون و مکاں
لائے گا سبکو وہی نزد خدا

بن گیا دلگیر بھی فخرِ جہاں
جب کیا سجدہ مسیحا کا ادا

توصیفِ مسیحا

پاک مریم تیری پاکی مرحبا — پاک مریم تیرا بیٹا حبذا
اس نے بیماروں کو بخشی تھی شفا — زندگی مُردوں کو اس نے کی عطا
تھی ستارے میں مقدس روشنی — حضرتِ عیسیٰ کے در پر جو رُکا
ہم گنہ گاروں کی بخشش کے لئے — دار کے تختے کے اوپر وہ چڑھا
اس مسیحا کے مجاہد ہم بنیں — موت ہے جس نے کیا ہم کو رہا
تیسرے دن معجزانہ رنگ سے — جی اُٹھا وہ جی اُٹھا وہ جی اُٹھا

ہر بلا سے آدمی بچتا رہے
بندہ دلگیرؔ کی یہ ہے دُعا

غزل

مَیں نے ایسی پی شرابِ آرزو — ہو گیا خانہ خرابِ آرزو
سامنے آنا یہ اُنکا برملا — ہے حقیقت میں جوابِ آرزو
وہ خفا ہو کر یکایک چل دیئے — کھو گی جب میں نے کتابِ آرزو
آرزو کس کی ہو پوری زیست میں — زندگی خود ہے حبابِ آرزو
حضرتِ دلگیر کیوں مسرور ہو — یہ ہے آغازِ شبابِ آرزو

غزل

اب تو کچھ واسطہ کعبہ سے نہ بُتخانے سے — عشق میں آپ کے ہم ہو گئے دیوانے سے
شعلۂ عشق میں جل جانے کی لذّت کیا ہے — حالتِ سوزِ جگر پوچھئے پروانے سے
غیر تو غیر ہے وقت کی خوبی دیکھو — آج اپنے بھی نظر آئے ہیں بیگانے سے
ایک دن آئے گا ایسا بھی ضرور اے دلگیر — زاہد رندپیں گے تیرے پیمانے سے

ذاکر میرٹھی

نام شمس شیر تنگ۔ تخلص ذاکر موضع گنگیسر تحصیل حسن پور ضلع مُرادآباد میں ۸ر اکتوبر ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں بغرض تعلیم میرٹھ آگئے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ اور بُلندشہر میں ہوئی تعلیم سے فارغ ہوکر اُسی اسکول میں مدرّس ہوگئے لیکن بعد میں پولیس میں بھرتی ہوئے وہاں کچھ عرصہ رہ کر ملازمت چھوڑ دی۔ انجیل کی منادی کا شوق ہوا اور آخر عمر تک اسی میں مشغول رہے۔ بقول خود اُن کو لڑکپن سے نظمیں پڑھنے اور ازبر کرنے کا شوق تھا۔ اسی دوران خود بھی نظمیں کہنے لگے۔ کتاب سراج دہاج سے علم عروض سیکھا پہلے جناب صوفی میرٹھی سے پھر حضرت نادر شاہجہان پوری سے اصلاح لی۔ آپ کا کلام مُدّت تک مسیحی جرائد کی زینت بنتا رہا۔ بڑے پُرگو شاعر تھے۔ ۱۹۵۱ء میں آپ پر فالج گرا اور ۲۴ر مارچ ۱۹۵۲ء کھتولی (ضلع مظفر نگر) میں جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

تمام کلام نعتیہ ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہے کلام شاعرانہ رعایتوں سے معرا ہے۔ صرف منادی اور تبلیغ کے مقصد سے طبع آزمائی کرتے رہے۔

جناب ہُما میرٹھی نے دو اشعار میں ان کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔ ؎

ہوا رجوع تو پہلے جناب صوفی سے — اور اسکے بعد سنبھالا ہے تجھ کو شاکر نے

یہ مانا شعروں میں تیرے بُلند باتیں تھی — مگر ہے یاد ہمیں خوب تیری پُرگوئی

غزل

غریب و بیکس و لاچار تجھ بن سے کہاں جاؤں بحالِ زار تجھ بن
پڑا ہوں ہجر میں بیمار تجھ بن مسیحا اے شہِ ابرار تجھ بن
میری بیتابیِ دل سے عیاں ہے ہوئی ہے زندگی دشوار تجھ بن
مریضِ عشق ہوں سوزِ الم سے تڑپتا ہوں پئے دیدار تجھ بن
نہ ہو جب تک تیرا دیدار عیسیٰ رہے گا چشم دریا بار تجھ بن
نگاہِ عاشقِ حسنِ ازل میں گل و غنچہ ہے شکلِ خار تجھ بن
تیرے دیدار کی چاہت لگی ہے پریشاں ہوں ذلیل و خوار تجھ بن
حقیقت تو ہے یہ اے ابنِ مریم نشاطِ عمر ہے بیکار تجھ بن

تیرا ذاکر مثالِ نیم بسمل
تڑپتا ہے تیرا بیمار تجھ بن

بڑا دن

ہوئے پیدا جہاں میں حضرتِ عیسیٰ مبارک ہو چمک اٹھا خدا کے نور کا تارا مبارک ہو
مچی ہے دھوم عالم میں مسیحا تیری آمد کی ولادت کا تری ہر گھر میں ہے چرچا مبارک ہو
جہاں میں آ کے تو نے ابنِ مریم خاص رحمت کی شفاعت کا ترے سر بندھ گیا سہرا مبارک ہو

ضیا پھیلی ہے نورِ پاک کی ذاکر زمانے میں
گلستاں بن گیا ہے آج ہر صحرا مبارک ہو

راہب بریلوی

نام این آر سہائے۔ تخلص راہب۔ وطن بریلی ۱۷ر جولائی ۱۹۱۴ء
علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ روایتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ریلوے میں ملازمت اختیار کی
اور وہیں سے سبکدوش ہوکر بریلی میں مستقل طور پر مقیم ہوگئے۔

شاعری کا شوق عرصے سے ہے۔ پہلے شاد عارفی رام پوری سے اصلاح
لیتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد عابد مینائی شاہجہانپوری کے شاگرد ہوئے۔ کم لکھتے ہیں
مشاعروں میں پڑھنے کے شوقین ہیں۔ بعض اشعار بہت اچھے کہے ہیں۔

نمونۂ کلام۔

توصیفِ مسیحا

الفاظ سے کیا ہوگی بیاں شانِ مسیحا — تابندہ ہے یہ قول بہ عنوانِ مسیحا
ہوں لاکھ سیہ کار خطاوار گنہ گار — لیکن ہوں تہہ دل سے ثنا خوانِ مسیحا
انجیل کا پابند ہر اک فعل ہے میرا — فرمانِ الٰہی ہے جو فرمانِ مسیحا
عیسیٰ مجھے توفیق عنایت ہو خدایا — چھوڑوں نہ کبھی ہاتھ سے دامانِ مسیحا
دنیا سے مجھے الفت و رغبت ہو تو کیونکر — زنداں میں نہیں رہتے اسیرانِ مسیحا
انوارِ مقدس سے مٹی ظلمت عالم — اللہ غنی جلوۂ تابانِ مسیحا

کیوں حشر کے میدان کا ڈر ہو مجھے راہب
موجود ہیں کتنے ہی محبانِ مسیحا

غزل

بشر کو رازِ حقیقت سے آگہی نہ ہوئی
اُجالا دل میں ہو جس سے وہ روشنی نہ ہوئی

ترے بغیر کوئی لطفِ زندگی نہ ملا
ترے بغیر جو گذری وہ زندگی نہ ہوئی

تمام عمر گذاری رہِ محبت میں
مگر رموزِ محبت سے آگہی نہ ہوئی

غمِ زمانہ کے خوگر ہیں تیرے دیوانے
ہزار غم سہی بے کیف زندگی نہ ہوئی

سکونِ دل سے ہے محروم آج تک راہب
ترے کرم میں یہ مانا کوئی کمی نہ ہوئی

غزل

کیوں نہ ہو غم کی بات جاتی ہے
آبروئے حیات جاتی ہے

کیا کہوں سوزِ غم کا افسانہ
آنکھوں آنکھوں میں رات جاتی ہے

یہ مسلسل کشیدگی کب تک
عظمتِ التفات جاتی ہے

آپ کیا جا رہے ہیں پہلو سے
رونقِ کائنات جاتی ہے

التجائے کرم ارے توبہ
تیرے راہب کی بات جاتی ہے

راز دہلوی

نام نامی عمانوئیل سائمن پیٹر۔ راز تخلص۔ ۲۱ر فروری ۱۹۲۱ء
دہلی کینٹ میں پیدا ہوئے۔ بچپن اور لڑکپن نہایت آرام و آسائش میں بسر ہوا
آپ چودہ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ نے نہایت ہمت اور محنت
کے ساتھ ایک بہن اور تین بھائیوں کی پرورش کی۔ ۱۹۳۸ء میں انگرام انسٹی ٹیوٹ
غازی آباد سے مڈل پاس کیا۔ اسکے بعد ۱۹۴۱ء میں کلینسی ہائی اسکول متھرا سے
ہائی اسکول پاس کیا۔ دورانِ تعلیم کھیلوں کا بہت شوق تھا اور ہاکی و فٹ بال
ٹیموں کے کپتان رہے۔

تحصیل علم کے بعد ۱۹۴۱ء میں محکمہ تار و ڈاک میں ملازم ہوگئے دورانِ
ملازمت دہلی یونیورسٹی سے بی کام پاس کر لیا ۳۷½ برس محکمہ ٹیلی فون میں
ملازمت کرکے ۲۸ر فروری ۱۹۷۹ء سیکشن آفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔
اس وقت بھی آپ دہلی کی کئی ایک فلاحی انجمنوں کے ممبر ہیں۔

۱۹۶۸ء سے بہارِ سخن جناب موج زیبائی دہلوی سے مشورہ سخن
کرتے ہیں۔ فن شاعری سیکھنے کا شوق ہے لیکن مصروفیت کی وجہ سے اس طرف
زیادہ وقت نہیں دے پاتے۔ کبھی کبھی کلام مسیحی پرچوں میں نظر آجاتا ہے۔

صلیب

رفعتِ ارض و سما ہے عظمتِ شانِ صلیب
سارا عالم ہو گیا ہے زیرِ احسانِ صلیب

قلبِ مضطر میں چھپا ہے میرے ارمانِ صلیب
تیر و نشتر کی طرح ہے دل میں پیکانِ صلیب

حشر برپا ہو رہا ہے آج طوفانِ صلیب
داورِ محشر ہوا تھا آج قربانِ صلیب

ہو کے خود قربان دُنیا کے گناہوں کے لئے
ابنِ خالق بن گیا کونین میں جانِ صلیب

ساقیِ کونین نے ہم کو مئے اُلفت کا جام
تاکہ حاصل ہو جہاں میں ہم کو عرفانِ صلیب

کس کے دم سے ہو گیا روشن میرا ظلمت کدہ
اب میرا دل ہے منوّر زیرِ احسانِ صلیب

خونِ عیسیٰ سے جہاں میں چھائی ہیں وہ برکتیں
ہو گئے پیدا ہزاروں ہی محبانِ صلیب

پسلیوں سے بہہ رہا تھا چشمۂ آبِ بقا
یعنی پہلو سے نمایاں ہو گئی شانِ صلیب

میرے دل میں راز کیا ہو روزِ محشر کا خیال
ہوں ازل سے مَیں بھی اک انکا گدایانِ صلیب

پڑوسی

پڑوسی کے ہم ہیں ہمارا پڑوسی
دل و جان سے بھی ہے پیارا پڑوسی

ہر اک رنج و غم کا سہارا پڑوسی
بھنور میں سفینے کا یارا پڑوسی

حقیقت میں ہے پیکرِ حسنِ یزداں
محبّت کا افضل سہارا پڑوسی

غم و رنج عیش و مسرّت کا ساتھی
عزیزوں سے بڑھ کر ہے پیارا پڑوسی

وانسان دراصل ہو نیک انساں | حقیقت میں وہ ہے ہمارا پڑوسی
ندا نے بنایا ہے ہر بشر کو | بشر ہے ہمارا تمہارا پڑوسی
لسے غیر سمجھیں بھلا یہ تو سمجھو | ہر اک ہے تمہارا ہمارا پڑوسی
مزدور حقدار محنت ہے یارو | وہ مزدور بھی ہے ہمارا پڑوسی

یہ ہے رازِ عیسیٰ کی تعلیم اُلفت
کہ اپنے سے بڑھ کر ہے پیارا پڑوسی۔

غزل

ریب زیست ہے دُنیا نہیں کوئی یہاں اپنا
بناؤ اس جہاں سے بھی کہیں آگے جہاں اپنا
الانا ہی اگر مقصود ہے تو یوں مٹا مجھ کو
فرشتے بھی نہ پائیں حشر تک کوئی نشاں اپنا
فیں کو برقِ نا ہنجار نے تا کا سرِ گلشن
وہ تنکے چند جن سے تھا مکمل آشیاں اپنا
سی دم ظلم و استبداد کی بُنیاد ہلتی ہے
دکھاتی ہے نرالا رنگ جب آہ و فغاں اپنا
بچشم غور دیکھا رازِ دُنیائے محبت میں
نہ کوئی راز داں اپنا نہ کوئی مہرباں اپنا

راغب رضوانی

نام وسنت بھجن۔ راغب تخلص۔ ۴ راگست ۱۹۳۳ء شہر لاہور میں پیدا ہوئے۔ دلّی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے اور پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل پاس کیا ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد سے شاعری کر رہے ہیں اور برادر حقیقی جناب طالب شاہ آبادی سے اصلاح لیتے ہیں۔

مُستقل طور پر دہلی میں سکونت پذیر ہیں اور اسپلائنز اسٹیٹ انشورنس کارپوریشن نئی دہلی میں انسپکٹر ہیں۔

کلام سلجھا ہوا اور صاف ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں سمجھ بوجھ کے ساتھ کہتے ہیں۔ اشعار میں آمد ہے۔ زبان میں حلاوت و شیرینی ہے۔ تخیّل کی بلند پروازیاں بہت دلکش ہیں۔ افسانہ نگاری کا بھی شوق ہے۔ چند افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

بڑا دِن

انوارِ حق کی شمع فروزاں لئے ہوئے
تاریکیوں میں مہرِ درخشاں لئے ہوئے

جامِ حیات اور مئے عرفاں لئے ہوئے
تو آگیا ہے عظمتِ انساں لئے ہوئے

دورِ خزاں چمن سے گیا آ گئی بہار
گُل کے فسُردہ چہرے پر آنے لگا نکھار

اہلِ چمن میں ذکر یہ ہوتا ہے بار بار
تو آگیا ہے فصلِ بہاراں لئے ہوئے

مجھ کو مئے حیات کا اک جام مل گیا | دردِ گناہ سے مجھے آرام مل گیا
تاریک شب میں نور کا پیغام مل گیا | تو آگیا ہے صبح درخشاں لئے ہوئے

در پر ترے پناہ ملے گی اسے ضرور | بارِ الم سے ہو گیا ہے تھک کے چور چور
ڈرتا جھجکتا کانپتا راغب ترے حضور | آیا ہے دل میں دید کا ارماں لئے ہوئے

صلیب

پرچم تثلیث کے سایہ میں مردانِ صلیب | سوئے منزل بڑھ رہے ہیں لیکے ارمانِ صلیب
کھل گئی میری حقیقت زیر دامانِ صلیب | سر ندامت سے نہیں اٹھتا ہے سلطانِ صلیب
میں صلیب اپنی اٹھا کر تیرے پیچھے ہو لیا | چٹکیاں ہی لے رہا تھا دل میں ارمانِ صلیب
باغِ عالم میں ہوئی پیدا نباتات اس واسطے | پتہ پتہ ہر شجر کا ہو ثنا خوانِ صلیب
زندگی بدلی زمانے بھر کی خوشیاں مل گئیں | کر لیا منظور میں نے جب سے فرمانِ صلیب
تیری قربانی سے بدلا ظاہر و باطن کا رنگ | لب ثنا خوانِ محبت دل ثنا خوانِ صلیب
راغب خستہ شکستہ دل لئے آیا ہے آج | آنکھ میں اشکِ ندامت دل میں پیکانِ صلیب

غزل

سوزِ دروں نے سوختہ ساماں بنا دیا | یوں دل کو تیرے پیار کے شایاں بنا دیا
ذوقِ نظر کو بخش کے جلوؤں نے روشنی | پردے اُٹھا دئے مجھے حیراں بنا دیا
قیدِ قفس میں سیر گلستاں محال تھی | لیکن تصورات نے آساں بنا دیا
کاریگری تو دیکھئے اس کارساز کی | دم دے کے مشتِ خاک کو انساں بنا دیا
آہ و غم و حزن سے بنایا تھا اک خمیر | اور اس خمیر سے دلِ انساں بنا دیا
راغب مذاقِ عشق نے اتنا کیا بلند | ہر شے کو تم نے جلوۂ جاناں بنا دیا

حاکم سنگھ راہی۔ لدھیانوی

حاکم سنگھ نام۔ تخلص راہی۔ وطن کھنہ۔ ضلع لدھیانہ

۱۶ر جون ۱۹۳۶ء بھاؤلہ ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی اور ۱۹۶۵ء میں علم الٰہیات کا امتحان الہ آباد سے پاس کرکے پادری کے عہدہ پر فائز ہیں

کم سنی سے شاعری کا شوق ہے۔ اردو کے علاوہ پنجابی میں بھی کہتے ہیں۔ الہ آباد میں مرحوم پادری نادر شاہ نادر سرہندی بنگلوری کی صحبت نے اس شوق پر تازیانہ کا کام کیا۔ ان سے اصلاح لینا شروع کر دیا۔ لیکن الہ آباد سے چلے جانے کے بعد اصلاح کا سلسلہ ختم ہو گیا اسلئے اکتساب فن نہ کر سکے۔ زبان صاف اور سلیس ہے البتہ کہیں کہیں پنجابیت آ جاتی ہے۔

کلام نعتیہ اور حقانی ہے۔ اکثر مسیحی رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے ایک مجموعۂ کلام "شمع حیات" اور ایک ہندی ناول "حسین دھوکہ" شائع ہو چکا ہے۔

توصیفِ مسیحا

بیکراں عیسیٰ تمہاری ہم پہ رحمت ہو گئی
بات یہ ہے کہ تمہیں ہم سے محبت ہو گئی

دور دنیا سے ہوئے سب کے سیاہی کے نشاں
پاؤں رکھتے ہی تیری حیرانی بھی جلوت ہو گئی

آ گیا دنیا میں جب عالمِ بالا سے تو
بیکسوں کی دو جہاں میں خوب عزت ہو گئی

کر دیا آزاد تو نے ہم کو ہر اک خوف سے
تیری ہم پر ابنِ مریم یہ عنایت ہو گئی

صورتِ انساں میں ظاہر ہوئے ابنِ خدا — اے خدا دنیا پہ ظاہر تیری قدرت ہو گئی
جامۂ آدم میں د آہی آمدِ ابنِ خدا
اے خدا دنیا پہ ظاہر تیری قدرت ہو گئی

بڑا دن

نئی زندگی وہ لٹانے کو آیا — شرابِ محبت پلانے کو آیا
مصور ہی آیا ہے تصویر بن کر — وہ جلوۂ خالق دکھانے کو آیا
وہ کفارہ دیکر زمانے کی خاطر — جدا کو خدا سے ملانے کو آیا
نئے ساز و ساماں محبت کے لیکر — وہ انساں کو انساں بنانے کو آیا
نئی زندگی سبکو دیکر جہاں میں — وہ دورِ فنا کو مٹانے کو آیا
وہ نغمہ سُنا دو زمانے کو راہی
جو خود ابنِ مریم سُنانے کو آیا

گڈ فرائیڈے

اُلفت میں عاصیوں کی وہ کیا کیا نہ کر گئے — کانٹوں کا تاج پہنے سردار مر گئے
انسان کو نجات کا راستہ بتا دیا — وہ کسقدر جہان پر احسان کر گئے
آئینہ اُن کے حسن کا جب بن گئی نظر — عالم کے سارے نقش یکایک اُبھر گئے
عیسیٰ کے آستاں پہ جبیں جب سے جھک گئی — سب پیچ و خم نصیب کے اپنے سنور گئے
راہی نقوشِ پا ہیں ابھی تک نظر فروز — ان راستوں کو چوم لو عیسیٰ جدھر گئے

غزل

آرزو شمعِ دل بن کے جلتی رہی / دن گذرتا گیا رات ڈھلتی رہی
دامنِ ابنِ مریم کو تھامے رہے / زندگی آپ خود ہی سنبھلتی رہی
ہم پہ جب پڑ گئی اے مسیحا نظر / زخم بھرتے رہے جاں سنبھلتی رہی
لڑ گئی جب سے عیسیٰ سے میری نظر / حسرتِ قُربِ عیسیٰ مچلتی رہی
ہم جو مِل مِل کے ان سے بچھڑتے رہے / ہر خوشی آنسوؤں میں بدلتی رہی

ان کا راہی تصوّر لئے روز و شب
زندگی راہِ روشن پہ چلتی رہی

غزل

تماشہ اہلِ جہاں ہم نے دیکھا / یہاں ہم نے دیکھا وہاں ہم نے دیکھا
بلکتی ہوئی یہ زمیں ہم نے دیکھی / سسکتا ہوا آسماں ہم نے دیکھا
زمانے تیری خود پرستی کے باعث / اُجڑتا ہوا آشیاں ہم نے دیکھا
ہوس سے یہاں پر کوئی بچ نہ پایا / بدلتا ہوا ہر نشاں ہم نے دیکھا
ہر اک سُو غریبی و بیچارگی ہے / سُلگتا ہوا اک جہاں ہم نے دیکھا
نہ جینے پہ قدرت نہ مرنے پہ قابو / بشر اسقدر ناتواں ہم نے دیکھا

حوادث کی آندھی میں ہر وقت راہی
بھٹکتا ہوا کارواں ہم نے دیکھا

راہی لدھیانوی

نام نامی جان اکبر۔ تخلص راہی ۱۳ مارچ ۱۹۳۷ء بمقام لدھیانہ پیدا ہوئے۔ وطن میں ہندی۔ پنجابی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ شوقِ زبان دانی ہے۔ اسلئے اردو بھی سیکھ لی۔ اور اس میں قابلیت پیدا کی۔

آپ کے عمِ بزرگوار جناب ڈاکٹر یوسف خاں حیا لدھیانوی اچھے سخن شناس ہیں۔ ان کے مشورے سے میدانِ شاعری میں قدم رکھا اور ان سے ہی اصلاح لی۔ لدھیانہ میں مستقل طور پر سکونت رکھتے ہیں۔ پنجابی زبان میں زیادہ لکھتے ہیں۔ ہندی شاعری سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اسلئے اردو میں بھی ہندی الفاظ کا استعمال بے تکلف کرتے ہیں۔ بچوں کے لئے نظمیں اور گیت لکھے ہیں۔ جو ریڈیو جالندھر سے نشر ہوتے ہیں۔ نثر بھی لکھتے ہیں۔ افسانے کے مردِ میدان ہیں۔ لدھیانہ میڈیکل کالج میں ملازمت کی۔ اب لدھیانہ میں اپنی لیبریٹری چلاتے ہیں۔ اور خدمتِ خلق میں مصروف رہتے ہیں۔

بڑا دِن

بچلنے آج انسانوں کو ہمدردِ جہاں آئے
مُبارک ہو زمیں والو مسیحائے زماں آئے

مسیحائے زماں آئے وہ منجیِ جہاں آئے
وہ آقائے زمیں آئے وہ ربِّ آسماں آئے

میرے آقا میرے مولا وہ میرے حکمراں آئے
کہاں میں ہوں کہاں وہ ہیں کہاں سے وہ کہاں آئے

نہیں ملتا سراغِ منزلِ ہستی تو کیا غم ہے
ہزاروں منزلیں طے کر کے میر کارواں آئے
وہی نورِ الٰہی ہیں وہ ہی ذاتِ الٰہی ہیں
وہ مریم کے پسر پیمبر فدا ربِ زماں آئے
یہ دُنیا دردِ عصیاں سے بڑی بیتاب تھی راہی
ہمارے درد کا درماں لئے وہ مہرباں آئے

گُڈ فرائیڈے

مسیحا کا ایثارِ رحمت نہ جانا
مرے دل کو غم ہے تو غم ہے اُسی کا
ہر اک قسم کا اور ہر اک ظلم بے جا
منجیؔ پہ میرے کیا جا رہا ہے

کوئی منھ پہ تھوکے طمانچے لگائے
کوئی بال نوچے پھر آنکھیں دکھائے
تشدّد سے گِن گِن کے کوڑے لگائے
بغاوت کا فتویٰ دیا جا رہا ہے

سراپائے اقدس کو بسمل بنا کر
جبینِ مقدس پہ کانٹے سجا کر
سرِ عام شافی کو مجرم بنا کر
عدالت میں حاضر کیا جا رہا ہے

محبّت کی راہوں میں سب کچھ لٹا کر
گناہِ جہاں اپنے سر پر اٹھا کر
زمانے کو مکتی کا رستہ دکھا کر
وہ گرتا سنبھلتا چلا جا رہا ہے

بہاروں میں بوئے حِنا بیز بھر دو
پیالوں میں آبِ طرب خیز بھر دو
فسُردہ دلوں کو جواں خیز کر دو
لئے راہی اپنا پیام آ رہا ہے

گیت

سُندر بالک سُندر راجہ
بیت لحم کا چھوٹا بالک
رُتبہ اس کا عالیشان
سب گروؤں کا یہ سُلطان

پرتھوی سورگ میں اس کا مان — سب سے اونچی اس کی شان
گونگوں سے وہ بات کرے گا — بھوکوں کا وہ پیٹ بھرے گا
اندھیارے کو دور کرے گا — دُنیا کو پُر نور کرے گا
ہر جاتی سے پیار کرے گا — جنت کا حقدار کرے گا
ہم سب اس کی مہما گائیں — سُندر سُندر درشن پائیں

درشن پائیں سیس نوائیں۔
اپنی اپنی بھینٹ چڑھائیں

حیات آئی ہے

آج اک مدتِ آلام و مصائب کے بعد — اپنے اُجڑے ہوئے گلشن میں بہار آئی ہے
نوعِ انساں کے گناہوں کا مداوا بنکر — شکلِ معبود ہی ہونے کو نثار آئی ہے
بزمِ گیتی سے کہو نغمہ سرا ہونے دو — لحنِ داؤد کو بربط پہ رواں ہونے دو
دلِ زدہ کس لئے بیٹھے ہو تم اربابِ نشاط — بزمِ راہی میں ہر اک شعر جواں ہونے دو
سبزہ زاروں کے تبسم میں نزاکت بھر دو — بادِ گلریز سے کہدو کہ ذرا جھوم کے چل
ریگ زاروں کے تکلم میں نفاست بھر دو — خاک چلتا ہے اگر تو مرا منہ چوم کے چل
دیدۂ دل کے دریچوں کو کشادہ کرنے — تیری منزل پہ مسیحا کی برات آئی ہے

دِلرُبا قوم کی تقدیس و عقیدت کے لئے
موت کے سانچے سے ڈھل ڈھل کے حیات آئی ہے

رسا لکھنوی

اسم گرامی الیاس داس تخلص رسا۔ خلف حضرت الیشور داس۔ بعدہٗ عیسیٰ داس۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۷۹ء لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم وتربیت حاصل کی۔ بعد تحصیل علم مُکتی فوج میں پادری کا عہدہ حاصل کیا۔ برگیڈیر ہوکر ریٹائر ہوئے اور امرتسر میں مستقل سکونت اختیار کی۔

افضل الدولہ فصاحت جنگ منشی افضل علی خاں افضل لکھنوی سے تلمذ تھا۔ والد بزرگوار بھی شاعر تھے اسلئے شاعری ورثہ میں ملی تھی فصیح الکلام اور ملک الشعراء کے خطابات حاصل کئے تھے۔ پنجاب گورنمنٹ نے سالانہ وظیفے سے نوازا تھا۔ آپکے متعدد مسیحی شاگرد ہیں۔ اپنے تمام خاندان کو بھی شاعرانہ رنگ میں رنگ دیا تھا۔

۲۲ مئی ۱۹۶۵ء بمقام قادیان رحلت فرمائی۔ ان کے شاگرد رشید حضرت ولیم سوہن لال ضیاء گھمانوی لکھتے ہیں:۔

"رسا صاحب مجھے ہر شام بُلواتے تھے۔ اُن کی کوٹھی میں انگیٹھی تپتی۔ سُلگتے کوئلوں پر ایک بڑی سی کیتلی میں چاے رکھی ہوئی۔ رسا صاحب دھوتی پہنے اور کمبل اوڑھے رہتے میرے ہاتھ میں کاغذ اور قلم دوات دیتے اور کہتے کہ لکھتے جاؤ۔ آپ اشعار بولتے اور میں لکھتا جاتا۔ ذرا غنودگی آئی تو فوراً حکم دیتے ماسٹر جی چاء

بناؤ۔ خود پیتے مجھے بھی پلاتے پھر وہی دور شروع ہو جاتا۔ استاد رسا صاحب مرحوم سادہ لوح، زندہ دل۔ جوتی کے مہمان نواز اور ہر دلعزیز تھے۔ غریبوں پر رحم کھانا اُن کا خاصہ تھا۔ مَیں نے اُن کی طبیعت میں غصہ بالکل نہیں دیکھا۔"

ہر صنفِ سخن میں کلام موجود ہے۔ بسیار نویس ہیں۔ غزلیں طویل ہوتی ہیں۔ قافیہ پیمائی کا شوق ہے۔ زود نویسی سے کام لیتے ہیں اسلئے ایک ہی بات کو کئی جگہ کہہ جاتے ہیں۔ فن سے واقف ہیں۔ مسیحی اعتقادات کو مختلف طریقوں سے نظم کیا ہے۔ مُسدّس بہت اچھا لکھتے ہیں۔ زبان پُر لطف ہے۔ اشعار میں کیف و سرور پایا جاتا ہے۔

نمونۂ کلام۔

رُباعیات

دھرتی میں ہوا آج قیامِ جنّت ہے دم سے مسیح کے نظامِ جنّت
اعجاز رسا ہے یہ مسیحائی کا دُنیا میں ملا ہم کو سلامِ جنّت

شرمندہ نگاہوں سے آج توبہ کر تو کفر کی راہوں سے آج توبہ کر
کچھ سوچ بھروسہ ہے رسا زیست کا کیا ناداں گناہوں سے آج توبہ کر

توصیفِ مسیحا

زندگی کے لطف کیا کیا زندگی پانے لگی یاد جب اپنے مسیحا کی مجھے آنے لگی
جب گناہوں کی ندامت مجھکو شرمانے لگی رحمتِ حق میری خاطر گود پھیلانے لگی

نزع میں کسی نے کیا اس کی مسیحائی کا ذکر
پھر میرے مردہ بدن میں زندگی آنے لگی

ہے مسیحا ابنِ حق نانِ بقا آبِ حیات[1]
معرفت اسکی یہیں یہ راز سمجھانے لگی

دیکھ کر ابنِ خدا کا پیار انسانوں کے ساتھ
گرمیٔ الفت سے میری روح گرمانے لگی

جو خدا کی راہ میں ہیں اے رسا مستِ الست
ان کو دُنیا کی نمائش کب بھلا بھانے لگی

بڑا دن

آج دُنیا میں عجب جلوہ گری کا دِن ہے
یعنی پیدائشِ منجی کی خوشی کا دِن ہے

بن کے انسان وہ ستار جہاں میں آیا
میرے عیبوں کے تلافی کی خوشی کا دِن ہے

رہنما بن کے خداوند خدا آیا ہے
اے خوشا آج میری راہ روی کا دِن ہے

مجھ کو شیطان کا کیوں ڈر ہو مسیح آیا ہے
آج دُنیا میں میری دلجمعی کا دِن ہے

آج دیدار مسیحا کا ہوا ہے مجھ کو
دِل کی سیری کا اور آنکھوں کی تری کا دِن ہے

خوفِ منجی سے چھپائے ہوئے منہ پھرتا ہے
آج آفاق میں شیطاں کی غمی کا دِن ہے

کیوں نہ ہو جائے رسا آج جہاں مالامال
آج اک عالمِ بالا کے سخی کا دِن ہے

[1] قولِ حضرت مسیح۔ "مَیں زندگی کی روٹی ہوں۔ میں زندگی کا پانی ہوں" یوحنا ۶: ۴۸

جی اُٹھا ابن خدا عید قیامت آئی!

…دھوم سے لطف فزا عید قیامت آئی
زیست کی لیکے ہوا عید قیامت آئی

…نگ فرحت کا جما عید قیامت آئی
شور ہر سو ہے مچا عید قیامت آئی

…وت کا سر ہے جھکا عید قیامت آئی
جی اُٹھا ابن خدا عید قیامت آئی

…سکے جی اٹھنے کی خوشیو نمیں لٹانے کیلئے
لیکے افضال خدا عید قیامت آئی

…یوں نہ دنیا میں مسرت ہی مسرت ہو آج
دور غم ختم ہوا عید قیامت آئی

…پر شب تار میں خوشیو نکے تارے چمکے
باندھے خوشیوں کی ہوا عید قیامت آئی

…وت مصلوب ہوئی غیر ہوئے شرمندہ
بدلی دنیا کی ہوا عید قیامت آئی

…الم یاس مسرت کی فضا سے بدلا
وہ ہوا لطف خدا عید قیامت آئی

…ن میں شاگردوں کے پھر دوڑ گئی زیست کی لہر
ایسی کچھ لیکے ہوا عید قیامت آئی

…یتی پھرتی تھی ہر ایک شخص کو مریم یہ خبر
جی اٹھا ابن خدا عید قیامت آئی

کیوں نہ خوش ہو کے مسرت سے مناؤں میں خوشی
میری دُنیا میں رہا عید قیامت آئی

رضا لکھنوی

نام سی۔ ایل بیلی۔ تخلص رضا۔ مشہور و معروف مسیحی شاعر جناب شفا لکھنوی کے فرزند ارجمند ہیں۔ ۲۶ جولائی ۱۹۱۹ء بمقام پرینی ضلع بجنور میں پیدا ہوئے بچپن میں شعر و شاعری کے ماحول میں رہے اس لئے شاعر ہو جانا یقینی امر تھا۔ والد بزرگوار سے اکتساب فن کیا۔ اور ان کی اصلاح سے مستفیض ہوتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد عم بزرگوار جناب رسا صاحب سے فیض حاصل کیا۔ پارکر ہائی اسکول مرادآباد میں تعلیم حاصل کی اور اسی وقت شاعری کا آغاز ہوا۔ مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہیں وزارتِ دفاع میں عرصہ تک کام کر کے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ شاعری ورثہ میں پائی ہے۔ رموزِ شعر سے واقفیت رکھتے ہیں۔ زبان میں شیرینی اور حلاوت ہے۔ قریب قریب ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

بڑا دن

مالکِ دوسرا کی آمد ہے
یعنی ابنِ خدا کی آمد ہے

ہم کو پہنچائے گا جو منزل پر
آج اس رہنما کی آمد ہے

ہر گنہگار کی ہدایت کو
بادشاہِ ہُدا کی آمد ہے

ہم کو عصیاں سے مخلصی دینے
رحمتِ کبریا کی آمد ہے

سیلِ غم سے ہمیں بچانے کو
ناخدا کیا خدا کی آمد ہے

جس نے موسیٰ کی رہنمائی کی   آج اُس پیشوا کی آمد ہے
جس کی مدحت سے پُر صحیفے ہیں   اس شہِ انبیاء کی آمد ہے
اب ہراساں نہ ہو رضا محتاج
مقصدِ بینوا کی آمد ہے

خمسہ ایسٹر

ہگارو ابنِ خدا جی اٹھا ہے   شہنشاہِ روزِ جزا جی اُٹھا ہے
انساں کا درد آشنا جی اٹھا ہے   وہ خُلد کا رہنما جی اٹھا ہے
رضا خالقِ دوسرا جی اٹھا ہے

ں ہیں یہودی ادھر آ کے دیکھیں   وہ از راہِ انصاف خود چل کے دیکھیں
سد اور تعصب سے چھپتا کے دیکھیں   سمندِ فہم اپنا دوڑا کے دیکھیں
شہنشاہِ ارض و سما جی اٹھا ہے

یقت کی منزل سے جو آشنا ہے   جو انساں کامل ہے کامل خدا ہے
ہ گار کا جس نے فدیہ دیا ہے   مجھے وارثِ خلد جس نے کیا ہے
خدا کا وہی لاڈلا جی اٹھا ہے

ٹھائی میرے واسطے جس نے ذلت   خوشی سے چکھی موت کی جس نے لذت
بخش دی جس نے جاگیر جنت   وہی تیسرے دن یہ اعجازِ قدرت
کچل کر کے نیشِ قضا جی اٹھا ہے

مرثیہ بر وفاتِ والد و اُستاد حضرت شفاؔ لکھنوی

میرے گھر سے سب مسرت کا سماں جاتا رہا
گلشنِ شعر و سخن کا باغباں جاتا رہا

ڈوب جائے گا میرا اب تو جہازِ زندگی
ہائے تھا جو پاسبانِ بادباں جاتا رہا

قفل بابِ شاعری کا کون اب کھولے گا ہائے
معنیٔ علم و ادب کا نکتہ داں جاتا رہا

ہائے اب پہونچوں گا کیسے منزلِ مقصود پر
جو نظر کے سامنے تھا وہ نشاں جاتا رہا

مرگِ والد میں مجھے اب کس طرح آئے قرار
صبر ہی دل سے رضاؔئے خستہ جاں جاتا رہا

غزل

پھر میرے ارماں کے تڑپانے کا موسم آگیا
پھر کسی کے جلوہ فرمانے کا موسم آگیا

پھر کسی کی یاد دل میں کروٹیں لینے لگی
پھر میری وحشت کے بڑھ جانے کا موسم آگیا

پھر کسی کے عشق کا چھیڑا ہے نغمہ قلب نے
پھر اُسی کی لے میں کھو جانے کا موسم آگیا

پی رہا ہے پھر شرابِ وصل کے ساغر کوئی
ہر قدم پر پھر بہک جانے کا موسم آگیا

پھر وہ اذنِ دید مجھ کو دے رہے ہیں اے رضاؔ
پھر میرے دل کے مچل جانے کا موسم آگیا

روز امرتسری

اسم گرامی فریلیس سردار مسیح اور تخلص روز ہے ۲۶ دسمبر ۱۹۱۵ء
ن امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ضلع جہلم (پاکستان) میں تعلیم حاصل کی وہیں
رک پاس کیا اور محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کر لی اب ملازمت سے
سبکدوش ہو کر شعر و شاعری میں وقت صرف کرتے ہیں۔

۱۹۴۸ء سے مستقل لکھ رہے ہیں حضرت الیاس داس صاحب
ا لکھنوی سے شرفِ تلمّذ ہے۔ اردو، ہندی اور پنجابی میں بہت قابلیت
اصل کر لی ہے۔ بچپن سے طبیعت پر مذہبی رنگ چھایا ہوا ہے اسلئے تمام شاعری
ی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اپنے مذہبی عقائد کے سخت پابند ہیں جس کا
ہار ان کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔

رگ رگ میں شاعری سمائی ہوئی ہے ہر وقت شعر و سخن میں غرق رہتے
۔ بہت زود نویس اور بسیار گو شاعر ہیں۔ غزلیں طویل ہوتی ہیں اسلئے
رد اور بھرتی کے شعر اکثر ہو جاتے ہیں نئے نئے قافیوں کی تلاش میں رہتے ہیں
دور از کار قوافی سے کام لینا پسند کرتے ہیں اکثر سنگلاخ زمینوں میں غزل
ہیں۔ زبان سے صاف پنجابی لہجہ اور تلفظ جھلکتا ہے اسی لئے بعض اوقات
ن گنجلک ہو جاتی ہے۔ مشاعروں میں بڑی گرجدار آواز کے ساتھ کلام پڑھتے
۔ کلام ہر مسیحی پرچہ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

بڑا دِن

بہارو جھوم کر آؤ مرا محبوب آیا ہے — خوشی کے ہار پہناؤ مرا محبوب آیا ہے
کہو خوش آمدید اے بلبلو حمد و ثنا گاؤ — گلوں کا پیش کش لاؤ مرا محبوب آیا ہے
ستارو ٹمٹماؤ جگمگاؤ رقص دکھلاؤ — فضا سے نور برساؤ مرا محبوب آیا ہے
گنہ گارو سیاہ کارو ادھر آؤ ادھر آؤ — سیاہی دل کی دُھلاؤ مرا محبوب آیا ہے
جگر کو تھام کے آؤ غم دل آ کے دکھلاؤ — سب اپنے زخم دُھلاؤ مرا محبوب آیا ہے
اے لنگڑو اے اندھو شفا پاؤ نہ گھبراؤ — اُٹھو مُردو بقا پاؤ مرا محبوب آیا ہے

مسیحا آگیا اے روز تم قسمت پہ اتراؤ
دیئے اُلفت کے جلواؤ مرا محبوب آیا ہے

گُڈ فرائیڈے

الم میں ہیں ڈوبے زمین و زماں آج — ہے تکلیف میں جو شۂ دو جہاں آج
ہے اک خامشی کا سماں کلوری پر — جھکا ہے زمیں پر سر آسماں آج
کھڑے سوگ میں ہیں مقدس یوحنا — عجب موڑ پر غم کی ہے داستاں آج
ہر اک شے پہ ہے آج سکتے کا عالم — جو ہیں چشم مریم سے آنسو رواں آج
نہ جانے جہاں میں یہ کیسا ستم ہے — کہ غمگین خود ہے خدائے جہاں آج
ہوئے ہیں ہم آغوش عدل و محبت — جو مصلوب ہے منجیِ عاصیاں آج

یہ کفّارہ دُنیا کے عصیاں کا ہے روز
کہ قرباں ہوئے ہیں مسیحِ زماں آج

ایسٹر

عندلیب آج گلشن میں گائے نہ کیوں   شادمانی کا مژدہ سُنائے نہ کیوں
اس کی عیدِ قیامت منائے نہ کیوں   جس نے جنّت کا دروازہ وا کر دیا

جی اُٹھا جی اٹھا جی اٹھا

جی اٹھا ہے مسیحا یہ دن پاک ہے   موت گھبرائی پھرتی ہے غمناک ہے
جسکے باعث سے شیطاں کا دِل چاک ہے   خون بیبلی سے جس کی بہایا گیا

جی اٹھا جی اٹھا جی اٹھا

جس کی رحمت کے چشمے رواں ہو گئے   جس کی تابش سے روشن جہاں ہو گئے
جس کی عظمت کے جوہر عیاں ہو گئے   آج قدرت سے اپنی وہ ابنِ خدا

جی اٹھا جی اٹھا جی اٹھا

غزل

جب کوئی بے نقاب ہوتا ہے   بزم میں انقلاب ہوتا ہے
حُسن جب فیض یاب ہوتا ہے   عشق تب کامیاب ہوتا ہے
میری آنکھوں کی شعلہ باری سے   گویا روشن شہاب ہوتا ہے
دیکھتا ہے جو مست ہوتا ہے   حسن جام شراب ہوتا ہے
آج تو لطف سے پلا ساقی   کیا خبر کب حساب ہوتا ہے

روز تو ہے تمہارا دیوانہ
اس پر اب کیوں عتاب ہوتا ہے

ریحانی لکھنوی

مسیحی شعراء کی صف میں اُستادی کا درجہ رکھنے والے، عزم و عمل کے اس شاعر کا نام نامی ایس شفاعت حسین ہنیز اور تخلص ریحانی ہے۔

پیدائش مرکزِ شعر و سخن شہر لکھنؤ کی شاعر خیز زمین میں ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ وہیں پلے بڑھے اور شاعر بنے۔ اس لئے لکھنؤ اسکول کی تمام صفات کلام میں موجود ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں۔ جب انھیں اُستاد بے بدل، شہرۂ آفاق ادیب و شاعر بے مثال دبستگانِ لکھنؤ کی واحد یادگار پدم بھوشن حضرت نواب مرزا جعفر خاں اثر لکھنوی کی شاگردی کا شرف حاصل ہے ؎

ایک ایک لفظ لعل و گہر کا جواب ہے
جب سے مرے سخن پہ نگاہِ اثر ہوئی

حضرت سید اولاد حسین شاداں بلگرامی پروفیسر اورینٹل کالج، رامپور اور پنجاب یونیورسٹی سے فارسی ادب کی تکمیل کی۔ دیگر السنہ و علوم ذاتی شوق اور مشرقی و مغربی علماء کی صحبت سے حاصل کئے۔ دین مسیحی قبول کرنے کے بعد پادری بن گئے اور تاحیات ادارۂ "زندگی کا نور" حیدرآباد کے ڈائرکٹر رہے۔

فارسی کلام پر آقائے فرخ شیرازی سے اصلاح لی۔ فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ عروض پر عبور حاصل ہے۔

حیدرآباد کے مشہور علمی مرکز سینٹ ہائی اسکول میں کئی سال تک

اردو، فارسی پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصہ سینٹ پیٹرک ہائی اسکول سکندرآباد میں
میں بھی معلّم رہے، حیدرآباد میں ہی شادی کی۔ شاعری کا شوق لڑکپن سے تھا
لہٰذا مشّاق شاعر تھے بہت سے شاگردوں نے آپ سے کسبِ فن کیا ہے۔ بیشتر
کلام غزلیات کی شکل میں ہے۔ ایک مجموعۂ کلام "موجِ گل" شائع ہوا ہے
جو ادب نواز حلقوں میں پسند کیا گیا۔ اس کے علاوہ تین گلدستے رنگِ زار
نوائے ازل۔ اور پیغامِ حیات مرتب کئے۔ آخر الذکر پر یوپی اردو اکیڈمی نے
انعام سے نوازا۔ ۱۲؍ اگست ۱۹۷۶ء انتقال فرمایا۔

اُردو ادب کی خدمت آپ کا مشغلہ تھا۔ نثر میں مذہبی عنوانات پر
مقالے قلمبند کئے ہیں۔ تمام کلام نہایت پاکیزہ ہے۔ روایتی شاعری سے ہر جگہ گریز
کیا ہے۔ زبان میں لکھنؤ کی نزاکت و حلاوت ہے۔ بحریں مترنّم اور رواں ہیں
طبیعت کو تصوّف سے شغف ہے اس لئے عرفان و تصوّف کے بلند پایہ اشعار
دل نشیں ہو جاتے ہیں۔ کلام میں فصاحت و بلاغت۔ صنائع و بدائع۔ تشبیہہ و
استعارات سے بڑے حسین انداز میں کام لیا ہے یہ چیزیں دراصل شاعری کا
زیور ہیں لیکن ان کا بے قاعدہ استعمال شعر کے حسن کو ضائع کر دیتا ہے مگر جب
یہی خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کی جائیں تو عروسِ سخن بن جاتی ہیں۔

جگہ جگہ اخلاقیات کی تعلیم بھی ہے شاعری کا مرکز انسان دوستی، محبت
و اُلفت اور ترغیبِ عمل ہے۔ ان کو شاعرِ انسانیت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا
کلام محض تفنّنِ طبع کے لئے نہیں ہے۔

علّامہ مفتوّن کوثوی فرماتے ہیں۔ "جناب ریحانی کی پاکیزگی، شائستگی

اور ان کے فکر و نظر کی بلندی و خوش ذوقی، زبان، بیان کی نفاست و ز
طہارت و نزاکت کے ساتھ اپنے اوج پر ہے۔

اُن کے استاد حضرت اثر لکھنوی نے بجا ارشاد فرمایا ہے۔

"جناب ریحانی کے خیالات میں علو اور اسلوب میں انفرادیت ہے
اور وہ حقیقت کو زیور شاعری سے آراستہ کر کے ایک پیکرِ حُسن و جمال بنا
دیتے ہیں۔"

کلام تغزّل، کیف و اثر و جذبات نگاری سے پُر ہے۔ لطفِ زبان
شگفتگی، سلاست، روانی، صفائی، حُسنِ الفاظ، بندش کی دلآویزی۔
تراکیب کی چُستی۔ اسلوب کی شُستگی سب کچھ موجود ہے۔

مقطع میں تخلص سے خوب کام لیتے ہیں اور تخلص کی پوری رعایت
رکھتے ہیں ؎

ریحانی کیوں خزاں کا نہ اسکو گمان ہو　　پھولوں سے جو بہار میں نا آشنا رہے
چمن میں آج ایسا انقلاب آیا ہے ریحانی　　ہمارے زخمِ دل کو وہ گلِ خنداں سمجھتے ہیں

فارسی زبان پر کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ حیدر آباد میں بزمِ سعدی
کے فارسی مشاعروں کی روحِ رواں تھے اور فارسی داں ان کو اُستاد تسلیم
کرتے تھے۔ ●

بڑادن

نمونۂ کلام

چلتا ہے اُلفت کا ساغر　　لے تو بھی ریحانی بڑھ کر
بیت لحم کی ایک چرنی میں　　نور فزا کونین کا داور

فرش پہ آیا عرش کا وارث — دُنیا والے سمجھیں کیونکر
ہستی عیسیٰ رُوحِ اللہ — پرکھیں جانچیں اہلِ جوہر
اس کی یاد عبادت اپنی — اپنا سجدہ سجدۂ اکبر
اس کی محبت کا یہ سودا — ارزاں تر بھی اور گراں تر
رُوح کی آزادی کر حاصل — ہو کے شریعت سے بالاتر
وہ ہی عالم کا بخشندہ — کیسا مومن کیسا کافر
عیسیٰ کا جشن پیدائش — کیوں نہ منائیں باہم مل کر
اس تقریب خوش خبری میں — ایک غزل پڑھتا ہے سخنور

کلوری

ا مجھے نہ سمجھے ہم تو رازِ کلوری سمجھے — کسی کے واسطے مرنے میں اپنی زندگی سمجھے
نے دل کی اک اک ٹیس پہ ہنستے ہیں اے ہمدم — کوئی کیا بزمِ عالم میں ہماری دل لگی سمجھے
ا ہو ہم سے یارب تیری کس کس دین کا احسا — دیا اتنا فقیری میں کہ نہ اس کی کمی سمجھے
کے حوالے کر دی ہم نے زندگی اپنی — اب اس کا حشر کیا ہوگا وہی جانے وہی سمجھے

محبت کے گلستاں میں بہاریں آئیں رت آئی
پیامِ موت کو جب ہم پیامِ زندگی سمجھے

فارسی کلام۔ غزلیں

غ نقشِ محبت بر آبِ جو کردم — بتارِ رشک شگافِ دلم رفو کردم
رخانہ بمژگاں چو رفت رو کردم — ببادہ خرقۂ آلودہ شست و شو کردم

عجب مدار کہ در جوشِ دوستداریِ او — تمام کافر و دیندار را عدو کردم
بپرس از منِ آزاد حُرمت عصیاں — ہمیشہ نوشِ مئے ناب با وضو کردم
عجیب معجزہ ای در سفر ہویدا شُد — ز راہِ کعبہ رہِ دیر جستجو کردم
چگونہ می دہم الزام زلف پیچاں را — من اعترافِ خطایم چو مو بمو کردم
خدا گواہ کہ بر سر خوشی ندارم کار — برائے صحبتِ ساقی بباد ہ خو کردم
خزاں بزنگ بہاراں چوں بود ریحانی — فریب خوردہ تمنائے رنگ و بو کردم

(۲)

ایں چہ خاریست کہ در راہِ بقامی بینم — خونِ پا شوخ تر از رنگِ حنا می بینم
بر چنیں شاہرہے می روم از ہمت خویش — کہ بہر مرحلہ تغیر قضا می بینم
ساقیا بادۂ اخلاص دلم می طلبد — در خرابات مگر جامِ ریا می بینم
عجب آئینہ دل ہست کہ در صیقل او — ہر قدر سعی کنم بیش ترا می بینم
اینقدر بر گناہ احساسِ گنہ افزود است — کوتہ از بابِ کرم دستِ دعا می بینم
حیرتی نیست کہ از کفر نہ کردم توبہ — ہر درِ بتکدہ را قبلہ نما می بینم
پایم از حلقۂ زنجیر ندارد باکے — زانکہ بر دوشِ خود آں زلفِ رسا می بینم
حُرمت دیر و حرم پیشِ نظر ہست ولے — سجدہ جز سنگِ درِ یار خطا می بینم

تکیہ بر عہدِ بہاراں نکنم ریحانی
کہ گلستاں ہمہ پامال صبا می بینم

ساحل لدھیانوی

اسم گرامی الفریڈ گوپال سنگھ ہے۔ ساحل تخلص کرتے ہیں ۱۴ر جنوری ۱۹۳۸ء
لائل پور (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ تقسیم وطن کے بعد لدھیانہ آگئے اور وہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔ میٹرک کا امتحان اردو، فارسی کے ساتھ پاس کیا۔
۱۹۵۲ء سے شعر کہتے ہیں۔ اکثر ریڈیو جالندھر سے آپ کی کہانیاں اور فیچر نشر ہوتے ہیں۔ کرسچین میڈیکل کالج لدھیانہ میں ملازمت کرتے ہیں۔ عدیم الفرصتی کی وجہ سے کم لکھتے ہیں۔ اگر کسی اُستاد کا دامن تھام لیں تو فیض یاب ہو سکتے ہیں۔

نمونۂ کلام :-

تمجیدِ مسیحا

چھوڑ کر ابنِ خدا تو آ گیا — مژدۂ جاں بخش بن کر چھا گیا
زندگی مایوس تھی حالات سے — زندگی کو مسکرانا آ گیا
رحمتوں کا ہے یہ عالم کہ عدو — طرزِ اُلفت دیکھ کر شرما گیا
ہو گیا حاصل اسے ابدی سرور — در پہ تیرے جو مسیحا آ گیا
مل گئے تم تو ہوا محسوس یوں — جام جیسے جام سے ٹکرا گیا

غوطہ زن تھی کشتیٔ عمرِ رواں
فیضِ عیسیٰ کھینچ کے ساحل آ گیا

بڑا دن

داغ عصیاں کا مٹانے ابنِ مریم آگئے
دہر میں خوشیاں لُٹانے ابنِ مریم آگئے

زندگی پر چھا گئیں جب یاس کی پرچھائیاں
آس کا جلوہ دکھانے ابنِ مریم آگئے

عاشقانِ قوم و ملت ہوگئے بدحال جب
قوم کی بگڑی بنانے ابنِ مریم آگئے

آدمِ خاکی کو حاصل ہو متاعِ زندگی
خون سُولی پر بہانے ابنِ مریم آگئے

محو ہے تیری ثنا میں آج ساری کائنات
ہم بھی ایک نغمہ سُنانے ابنِ مریم آگئے

کشتیٔ انسانیت تھی موت کے گرداب میں
اس کو اے ساحلؔ بچانے ابنِ مریم آگئے

غزل

ابنِ خدائے پاک کو پہچان جائیے
سوئے صلیب دیکھئے اور جان جائیے

اس دورِ بے ثبات سے ہو جائیے فرار
کچھ عاقبت کی سوچئے اور مان جائیے

عمرِ دراز عیش میں کرتے رہے بسر
کچھ تو لحد کا لیکے بھی سامان جائیے

توما کی طرح آپ نہ مشکوک ہوں کبھی
عیسیٰ کی طرح جان سے قربان جائیے

سجدہ طراز ہو کے بھی ساحلؔ کو دل فگار
دیکھا ہے ہم نے آپ کا ایمان جائیے۔

غزل - وطنی

یہ مانا کہ دُنیا بہت دِل نشیں ہے
وطن کی زمیں پھر وطن کی زمیں ہے

ہنسا کی تاریخ لکھی ہے ہم نے
ہمارے ہی دم سے یہ دُنیا حسیں ہے

ذرا دُشمنانِ وطن سے یہ کہہ دو
یہاں سرفروشوں کی قلت نہیں ہے

چلیں کیوں نہ گلہائے رنگیں چمن میں
کہ خونِ شہیداں زمیں در زمیں ہے

خدارا نہ ساحلؔ کو وہ یاد آئیں
ابھی تو محبت کی فرصت نہیں ہے

غزل

اگر تم دیکھنا چاہو کبھی جلوہ مسیحا کا
خلوصِ دل سے بس کافی ہے اک سجدہ مسیحا کا

بنا کر صورتیں لاکھوں مٹائیں جب مصوّر نے
ڈھلا تب نور کے سانچے میں یہ پتلا مسیحا کا

ہیں مُردن کھلی ہیں دونوں آنکھیں اِس تمنّا میں
نظر آ جائے تربت میں کہیں جلوہ مسیحا کا

اٹھو تم اے مسیحی نوجوانو اور دکھلا دو
تمہارے عزم سے ہر گھر میں ہو چرچا مسیحا کا

اٹھو اور اُٹھ کے تم اسلاف کے کردار دکھلا دو
جہاں والوں کو پھر معلوم ہو رتبہ مسیحا کا

اسی اُمّید پہ موجوں سے ٹکراتا رہا ساحلؔ
کہ شاید دیکھ لوں بڑھ کر قدِ زیبا مسیحا کا

شاد بنگسن آبادی

اسم گرامی جیکب ڈین۔ تخلّص شاد۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں بنگسن آباد (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار نواب الدین بنگسن آباد کے زمیندار تھے۔ بعد تقسیم آپ نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا اب چمبہ ہماچل پردیش میں مستقل جائے سکونت بنالی ہے۔

مرے کالج سیالکوٹ سے اردو، فارسی لیکر بی۔اے پاس کیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران سنہ ۱۹۴۰ء تا سنہ ۱۹۴۴ء فوج میں رہے۔ اور غیر ممالک میں جا کر فوجی خدمات انجام دیں۔

سنِ شعور سے اردو زبان کے شیدائی ہیں۔ حضرت رسؔا لکھنوی کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے۔ اُستاد نے آپ کو شیریں سخن کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اور تخلّص بھی اُستاد کا عطیہ ہے۔

شاعری کی محرک آپ کی ناکام محبّت ہے جس کے سبب سے کلام میں ایک خاص قسم کا درد پایا جاتا ہے۔ خود آپ کے الفاظ میں" اسکول سے ہی مجھے ایک لڑکی زینت سے محبّت تھی وہ حسن و جمال اور علم و فہم کی جیتی جاگتی تصویر تھی وہ میری زندگی پر ایسی چھا گئی کہ آج تک میری ہے۔ والد صاحب نے میرے احساسات کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اور خاندانی جھگڑوں کی آڑ لیکر میری محبّت کی مخالفت کر کے مجھے اُس کو بھلا دینے کی ناکام ترکیب نکالی۔ وہ ناکامیِ محبّت کی تمام صعوبتیں

برداشت کرتی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ یہ اُسی پیار کا نتیجہ ہے کہ مَیں شاعری میں محبّت کا اصلی رنگ بھر سکا۔ مَیں نے کبھی عاشق و معشوق کو جُدا نہیں پایا۔ میرا عقیدہ ہے کہ حقیقی محبّت میں جو عاشق پر بیتتی ہے وہی معشوق پر بھی گذرتی ہے۔ اس خیال کا اظہار مَیں نے جگہ جگہ اپنی غزلوں میں کیا ہے۔ ؎

دیکھے بغیر چین تھا کس کو ہوا بھی یوں
آئے اِدھر وہ دیکھنے تو ہم اُدھر گئے

کلام نعتیہ اور عاشقانہ ہے۔ جگہ جگہ وارداتِ قلب کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن گہرائی اور گیرائی کا فقدان ہے۔

غزل

مجھ کو اے ظالم ستانا چھوڑ دے
غیر کے چھپ چھپ کے جانا چھوڑ دے

ہوگئے ہیں محو سب صبر و قرار
اپنے عاشق کو ستانا چھوڑ دے

اشتیاقِ دید بڑھ جاتا ہے اور
مُنھ دکھا کے پھر چھپانا چھوڑ دے

سَاقیا آنکھیں مِلا مدہوش کر
مجھ کو سَاغر سے پلانا چھوڑ دے

لُٹ گئے ہیں اس گلی میں سینکڑوں
دل وہاں کا آنا جانا چھوڑ دے

ہوتی جاتی ہے بہت تاریک رات
رُخ پہ زلفوں کا گرانا چھوڑ دے

ایک دِن بدنام ہو جائے گا توٗ
غیر سے دِل کا لگانا چھوڑ دے

وہ نہ مانا، غیر کہتے رہ گئے
شاد سے مِلنا مِلانا چھوڑ دے

غزل

چلمن اُٹھا کے ناز سے پھر ایک بار دیکھ
الفت میں تیری پھرتا ہوں دیوانہ وار دیکھ

اے دل جمالِ یار کے نقش و نگار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

کرتی ہیں وہ بھی میری طرح آہ و زاریاں
گلشن میں بلبلیں ہیں میری ہمکنار دیکھ

اے شاد زندگی کا تیری اعتبار کیا
ناداں ہے چند روز کی فصلِ بہار دیکھ

توصیفِ مسیحا

سچ یہی ہے کہ دونوں عالم کی
ابتدا انتہا مسیحا ہیں

چارہ سازوں کو ڈھونڈنے والو
ہر مرض کی دوا مسیحا ہیں

میری کشتی کو خوف ہو کیونکر
جب مرے ناخدا مسیحا ہیں

عرفان

دل جو غم کے تیر کھاتے کھاتے بسمل ہو گیا
پھر ریاضت اور عبادت کے وہ قائل ہو گیا

چرندوں اور پرندوں سے طریقہ سیکھ عبادت کا
ثنا خوانی خدا کی کر رہے ہیں بے زباں ہو کر

منظر تجلیوں کے نظر آئے بارہا
جب سے جھکی جبیں میری اسکے حضور میں

شاطرؔ بھرواری

اسم گرامی عمانوئیل خاں، تخلص شاطرؔ ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء فرخ آباد میں پیدا ہوئے، پندرہ سال کی عمر میں شاعری کا شوق ہوا۔ حضرت نادرؔ شاہجہانپوری کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے۔ ۸ اگست سنہ ۱۹۷۴ء عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔

کلام صاف اور سلیس ہے زبان سُلجھی ہوئی ہے کلام میں نادری رنگ نظر آتا ہے۔ مذہبی اعتقادات و تلمیحات کو بڑے حسن و خوبی کے ساتھ نظم فرمایا ہے منظر کشی کے بھی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ تخیّل کی بلند پروازیاں بھی پائی جاتی ہیں اکثر موقعوں پر غیر فصیح الفاظ استعمال کر جاتے ہیں۔

توصیفِ مسیحا

لّی کرم مسیحِ دو عالم کا مل گیا
ورنہ بشر کی ذات تھی اک خار کی طرح

زم صمیمِ عشقِ مسیحا میں ہے یہی
کاٹیں گے ساری عمر وفادار کی طرح

بیسے بہارِ خلد قدم چومنے چلی
صحرائے خار زار ہے گلزار کی طرح

رب جھنجھوڑنے صدمۂ پیہم مجھے دیئے
پھولیں پھلیں وہ نخلِ ثمردار کی طرح

شاطرؔ چہکتے رہتے تھے پہلے تو ہر گھڑی
اب کیا ہوا جو رہتے ہیں بیمار کی طرح

بڑا دِن

تولّد ہو رہے عیسیٰ جا رہا تھا
فلک سجدے میں جُھکتا جا رہا تھا
شب بیت لحم تھی کتنی پیاری
کہ جب نورِ خدا خود آ رہا تھا
خوشی تھی باپ کو بیٹے کی اتنی
فلک سے مغفرت برسا رہا تھا
ہوائے شب کا ہر ہلکا سا جھونکا
فضا میں گنگناتا جا رہا تھا
زمیں پر آشتی گردوں پہ رحمت
فلک پر گیت گایا جا رہا تھا
گڈریے چل دیئے سجدے کو فوراً
ستارہ رہبری فرما رہا تھا

گنہ گاروں کی یہ قسمت تھی شاطر
مسیحا جامِ اُلفت لا رہا تھا

گڈ فرائیڈے۔ غزل

اپنا لہو بہا کے مرا کام کر گئے
تصویرِ مغفرت میں نیا رنگ بھر گئے
میرے گناہ لے کے لحد میں اتر گئے
انصاف کی نگاہ میں معصوم کر گئے
ابنِ خدا کو نخلِ چلیپا پہ دیکھ کر
روزِ جزا کے ڈر سے عدو کیوں نہ مر گئے
عدلِ خدا حساب نہ مانگے گا اب کبھی
وہ اپنی جان دے کے مرے دام بھر گئے

شاطرؔ ہوا ہوں جب سے مسیحا کا معتقد
بگڑے تھے جتنے کام وہ از خود سنور گئے

شاکر میرٹھی

ہندوستان کا پہلا مسیحی اردو شاعر وادیب جس کو ارد و ادب نے سرآنکھوں پر جگہ دی۔ منشی پیارے لال کے نام سے مشہور ہے۔ تخلص شاکر۔ وطن میرٹھ۔ ۱۳ مارچ ۱۹۸۰ء کنکر کھیڑہ میرٹھ میں تولد ہوئے۔ اور مشن اسکول میرٹھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اردو۔ فارسی۔ ہندی۔ سنسکرت اور انگریزی زبان پر دستگاہ رکھتے تھے۔ فسانۂ عجائب۔ چہار درویش۔ الف لیلیٰ۔ شاہنامہ جیسی کتابیں بڑے شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے۔

یہ زمانہ شعر و شاعری کا تھا اسلئے اوائل عمر ہی سے شوقِ سخن پیدا ہو گیا پہلے شوکت میرٹھی کے شاگرد ہوئے اور شاعری کی پرانی روش اختیار کی۔ مگر لکھنؤ پہونچکر حضرت احمد علی شوق قدوائی لکھنوی کے شاگردوں میں شامل ہو گئے اور پرانی روش سے کنارہ کشی اختیار کر کے قدرتی مناظر اور روز مرہ کی چیزوں پر نظمیں لکھنے لگے: بچوں کیلئے بہت سی نظمیں اور مضامین قلم بند کئے جو درسی کتابوں میں شامل ہوئے۔

آپ کا شمار اردو کے ممتاز صحافیوں اور ادیبوں میں ہوتا تھا آپنے ممتاز اور مقتدر رسالوں کی ادارت فرمائی۔ ہفتہ وار تحفۂ سرحد اپنا ذاتی رسالہ العصر۔ زمانہ کانپور۔ ریاست ہنج۔ ادیب۔ استقلال اور بچوں کی دنیا قابلِ ذکر ہیں۔ تالیفات و تصنیفات وتراجم کی تعداد کثیر ہے ان میں برکاتِ سلطانی

وفا کا پُتلا - حدیقۂ اخلاق، تاجِ شہادت - بالشتوں کی سرزمین - ہونہار لڑکا
چاند کی بیٹی - کتھا سرت ساگر - رابندر ناتھ ٹیگور - حالات سرسید، ٹالسٹائی
کے افسانے - ایجادات و انکشافات - اکسیرِ سخن - مفید ایجادات کی کہانیاں
دیوزادوں کا ملک اور شکنتلا و میگھ دوت، رتو سنگار کے منظوم ترجمے بہت
مشہور ہوئے۔

الہ آباد میں انڈین پریس سے منسلک تھے اور بہت سی درسی کتابیں
تصنیف و تالیف کیں - آپ کو ادیب العصر اور لسان الہند کے خطابات سے نوازا
گیا - حکومت بھوپال اور حیدرآباد اور مہاراجہ کشن پرشاد بہادر ہمیشہ آپ کی
معاونت فرماتے رہے - سرکار ہند نے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا تھا
زندگی کے آخری ایام بہت عسرت اور مفلسی میں بسر ہوئے - فرمایا ہے۔ ؎

ساتھ پیری میں سب نے چھوڑ دیا
عمرِ رفتہ بھی ہم سفر نہ ہوئی

۲۰ فروری ۱۹۵۶ء میں وفات پائی اور دہلی کے پہاڑ گنج قبرستان میں دفن
ہوئے - مرنے سے پہلے فرمایا تھا۔ ؎

دوستو عشقِ مسیحا میں تمہیں کرکے سلام
حشر تک سوتا ہوں بس اب نہ جگانا مجھ کو

آپ کی وفات پر متعدد شعرا نے مرثیے کہے اور تاریخ نکالی۔
کچھ معترضین کا کہنا ہے کہ شاکر صاحب شاعر نہیں تھے یہ بات سراسر غلط
اور بے بنیاد ہے - شاعر صاحب بہت خوش گو شاعر تھے - گو انہوں نے نثر میں

زیادہ زورِ قلم دکھایا ہے۔ حقیقت میں وہ اردو ادب کے محسن اور عظیم فنکار تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر حیدرآباد نے اکسیر سخن پر منظوم تبصرہ فرمایا۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔ ؎

پیارے شاگرد شاعر جادو بیاں — شاد رکھے حق تعالےٰ جاوداں
کیسی ہے اکسیرِ اکسیرِ سخن — کیمیا ہے درحقیقت مہرباں
ہے رتو سنگار کا یہ ترجمہ — ہے ہر اک موسم کا بہتر ارمغاں
کسقدر ہے پاک و پاکیزہ خیال — کسقدر ہے پاک اور پیاری زباں
ہے مشبّہ کی کہیں تشبیہہ نام — استعاروں کی کہیں رنگینیاں۔
بزم میں کم ہو نظامی کے شریک — رزم میں، فردوسیِ شیریں زباں

علامہ کیفی چریاکوٹی ؎

الفاظ و معنی کا ہے پیمانہ بھی — دریا بھی ہے یہ صدف بھی دُردانہ بھی
شاگر کے کمال نے دکھایا ہے کیفی — یہ ہوش بھی ہے ساقیِ میخانہ بھی

آپ نے سُخن کی ہر صنعت پر طبع آزمائی کی ہے۔ فن پر قدرتِ کاملانہ رکھتے ہیں۔ زبان سلیس با محاورہ۔ شُستہ اور پاکیزہ ہے طرزِ ادا اور نُدرتِ بیان نہایت حسین ہے۔ لطیف تشبیہات و استعارات۔ صنائع بدائع سے کلام مُزیّن ہے۔ خیال کی پاکیزگی و تخیّل کی بلند پروازی بے مثال ہے۔ نیچرل شاعری میں خاص ملکہ ہے۔ رُباعی کہنے میں اُستادانہ قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا شمار اچھے رُباعی گو شعراء میں ہوتا تھا۔ جذبات نگاری میں کمال حاصل ہے۔ حبّ الوطنی پر بھی بڑی اعلےٰ نظمیں کہی ہیں۔ ●

کتابِ مقدّس

اے کلامِ بے مثال و لاجواب
اے خدائے پاک کی سچی کتاب

عکس تیرا دافعِ ظلماتِ کفر
نور تیرا رَوکشِ صد آفتاب

تشنگانِ راہِ حق کے واسطے
ایک نسخہ ہے پئے صد اضطراب

تو ہے پھاہا زخمِ دل کے واسطے
چشمۂ شیریں ہے تو زیرِ سحاب

تیری خوشبو سے معطر ہے جہاں
ہے ریاضِ قدس کا گویا گلاب

ہے بھرے تجھ میں جہاں کے علم و فن
اے کلامِ حق تو ہے اُم الکتاب

سو زباں ہے ایک خاموشی تیری
سینکڑوں دفتر ہے تیرا ایک باب

ہے جہاں میں تیری ہی ضوگستری
ہے تو ہی صدق و صفا کا ماہتاب

تو نے واہم پر درِ جنت کیا
تو نے دکھلائی ہمیں راہِ ثواب

وصف ہو تیرا رقم ممکن نہیں
ہیں تیرے اوصاف بے حد و حساب

توصیفِ مسیحا

طبیبِ معنوی صوری مسیحا
دوائے دردِ مہجوری مسیحا

منور کر مرے تاریک دل کو
دکھا دے جلوۂ نوری مسیحا

تو مہرِ صدق ہے میں بھی ہوں ذرّہ
نہیں ہے تابِ مستوری مسیحا

مجھے نو زادگی تو نے عطا کی
مری حاجت ہوئی پوری مسیحا

تمنّا ہے کروں میں تیری خدمت
عطا ہو اس کی منظوری مسیحا

کرم کر اب بڑھی جاتی ہے حد سے
تیرے شاکر کی معذوری مسیحا

غزل

عصیاں سے آب آب ہوں وہ خاکسار ہوں پانی سے دب رہا ہوں وہ مشتِ غبار ہوں
بندہ ہوں وہ ترا کہ نہ کی بندگی تیری میرے گناہ بخش دے میں شرمسار ہوں
مجھ کو جمالِ پاک دکھا دے مرے مسیح بیتابِ شوقِ دید سے ہوں بے قرار ہوں
رحمت ہے تیری عام ترا نام ہے کریم تیرے کرم کا میں بھی اک امیدوار ہوں
ہے ذات تیری منبعِ لطف و کرم مسیح کر التفات بحرِ معاصی سے پار ہوں
وہ کشتیِ نجات تو ہے جس کا ناخدا میرے زہے نصیب کہ اس پر سوار ہوں

ہے شکر کی جگہ کہ ہوں خادم مسیح کا
شاکر نگاہِ خلق سے ہر چند خوار ہوں

غزل — بڑا دن

شفیعِ جہاں آج پیدا ہوا ہے شہِ مرسلاں آج پیدا ہوا ہے
ہوئی جس سے روشن یہ تاریک دُنیا وہ نورِ جہاں آج پیدا ہوا ہے
ستارہ چمک اٹھا بیت لحم کا مسیحا وہاں آج پیدا ہوا ہے
خوشی ہر طرف ہے زمین و زماں میں شہِ این و آں آج پیدا ہوا ہے
عنایت یہ فرزندِ یزداں کی دیکھو پئے عاصیاں آج پیدا ہوا ہے
ملائک سے مژدہ شبانوں نے پایا شہِ عز و شاں آج پیدا ہوا ہے
مسیحی ترانے مسرت کے گائیں مسیح الزماں آج پیدا ہوا ہے

برکھارت

دو بند از برکھارت (کالی داس)

گلوں کے عکس سے یوں سُرخ ہے کنارِ زمیں
کسی عروس کا آنچل ہو جس طرح رنگیں
یہ کالی کالی گھٹائیں یہ لطفِ منظرِ شام
ہیں سبزہ زار میں طاؤس چند مست خرام
لبھا رہے ہیں دلوں کو صدائے دلکش سے
زمیں پہ رقص کناں ہیں ادائے دلکش سے
برس گئے ہیں جو صحرا میں مینھ کے جھالے
نکل گئے ہیں کناروں سے دشت کے نالے
عجیب بوقلموں ہے فضائے بندھیاچل
ہرا بھرا نظر آتا ہے دور تک جنگل
کہیں ہوا کے ہیں جھونکوں سے جھومتے اشجار
لہک رہا کسی جانب ہے سبزۂ کہسار
کہیں ہیں بَن میں ہری دوب چر رہے آہو
کلیلیں ہیں کسی وادی میں کر رہے آہو
فضا برستی ہے صحرا میں آبشاروں پر
عجب بہار کا عالم ہے کوہساروں پر

وہ رُت جو دل لئے جاتی ہے نازنینوں کے
ہیں جن میں عشوہ و انداز مہ جبینوں کے
یہ رُت جو جانِ لطافت شجر شجر کی ہے
یہ رُت جو روحِ رواں قالبِ بشر کی ہے
یہ رُت مدار ہے جس پر نظامِ ہستی کا
یہ رُت کہ کیف ہے جسمیں فروغِ ہستی کا
یہ رُت سُہانی مبارک ہو تجھ کو او پیاری
ہر اک سال کرے تیرے ساتھ غم خواری

چند رُباعیات

دُنیا کی بلا سر سے ہٹی جاتی ہے
میعادِ اسیری کی گھٹی جاتی ہے
ہونے والی ہے قطعِ زنجیرِ حیات
جو پاؤں کی بیڑی ہے کٹی جاتی ہے

خورشید درخشاں میں جھلک تیری ہے
اور گوہر لامع میں دمک تیری ہے
ہیں کون و مکاں نور سے تیرے پُر نور
ہر ذرۂ تاباں میں چمک تیری ہے

مُرغانِ چمن نغمہ سرائی کیسی
اس پنجرے میں دادِ خوشنوائی کیسی
اک مجلسِ غم ہے آہ دُنیا شاکر
اس قید سے جیتے جی رہائی کیسی

دِل کو تری چاہ عمرِ رفتہ کب تک
دیکھیں تری راہ عمرِ رفتہ کب تک
رستے کا نشاں نہ نقشِ پا کا ہے سُراغ
ڈھونڈیں تجھے آہ عمرِ رفتہ کب تک

غزل

کس طرح عرضِ حالتِ دردِ جگر کریں
ممکن نہیں فسانۂ غم مختصر کریں
رازِ جنونِ غم کا نہیں رازداں کوئی
ظالم کو اپنے حال کی کیونکر خبر کریں
ابتک وہ مُنکرِ اثرِ جذبِ عشق ہیں
شاید وہ اعتراف ہمیں دیکھ کر کریں
آنکھیں ہیں جنکی جلوۂ رعنا کی منتظر
آنکھوں کو میرے واسطے ہرگز نہ تر کریں
وہ باخبر نہیں غمِ فرقت کے راز سے
جو لوگ شامِ غم میں امیدِ سحر کریں
اب بیخودیٔ عشق نے سب کچھ بُھلا دیا
ممکن کہاں کہ آپ کو اپنی خبر کریں
ہے آشیاں کو وجہ تباہی نگاہِ برق
بہتر یہی ہے اب وہ مجھ پر نظر کریں
تڑپا کئے ہیں صدمۂ فرقت میں رات بھر
کس آرزو کو وقفِ دُعائے سحر کریں
دُشوار ہے کہ ہم سے ادا فرضِ عشق ہو
شاکر کسی کا شُکر اگر عمر بھر کریں

شفا لکھنوی

اسم گرامی اے آر بیلی تخلص شفاؔ۔ والد محترم کا نام پہلے الیشور داس تھا لیکن مسیحی ہو جانے کے بعد اسے عیسیٰ داس سے بدل لیا۔ اور ۱۸۸۶ء میں وطن متھرا چھوڑ کر سیالکوٹ کے موضع خمزہ گوش بلبلے دی بیری (پاکستان) میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۱۳ء میں ملکی فوج نے آپ کو تبلیغ کے لئے یورپ بھیجا۔ واپسی پر تبلیغ مذہب کے کام میں مشغول رہے۔ آپ کے دو فرزند ہوئے حضرت شفاؔ اور حضرت رساؔ۔

شفاؔ صاحب، فرزند اکبر تھے جو ۸ جنوری ۱۸۶۲ء بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ اور وہیں بچپن گذارا۔ والد محترم سے اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ والد بزرگوار کی تربیت میں دونوں بیٹوں نے نام پیدا کیا۔ ان دنوں گھر گھر شاعری کا چرچا تھا۔ والد خود شاعر تھے اسلئے بچوں کو بچپن سے ہی شوقِ شاعری پیدا ہو گیا۔ آپ نے علم الٰہیات حاصل کیا اور پادری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ذاتی شوق و محنت سے اردو، فارسی میں بہت قابلیت پیدا کی۔

ابتدا میں حضرت فلکؔ سے رجوع کیا بعد میں حضرت عطاؔ بدایونی، وسیم خیرآبادی اور دلؔ شاہجہانپوری سے فیض حاصل کیا۔ آخر میں جناب افضل علی افضل خان بہادر خلفِ رشید جناب اسیرؔ لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا اور استادی کا مرتبہ پایا۔ ریاست شیر کوٹ کی سرکار سے افسر الشعراء کا اعزاز اور بزمِ بہارِ سخن شیر کوٹ سے شیریں سخن کا خطاب عطا ہوا۔ متعدد مسیحی اور غیر مسیحی شعراء نے آپ سے فیض حاصل کیا۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۵۲ء دہلی ریلوے اسٹیشن پر حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کیا۔ اور دہلی کے مسیحی قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کی وفات پر بہت سے شعرا نے مرثیے کہہ کر عقیدت کے پھول چڑھائے۔

آپ کی تصنیفات میں مثنوی قہر عشق۔ خونِ ناحق۔ قوم کی فریاد، قصہ ہری داسی منظوم اور پانچ غیر مطبوعہ دیوان شامل ہیں۔ نثر کے میدان میں بھی زورِ قلم دکھایا ہے۔ رسالہ دیس ہتکاری اور روشنی کے مدیر رہے۔ فغانِ ہند المعروف سیلابِ عظیم اور آئینِ شعر و شاعری۔ نثر میں قابلِ قدر تصنیفات ہیں جو نایاب ہیں ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بیشتر کلام نعتیہ اور حقانیہ زبان میں صفائی و سلاست ہے۔ کلام میں فصاحت ہے ترکیبیں چست اور دلآویز ہیں۔ اشعار میں تغزل ہے۔ انجیل شریف کے حقائق کو بڑی چابکدستی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ہندی میں بھی کچھ بھجن لکھے ہیں۔

بڑا دن

یہ انعامِ طرب پانے کے دن ہیں — شہِ ابرار کے آنے کے دن ہیں
گنہگارو نویدِ جانفزا ہے — شفیعِ حشر کے آنے کے دن ہیں
ندامت کے لئے آتی ہے بخشش — خطا کارو یہ شرمانے کے دن ہیں
مسیحا کی ہے ہر سو آمد آمد — جہاں سے کفر مٹ جانے کے دن ہیں
مئے عرفاں ساقی بانٹتا ہے — پیو کہ دورِ پیمانے کے دن ہیں

شفا آزارِ عصیاں سے نہ گھبرا
مریضوں کے شفا پانے کے دن ہیں

توصیفِ مسیحا

مدّاح ہوں ازل سے میں اس پاک ذات کا
بخشا ہے جس نے خاک کو رُتبہ حیات کا

اللہ کے جو ساتھ ازل میں کلام تھا
ہے آفریدگار وہی کائنات کا

حمدِ خدا میں چاہیئے انساں لگا رہے
کیا اعتبار زندگیِ بے ثبات کا

تیرے لئے وہ دہر میں آکر بشر بنا
مالک ہے اے شفاؔ جو حیات و ممات کا

صلیب

غیروں نے کب یہ درد اٹھایا صلیب پر
جیسا کہ دُکھ مسیح نے پایا صلیب پر

کیسا ستم ہے جو کہ تھا فخرِ زندِ کبریا
ٹھٹھوں میں سب نے اسکو اڑایا صلیب پر

اُف دست و پا میں کیلیں مسیحا کے ٹھونک کر
دو ڈاکوؤں کے ساتھ چڑھایا صلیب پر

عیسیٰ ناصری یہی شاہِ یہود ہے
یہ جُرم اس کا لکھ کے لگایا صلیب پر

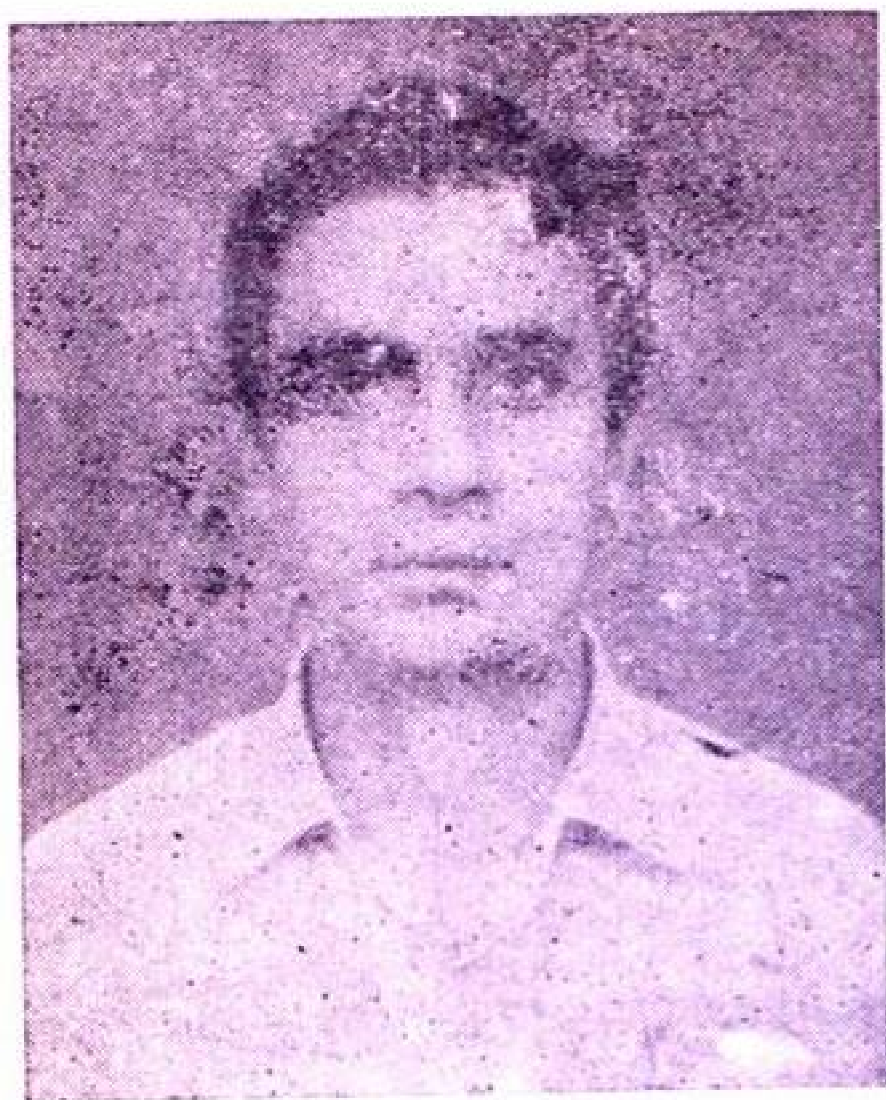
کپڑوں کو اسکے بانٹ لیا قرعہ ڈال کر
اعدا نے خوب شر کو ستایا صلیب پر

ہر اک بشر کو چاہیئے اس پر عمل کرے
جو صبر ابنِ حق نے دکھایا صلیب پر

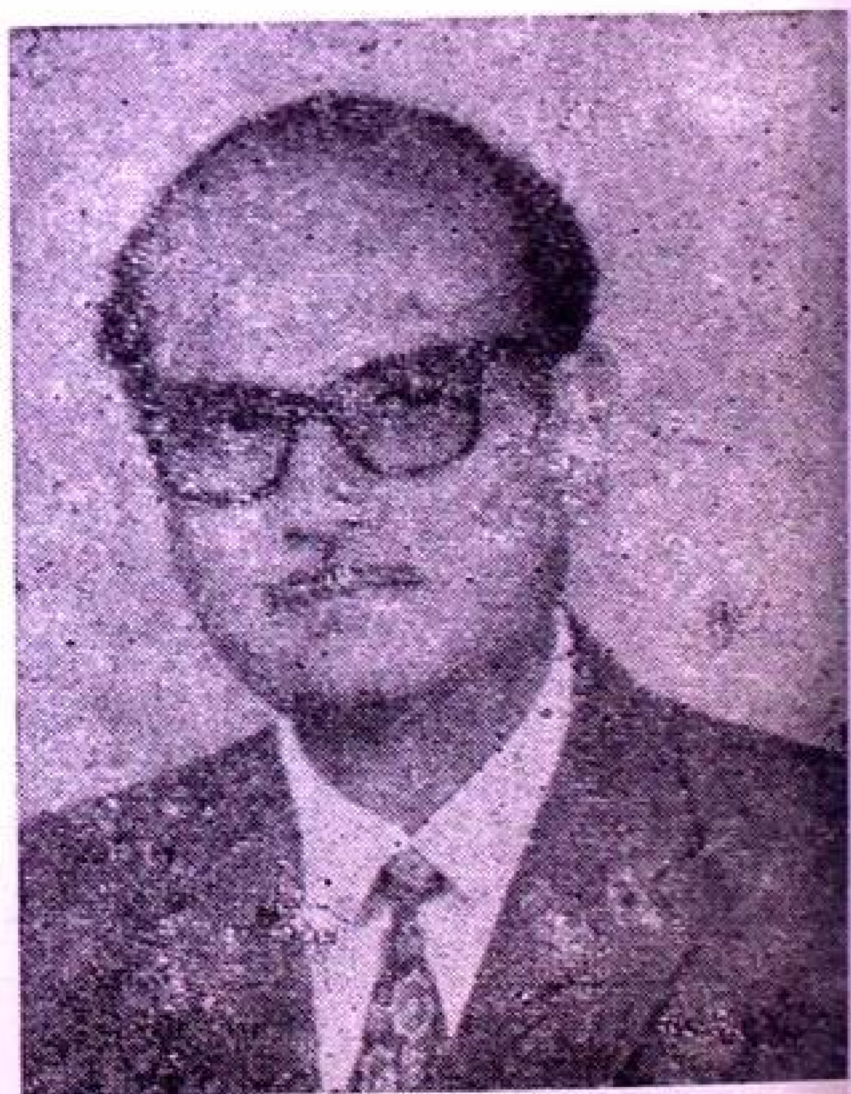
جلکھ کر شفیعِ حشر نے اس کو نہیں پیا
جو پت ملا کے بادہ پلایا صلیب پر

دُشمن کو اپنے پیار کرو دو دُعائے خیر
ہم کو مسیح نے یہ سکھایا صلیب پر

داغِ گناہ میرے مٹانے کو اے شفاؔ
عیسیٰ نے خون اپنا بہایا صلیب پر



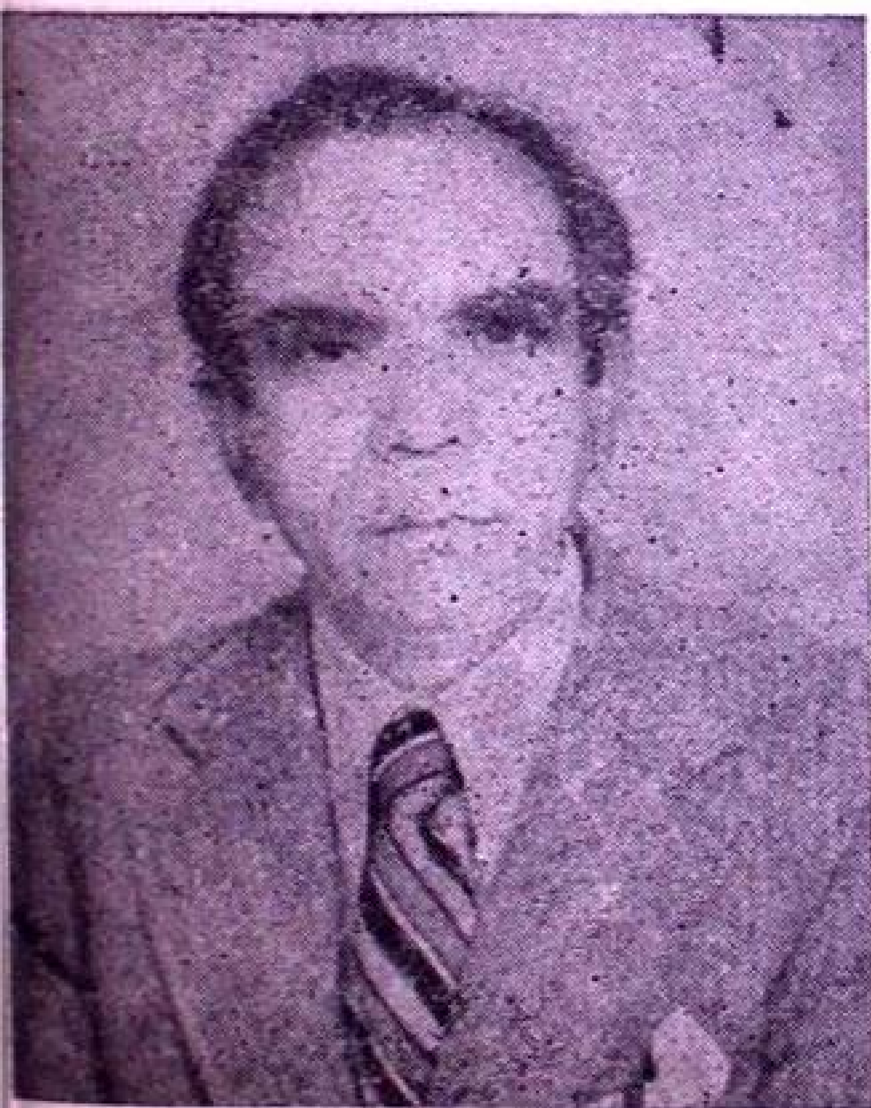
SHAUQ Page-205.



TALIB Page-213.



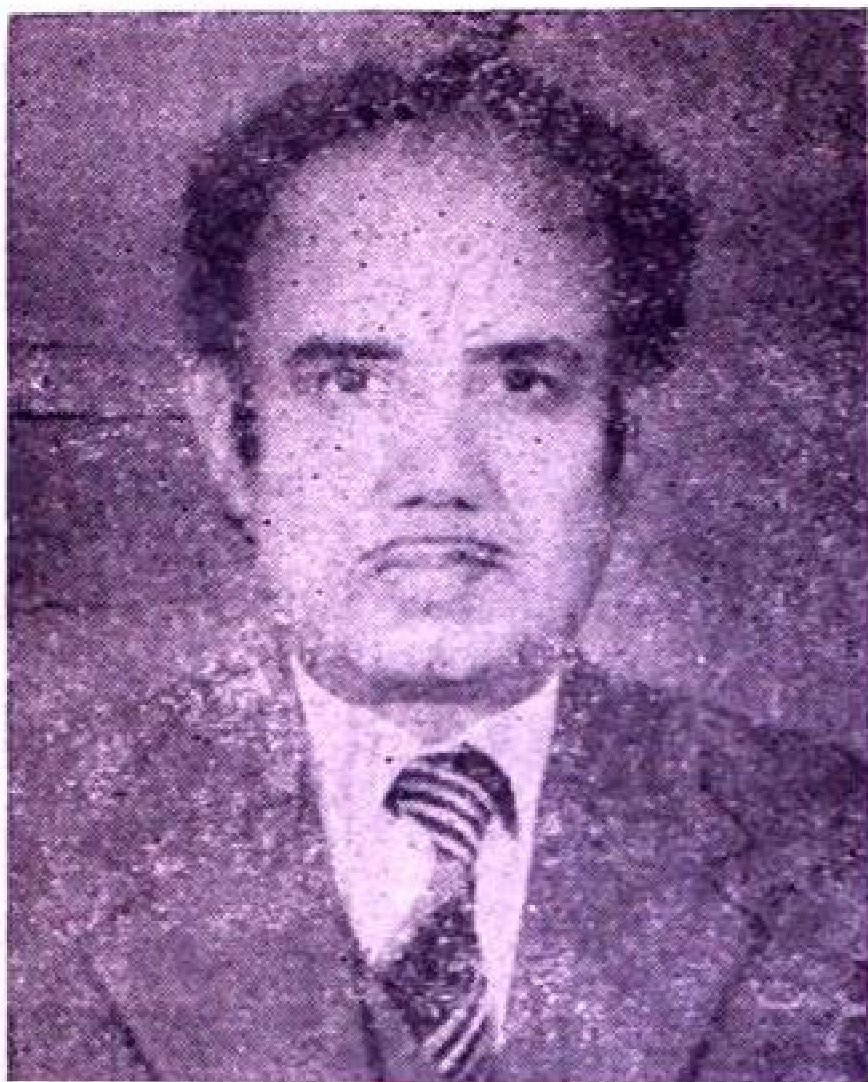
SAHIL Page-183.



FANI Page-231.



FIKAR Page-231.



RAGHIB Page-160



H.S. Rahi Page-162



FAHEEM Page-240



QUARBAN Page-242
(The Writer)



KAMIL Page-252

ایسٹر

ن کے ملحد تھے پریشاں یہ خبر تیسرے دن
ہوت پر پائی ہے عیسیٰ نے ظفر تیسرے دن

ے جب انہیں ہوا شہ کا گذر تیسرے دن
خوش ہوئے دیکھ کے ارباب نظر تیسرے دن

اٹھا ابنِ خدا توڑ کے ایوانِ لحد
پھیلی عالم میں حیات افزا خبر تیسرے دن

اٹھا اپنی نبوت کے مطابق آخر
نہ رہا قبر میں وہ فخرِ بشر تیسرے دن

میرا ایماں یہ شفا ہے کہ بشر والا نہ
طے کیا منزلِ تربت کا سفر تیسرے دن

غزل

ا ظہور کائنات حسنِ عریاں ہو گیا
در حقیقت میری بربادی کا ساماں ہو گیا

ع فطرت نے وہ بخشی روشنی ہر اک کو
مجھ پہ ہستی کا ہر اک پہلو نمایاں ہو گیا

قر ہے یہ تغیر کائناتِ عشق کا
کوئی کافر ہو گیا کوئی مسلماں ہو گیا

ن فطرت کا چمکا مطلعِ اسدم آفتاب
دل میرا آشفتہ جب سے شامِ ہجراں ہو گیا

ن بے پایاں و کیفِ اضطرابِ بیخودی
انگے سودائی کی رگ رگ سے نمایاں ہو گیا

ہر دہانِ زخم میرا فرطِ شادی کے سبب
اے شفا منت کشِ لطفِ نمکداں ہو گیا

شمشاد علیگ

۳؍ جون سنہ ۱۹۱۸ء علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ لڑکپن ہی میں شوقِ موسیقی و شاعری پیدا ہو گیا۔ نوجوانی میں بے راہ ہو گئے تھے مگر بعد میں ہر برائی کی طرف سے دل ہٹ گیا اور زندگی تبلیغ مذہب خدمت مسیح میں بسر کر دی۔ مصورِ حقیقت جناب ایس ایل تاثب میرٹھی مرحوم کے عزیز ترین شاگرد میں تھے۔ کلام نعتیہ اور عارفانہ ہے زبان نہایت سلیس اور شگفتہ ہے۔ کلام میں روانی ہے۔ فن کا بہت لحاظ رکھتے ہیں۔ طرزِ ادا نہایت دلکش ہے۔

نمونۂ کلام:-

توصیفِ مسیحا

کفر کا عیسیٰ نے خود آ کر دفینہ کر دیا
جا بجا عرفان کا جاری آبگینہ کر دیا

ڈالدی تو نے حیاتِ جاودانی کی بناء
پیدا تو نے عرش پر چڑھنے کو زینہ کر دیا

ہو گیا قربان تو سولی پہ اے ابنِ خدا
سامنے قاتل کے تو نے اپنا سینہ کر دیا

ڈالدی تو نے تنِ مردہ کے اندر زندگی
تو نے چشمِ کور کو اک پل میں بینا کر دیا

ہو گیا شمشاد وہ عیسیٰ کا مقبولِ نظر
ترک جس نے اپنے دل سے بغض و کینہ کر دیا۔

بڑا دن

تجلی چمک رہی ہے فضا میں جلال کی
آمد ہے انجمن میں کسی خوش جمال کی

شرما رہی ہے عرش پہ نظریں ہلال کی
مریم ہے شکل ایسی ترے نونہال کی

جلووں سے جگمگا اٹھی جرنی کی کائنات
ایسی تھی روشنی رخِ حسنِ کمال کی

سُن کر مسیحِ پاک کی آمد کا تذکرہ
صورت بدل گئی اجلِ بدخصال کی

دارِ فنا میں آکے جنابِ مسیح نے
مُردوں میں زندگانی کی دنیا بحال کی

شمشاد تیری شاعری کے شمعدان میں
شامل ہے روشنی ترے روشن خیال کی۔

ایسٹر

لے کے پھر عیدِ قیامت شادمانی آگئی
ہر بشر کے لب پہ عیسیٰ کی کہانی آگئی۔

پھر ہوا زندہ مسیح پھر زندگانی آگئی
پھر قریب انسان کے راہِ آسمانی آگئی

پھر گلوں کے دہن میں خندہ دہانی آگئی
غنچے غنچے بوٹے بوٹے پر جوانی آگئی

موت پر اب زندگی کی حکمرانی آگئی
قلبِ شیطاں میں یہ سُنکر ناتوانی آگئی

جوش پر دریائے رحمت کی روانی آگئی
ذاتِ خالق لے کے پھر بخشش کا پانی آگئی

لب پہ شمشاد اپنے شعر خوانی آگئی
آج دُنیا میں حیاتِ جاودانی آگئی

گڈ فرائیڈے

اہلِ صلیب دیتے ہیں نعرہ صلیب کا
ہر سُو بجا بجا کے نقارہ صلیب کا
دیوانہ بن گیا وہ جنابِ مسیح کا
جس نے سمجھ لیا ہے اشارہ صلیب کا
چڑھ کر مسیح پاک نے بامِ صلیب پر
چمکا دیا جہاں میں ستارہ صلیب کا
عیسیٰ نے راہِ خلد دکھا دی جہان کو
غم گلوری پہ کر کے گوارہ صلیب کا

باغِ جہاں کی پُر خطر راہوں میں ہر جگہ
کافی ہے ہم کو ایک اشارہ صلیب کا

غزل

دل میں خیالِ طور کو جہاں نہ کر سکے
ہم تیرگی میں نور درخشاں نہ کر سکے
سب نے چراغ آ کے جلائے تو ہیں مگر
بزمِ جہاں کو شمع فروزاں نہ کر سکے
دُنیا میں جن کو راہِ صداقت پہ ناز تھا
وہ تار تار کفر کا داماں نہ کر سکے
آئے زمیں پہ بن کے بہت چارہ گر ضرور
لیکن مرے گناہ کا درماں نہ کر سکے
وہ کام کر دکھائے جنابِ مسیح نے
جن کو زمیں پہ حضرتِ انساں نہ کر سکے
عیسیٰ کے ماسوا کوئی دیگر نبی رسُول
جاں دوسروں کے واسطے قرباں نہ کر سکے

عیسیٰ کے دینِ پاک پر شمشاد بادب
قرباں ہم اپنی دولتِ ایماں نہ کر سکے

شوق جالندھری

نام نامی سیموئیل ڈانیل۔ تخلص شوق ۱۲ ر فروری ۱۹۲۹ء پنجاب میں جالندھر ضلع کے موضع سنسار پور میں پیدا ہوئے۔ اس مناسبت سے ابتدا میں سنسارپوری کہلاتے تھے بعد میں جالندھری لکھنے لگے۔ عرصہ دراز سے رائے پور (مدھیہ پردیش) میں مقیم ہیں اور گاس موریل سینٹر کے ڈائریکٹر ہیں۔

صفِ اوّل کے شعراء میں شمار ہوتا ہے ہر وقت فنا فی الشعر رہتے ہیں نہایت خوش فکر اور خوش گلو شاعر ہیں۔ کلام بلند مرتبہ ہے۔ حضرت شمیم کرہانی کے شاگرد ہیں اسلئے کلام فنّی اوصاف سے مزیّن ہوتا ہے۔ زبان میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ مذہبی عقائد میں تخیّل کی بلند پروازیاں اپنی رنگینیاں دکھاتی ہیں تلمیحات کا استعمال بڑے مناسب ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ طبیعت کو غزل سے بہت لگاؤ ہے اسلئے کلام میں تغزّل بدرجۂ اتم ہوتا ہے۔ بندشیں چُست اور دلآویز ہیں۔ غزلوں میں چونکا دینے والے اشعار ملتے ہیں جو قاری کے دل پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ شہرت سے دُور رہتے ہیں اسلئے کلام مسیحی پرچوں میں نظر نہیں آتا۔ مشاعرے بڑے ترنّم کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

بڑا دن

چمکی ہے کوہِ طور کا جلوہ لئے ہوئے
کیسی ضیا ہے وہ رُخِ زیبا لئے ہوئے

موجِ بشر ہے آج غمِ زندگی سے دُور
آیا یہ کون غم کا مداوا لئے ہوئے

لو آ گئے مسیح بصد عظمت و جلال
کفارہ گناہ کا تحفہ لئے ہوئے

حاصل نہ ہو سکا جنھیں عرفاں مسیح کا
دُنیا سے جائیں گے غمِ عقبیٰ لئے ہوئے

اے طالبانِ جلوۂ حق آؤ دیکھ لو
چمکی ہے نورِ عرشِ معلیٰ لئے ہوئے

اے شوق رہ نوردِ مقامِ شہود ہوں
مَیں ذوقِ جستجوئے مسیحا لئے ہوئے

غزل

کوئی کاش سمجھے میں کیا چاہتا ہوں
رہِ ناصری میں مٹا چاہتا ہوں

مجھے مال و زر کی تمنا نہیں ہے
قبا آپ کی چومنا چاہتا ہوں

مجھے موت جب اپنے آغوش میں لے
تجھے روبرو دیکھنا چاہتا ہوں

شبستانِ دل میں اُجالا جو کر دے
ترے نور کی وہ ضیا چاہتا ہوں

مسیحا مرے اب تو دم بھر کو آجا
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

یا سر اپنا ہو گا یا در اُن کا ہو گا۔
مَیں شوق اس طلب میں مٹا چاہتا ہوں

غزل

وقت پڑنے پہ میرے اپنے کچھ ایسے سرکے
اپنے ہی سائے سے جیسے کوئی بھاگے ڈر کے

جانے وہ لوگ ہیں کیا جنکو ہے چاہت تیری
ہم تو پچھتائے بہت تیری تمنا کر کے

غمِ جدائی کا کسے کہتے ہیں اس سے پوچھو
در و دیوار جسے کاٹنے دوڑیں گھر کے

فرصتِ غم ہے جنھیں اور نہ غم فرصت ہو
ان کے سینے میں نہاں درد ہیں دنیا بھر کے

ہم کو اس دور کے راون سے نپٹنا ہوگا
جب بھی جی چاہے یہ لے جاتا ہے سیتا ہر کے

جینا مشکل ہے تو مرنا بھی کوئی سہل نہیں
ہم نے دیکھا ہے کئی بار ارادہ کر کے

غیر تو غیر ہیں پھر ان سے شکایت کیسی
لوٹنے والے مجھے لوگ ہیں میرے گھر کے

تاج کانٹوں کا تو کوئی بھی پہن سکتا ہے
کوئی دکھلائے مگر عیسیٰ کی طرح مر کے

سونا اُگلیں گے کبھی شعر تمہارے اے شوق
کیا ہوا بال اگر ہو گئے چاندی سر کے

غزل

جلتا ہوا دل جلتی ہوئی ایک چتا ہے
بارش میں کھڑا کب سے کوئی بھیگ رہا ہے

سر آنکھوں پہ تم جس کو بٹھائے گئے کل تک
وہ آج خود اپنی ہی نگاہوں سے گرا ہے

دل جس کے تصور سے تڑپ جاتا ہے اب بھی
کیا جانیے کس شہر میں وہ جا کے بسا ہے

تا عمر خزاں جس کے تبسم پہ نہ آئے
اس باغ میں ایسا بھی کوئی پھول کھلا ہے

دنیائے محبت میں سہارا تو ہے کوئی
مت سوچ کہ یہ کونسی مٹی کا گھڑا ہے

کیا کیا نہیں جھیلے ہیں مرے دل نے مصائب یہ ایک دیا کتنی ہواؤں میں جلا ہے

دُنیا تو بھرا از حرف و حکایات ہے لیکن
اے شوقؔ تری بات کا انداز جُدا ہے

غزل

زندگی سے تنگ تھا حالات سے بیزار تھا
کیا سنبھلتا میں کہ اک گرتی ہوئی دیوار تھا

اوڑھ کر چادر غریبی کی میں سوتا ہی رہا
لوگ مجھ کو پڑھ رہے تھے جیسے میں اخبار تھا

زندگی کا درد میں بھی بانٹ سکتا تھا مگر
اِس کو کیا کیجے کہ میرا ذہن ہی بیمار تھا

گھر غریبوں کے جلے کیسے جلے. کیونکر جلے
لوگ کہتے ہیں محافظ شہر کا بیدار تھا

جھیل سی آنکھوں میں اُن کی ڈوب ہی جانا پڑا
دوستوں کا مشورہ بے سُود تھا بیکار تھا

شہر دل میں شوقؔ پھر مجھ پر ہی یہ الزام کیوں
جب تمہارے سامنے ہر شخص کا کردار تھا



ضیاؔ گھمانوی

نام نامی ولیم سوہن لال۔ ضیاؔ تخلص۔ کلارک آباد (لاہور) میں ایک مسیحی زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے۔ تقسیم وطن کے وقت ہندوستان تشریف لے آئے۔ ۱۹۳۵ء میں مدرسی کا کورس پاس کیا اور معلمی کا پیشہ اختیار کیا ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے گھمانڈی میں ہیڈ ماسٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اردو زبان سے عشق تھا پنجاب سے ادیب عالم کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۷۰ء میں کچھ عرصہ ولنگڈن اسپتال نئی دہلی میں بیمار رہے اور انتقال فرمایا۔

حضرت رسا لکھنوی کی صحبت میں شوقِ شاعری پیدا ہوا اور ان سے اصلاح لینے لگے ابتدا میں نظمیں کہیں بعد میں غزل کے میدان میں آ گئے کلام نعتیہ ہے اُستاد سے بہت محبت رکھتے تھے ان کی وفات پر مرثیہ کہا۔ چند اشعار یہ ہیں ؎

خالی پڑا ہے بتکدہ مردِ خدا کے بعد
سونی پڑی ہے بزم سخنداں رسا کے بعد

محفل وہی ہے رونقِ محفل نہیں مگر
الفت جہاں سے اُٹھ گئی مردِ وفا کے بعد

محفل سے تیری کیا ہوئے محروم ہم رسا
کچھ لطفِ انجمن نہیں تیری قضا کے بعد

بڑا دن

ہے یہ شہرہ سرورِ پیغمبراں پیدا ہوا
درحقیقت مالکِ کون و مکاں پیدا ہوا

اہلِ ایماں ایک مدت سے تھے جسکے منتظر
آج چرنی میں وہ مختارِ جہاں پیدا ہوا

فرش پر آیا وہ تختِ آسماں کو چھوڑ کر
دھوم ہر جانب مچی شاہِ زماں پیدا ہوا

جب نظر آیا نہ جادہ منزلِ مقصود کا
رہبری کو رہنمائے کارواں پیدا ہوا

ناؤ جب منجدھار میں تھی اور تھا طوفاں کا زور
آدمیت کو بچانے کھیرباں پیدا ہوا

پھر سے بگڑی بن گئی تقدیر آدم زاد کی
اے ضیاؔ جب وہ مسیحِ جہاں پیدا ہوا

ایسٹر

مر کے جی اُٹھا ہے محبوبِ خدا
آج بر آئی ہے پھر حق کی ضیاء

شادماں ہے آج بیحد کائنات
جھوم اُٹھی آج پھر خلقِ خدا

کھول ڈالا منہ لحد نے خود بخود
موت پر غالب ہوئے ابنِ خدا

زندگی مُردہ دِلوں میں آگئی
پھر ہوئی رنگیں زمانے کی فضا

پھوٹ نکلا ایک چشمۂ حیات
زندگی پھر سے ہوئی جلوہ نما

بند منہ یکدم حریفوں کے ہوئے
قبر سے زندہ ہوئے جب کبریا

اک تیری نظرِ کرم کا واسطہ
مجھ ضیاءؔ کو ساتھ اپنے تو جلا

○

ضیا لکھنوی

نام نامی کرامویاں منجمن بھگوان داس۔ تخلص ضیاؔ۔ خلف حضرت رسا لکھنوی سنہ ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ ریاضی اور انگریزی ادب میں ایم۔ اے پاس کیا پہلے وائسرائے ہند کے دفتر میں ملازمت اختیار کی اسکے بعد فورمین کرسچن کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ایک ریاضی داں کا شاعر ہو جانا تعجب خیز ہے لیکن والدِ محترم کے ذوقِ ادب اور ترغیبِ سخن نے آپ کو شاعر بنا دیا۔

غزلیں طویل کہتے ہیں۔ افسوس کہ فصیح الکلام حضرت رسا کے فرزند ہونے کے باوجود ان سے کسبِ فن حاصل کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے کلام شاعرانہ رعایتوں سے مبرا ہے۔ پرانی روش پر گامزن ہیں۔ گل و بلبل، رقیب عدو ہجر و وصال کے چرچے ابھی تک ان کی زبان پر ہیں۔ آجکل پاکستان میں مقیم ہیں۔

کلوری

آسمانوں سے ہے اونچا آسمانِ کلوری
کسقدر ارفع ہے دو عالم میں شانِ کلوری

اس جگہ سُولی ہوا مصلوب دنیا کے لئے
کسقدر دُکھ سے بھرا ہے امتحانِ کلوری

چھپ گیا خورشید غم سے کانپ اٹھے ارض و سما
درد سے لبریز ہے دردِ نہانِ کلوری

ہم گنہگاروں کی بخشش کا اسمیں راز ہے
اس لئے اُس نے سہا رنجِ جہانِ کلوری

وہ صلیب اپنی اٹھا کر لڑکھڑانا ضعف سے
ہائے میں کیسے سناؤں داستانِ کلوری

خونِ مسیحی سے ہوئے ہم سرخرو پائی نجات
اس کی عظمت جانتے ہیں نکتہ دانِ کلوری

پہلوئے عیسیٰ سے بخشش کا یہاں چشمہ بہا
کیوں نہ پھر قائم رہے نام و نشانِ کلوری

درد سے بھرپور ہے ازبس صلیبی ماجرا
رو پڑے گا جو سنے گا داستانِ کلوری

تیسرے دن قبر سے کس شان سے زندہ ہوا
ہے وہ ہی دونوں جہاں میں کامرانِ کلوری

تم ضیاؔ خوشیاں کرو دنیا کا منجی جی اٹھا
جاں بحق ہو کر سرِ رنجِ جہانِ کلوری

غزل

حسن والوں کی چاہ کرتا ہوں
دل کی دنیا تباہ کرتا ہوں

شرم سے منھ وہ پھیر لیتے ہیں
چاہ کی جب نگاہ کرتا ہوں

اس ستمگر سے اس جفا جو سے
میں ہی ہوں جو نباہ کرتا ہوں

داغِ غم کھا کے اے ضیاؔ صد شکر
دل کو میں رشکِ ماہ کرتا ہوں



طالب شاہ آبادی

مسیحی شعراو ادیبوں میں عالم فاضل۔ صاحب فن اور اردو ادب و مسیحی قوم کے محسن کا نام نامی ہے سیموئیل وکٹر بھجن۔ تخلص طالب۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۲۴ء اپنے وطن شاہ آباد (موجودہ آرہ) بہار میں پیدا ہوئے لیکن بچپن اور جوانی کے ایام پنجاب (پاکستان) میں بسر ہوئے۔ اردو۔ فارسی کے جید عالم ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے (فارسی) اور منشی فاضل پاس کیا۔ اور امریکہ کے ہارٹفرڈ یونیورسٹی سے اسلامیات میں ایم۔ اے کیا۔ اسکے بعد فارسی کی مزید تعلیم کے لئے ایران گئے اور تہران یونورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اسلامیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

۱۹۷۱ء سے حیدرآباد میں ہینری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے سہ ماہی مجلہ ہماکے مدیر اعلیٰ رہے اب ہما آپ کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے۔

شاعری کا شوق طالب علمی کے زمانہ سے ہو گیا تھا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ فارسی میں حیدرآباد دکن کے فرخ شیرازی سے تلمذ ہے اور اردو میں علامہ منشی بشیشور پرشاد لکھنوی مرحوم کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے۔ شعر بلیغ کہتے ہیں جس میں زبان کی چاشنی اور حلاوت ہوتی ہے مذہبیات آپ کا خاص موضوع ہے۔ توصیف مسیحا میں تخئیل کی بلند پروازیاں

دکھاتے ہیں۔ تغزل کی رنگینیاں بھی عروج پر ہیں واردات قلبی اور جذبات نگاری میں کمال حاصل ہے۔ اخلاقیات اور عرفان پر بہت اچھے شعر کہے ہیں۔

میدان نثر کے بھی شہسوار ہیں۔ افسانے و مقالات لکھتے ہیں۔

بھولے کبوتر ہوشیار سانپ اُجالوں کے بادل اور سرچشمۂ قرآن پر ریویو۔ آپ کی تالیفات ہیں، شعری مجموعہ "فغان سنگ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس پر مغربی بنگال اُردو اکیڈمی نے ۱۹۸۱ء میں انعام سے نوازا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب کے الفاظ ہیں:۔

طالب کا کلام اس حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے کہ اس دور میں جہاں بیشتر شعراء تحریکی شاعر بن گئے ہیں وہاں طالبؔ اپنی انفرادیت باقی رکھی ہے ان کے یہاں جو عصری اور خارجی عناصر ملتے ہیں وہ ان کی انفرادیت کے آئینہ ہی سے منعکس ہوتے ہیں طالب نہ تو محض قدیم مکتب کے شاعر ہیں اور نہ ہی محض جدید مکتب کے اس میں وہ سارے قدیم و جدید عناصر موجود ہیں جو ان کے معاصر معاشرے کا جز رہے ہیں۔

طالب کی شخصیت بُنیادی طور پر روحانی مزاج کی حامل ہے اور محبّت اس کی مہک ہے اعلیٰ تعلیم اور تحقیقی مشاغل نے ان کی تخلیقی کاوشوں کو معقولیت کا ایک لطیف و دلکش جامہ پہنایا ہے جو ان کے تجربات اور واردات ہیں وہی ان کا مضمون ہیں اس طرح طالب کی شاعری جہاں ایک طرف سادگی کا حُسن رکھتی ہے۔ تو

دوسری طرف اس میں شخصیت کا عنصر جھلکا پڑتا ہے خواہ نظم ہو یا غزل طالب کا فن معیارات وروایات سے آراستہ ہے اس میں شک نہیں کہ انہوں نے آزاد نظمیں بھی کہی ہیں لیکن نظمیں عروضی اور فنّی شرائط سے آزاد نہیں ہیں انھیں فن اور زبان پر قابو ہے اور جب وہ آپ بیتی کہنے جاتے ہیں تو حسنِ اظہار خواہ وہ زبان کا ہو یا فن کا اس سے لاپرواہ نہیں ہوتے۔ اس اعتبار سے طالب کو روایت پسند شاعر کہا جا سکتا ہے۔

طالب زبان کے بارے میں ایک نہایت سُتھرا مذاق رکھتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ سلیس۔ با محاورہ۔ اور نکھری ہوئی ہے۔ طالب کی اردو میں عربی۔ فارسی۔ اور ہندی الفاظ کا جو تناسب ہے وہ بھی کسی شعوری کوشش کی نشاندہی نہیں کرتا یہ بھی ایک فطری تناسب ہے جو ان کے ماحول اور اُن کی تعلیم کا آوردہ ہے۔

طالب کے یہاں اظہار کی شادابی کہیں مدھم پڑتی دکھائی نہیں دیتی۔ ان کی شاعرانہ گفتگو کا لہجہ دھیما اور حد درجہ سُلجھا ہوا ہے۔ مفہوم، معنی اور مزاج کے لحاظ سے طالب کا کلام متنوع ہے۔ ان کی غزلوں میں اختر شیرانی۔ مجاز۔ اور جذبی کا آہنگ نمایاں ہے۔ کہیں کہیں آرزو لکھنوی کا رنگ جھلکتا ہے۔

اُن کے فارسی کلام کی معنوی قدر وہی ہے جو ان کے اردو کلام کی ہے۔ طالب کو فارسی زبان پر دستگاہ ہے اس لئے ان کے فارسی کلام کی زبان معیاری اور بُلند ہے۔

نمونۂ کلام :—

اے دشمنو! دیکھو مرے ارمانوں کو | سینے سے لگا لیتا ہوں بیگانوں کو
عیسیٰ میرے ایماں کی ہے محکم بُنیاد | للکار کے آواز دو طوفانوں کو

آزاد ہوں لیکن ہوں مسیحا کا غلام | وہ جس کا ازل سے ہے بہت ارفع مقام
جب پستی میں اترا تو فقیروں کا فقیر | جب اوج پہ آیا تو اماموں کا امام

جب جان یہ آفات سے گھبراتی ہے | دُنیا مجھے تاریک نظر آتی ہے
ایسے میں دبے پاؤں تری یاد آکر | امید کی اِک شمع جلا جاتی ہے

آج کی رات مجھ سے کہتی ہے | کل کا دِن نور بن کے آئے گا
دِل جو ہے ظلمتوں کا گرویدہ | روشنی کا فریب کھائے گا

توصیفِ مسیحا

قربت تیری مسیحا سرمایۂ خوشی ہے | جینا بھی زندگی ہے مرنا بھی زندگی ہے
تو آگیا زمیں بھی اب عرش بن گئی ہے | راہوں میں کہکشاں ہے ذروں میں روشنی ہے
بیت لحم میں چمکا داؤد کا ستارا | پھر سے ہوا اُجالا ہر سمت روشنی ہے۔
جو عرش کا مکیں تھا جو آسماں نشیں تھا | انسان بن کے آیا یہ رمزِ عاشقی ہے

اے عاصیوں کے شیدا اے بیکسوں کے داتا
طالب کو بس تجھ ہی سے امیدِ مخلصی ہے۔

نورِ جمال

وہ تحیّر ہے کہ اندازِ بصر
اپنی درماندہ نگاہی پہ لرزاٹھتا ہے
آج تک
پردۂ عصر پہ اُبھرا نہ کبھی
جلوۂ نورِ جمال
بایں تمکین و کمال

شبِ دیجور کا افسوں ٹوٹا
اک طویلہ میں کسی گوشہ سے
سرمدی نور کا چشمہ پھوٹا
جس کے انوار سے ملبوس ہے فطرت کا چمن
اور اک گوشۂ تنہائی میں کمزور و نحیف
میری بے باک تمنّائے گناہ
اوّلیں بار ہوئی ہے عُریاں

○

کلوری

لے کر صلیب دوش پہ سلطانِ کلوری / کیا شان سے چلے کہ ہوں قربانِ کلوری
آئے حضور جب سرِ میدانِ کلوری / گردوں سے بھی بلند ہوئی شانِ کلوری
روزِ ازل ہی لوحِ مشیت پہ صاف صاف / لکھا گیا تھا خون سے عنوانِ کلوری
جس کی نظیر کوثر و تسنیم بھی نہیں / بٹتی ہے مفت وہ مئے عرفانِ کلوری
زخموں سے آج جسمِ مبارک ہے لالہ زار / ہو کیوں نہ سرخ پوش گلستانِ کلوری
الوانِ معصیت کو بہا لے گیا مگر / مانا کہ ہولناک تھا طوفانِ کلوری

اقلیم شاعری میں ہے کس درجہ ارجمند
طالبؔ — غلامِ درگہہ سلطانِ کلوری

ایسٹر

ستاروں نے بزمِ فلک جگمگائی / بہاروں نے رونق زمیں کی بڑھائی
مسرت میں گم ہو گئی ہے خدائی / مسیحائے مصلوب زندہ ہوئے ہیں

گناہوں سے جن کا رہا پاک دامن / ہوا بخت جن سے زمانے کا روشن
جنھیں کر کے مصلوب شاداں تھے دشمن / وہی آج کیا خوب زندہ ہوئے ہیں

غزل

شبِ وصال کی یہ دوست کیسی منزل ہے / ہمارے بیچ میں احساسِ قرب حائل ہے
مرے وجود کا ایک ایک نقش باطل ہے / کہ جیسے آئینے کے آئینہ مقابل ہے

کسی نے چاند سے نیچے گرا دیا تھا مجھے — پھر اس فراز کی جانب نگاہ مائل ہے
مزا کچھ اور ہے گرداب سے اُلجھنے میں — وگرنہ یاں سے فقط دو قدم پہ ساحل ہے

وہ سامنے ہیں مگر ہائے اے نصیب اپنا
فروغِ حُسن سے طالب نگاہ بسمل ہے

نمونہ کلامِ فارسی

گنہگارم و ہر آنکہ خیر خواہِ من است — نثارِ خاکِ رہش افسر و کلاہِ من است
جفا ز غیر بدیدم ہمہ خطایم بود — وفا ز خویش بجُوئیم ہم اشتباہِ من است
مترس و خوش بدر آ اندرونِ خانۂ من — ترا ہر آنکہ شناسد فقط نگاہِ من است
چرا مدام بہ روشن دلاں گرفتاری — برائے نورِ تو موزوں دلِ سیاہِ من است
براہِ خویش مرا از چہ روی می طلبی — بریں طریق نیائی چرا کہ راہِ من است
شکست آدمِ خاکی غصونِ ماہِ فلک — مگو دگر کہ رُخِ خوبِ دوست ماہِ من است

ادا نشد ز جبیں سجدۂ ریا طالب
من ایں گناہ نکردم ہمیں گناہِ من است

غزل

تشنگی را اندر کیفِ بادۂ احمر کنم — من ہمیں جا کسبِ فیضِ از ساقیٔ کوثر کنم
راں مرا چہ سود اگر سیرِ مہ و اختر کنم — عاشقم باید کہ عزمِ کوچۂ دلبر کنم
جان و دل را باختم و آرزوئے وصلِ دوست — کردہ ام کاری و می خواہم ازیں بہتر کنم

کاروانِ زندگی گمراہ در دشتِ ریاست — راہبر چوں دزد باشد من کرا رہبر کنم
داوری خواہم دریں دنیا وگرنہ داورا — از خروشِ خود بپا ہنگامۂ محشر کنم
در نگاہم امتیازی نیست در دیر و حرم — خاکِ ایں در راہ بوسم سجدہ بر آں در کنم
باز کن اے ساقیِ محرم درِ میخانہ را — تا ہمہ رنج و محن را غرق در ساغر کنم
در نمازِ عشق محوِ دلبرِ یکتا ستم — وقتِ سجدہ اشک میریزم مصلیٰ تر کنم
مے نہ ہرگز خواہ ای تو باز می گوئی بدوش — زاہدا دیوانہ باشم گر ترا باور کنم
کی شود شایانِ دلبر ذرّہ خاکستِ دل — از شعاعِ مہر رویش من ورا گوہر کنم

بُت پرستی نیز طالب جزوِ ایمانم شود
چوں نظر بر آں بتِ طناز و خوش پیکر کنم

قیدی

میں نے دی تھی تمہیں انگوٹھی جب — مجھ کو وہ دن بھی یاد ہے اختر
تم نے انگلی میں ڈال کر اس کو — "مہربانی" کہا تھا شرما کر
جیسے انگشتری کے حلقہ میں — قید سی ہے تمہاری یہ انگلی

یہ مرا دِل اسی طرح اختر
حلقۂ عشق میں ہے اک قیدی

عابد مُرادآبادی

اصلی نام سالومن وبیسٹر بٹلر تھا۔ سخت پابندِ عبادت وریاضت تھے اسلئے بعد میں اپنا نام عابد مسیح اور تخلص عابد کرلیا۔ سُنا ہے کہ عمر کے آخری حصہ میں زہد وعبادت کا اتنا اثر ہوا کہ اپنا تمام مجازی کلام نذرِ آتش کردیا۔

وطن مُرادآباد۔ والد بزرگوار کا نام پادری ڈی بٹلر تھا جو مشہور و معروف دینی دین تھے۔ آپ کی صحیح تاریخ ولادت تشنۂ تحقیق ہے۔ گمان غالب ہے سنہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں انٹرنس پاس کیا۔ مشہور مسیحی اُستاد شاعر حضرت نادر شاہجہانپوری کے ہم سبق تھے۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں لندن مشن اسکول بنارس میں مدرس ہوگئے اور مدتوں درس وتدریس میں مشغول رہے۔ طبیعت شفقت وعنایت۔ حلم اور انکساری امانت، راستبازی وپرہیزگاری اور کم گویائی جیسے اوصاف سے متصف تھی۔ انھیں اوصاف کے باعث دُنیاوی اعتبار سے زیادہ ترقی نہ کرسکے ہمیشہ فقیرانہ زندگی بسر کی۔

بنارس کے دورانِ قیام گاہے گاہے پروفیسر الٰہی بخش قرین سے استفادہ کرتے تھے بعد میں حضرت نوح ناروی کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ آخری دم تک اُستاد سے بیحد عقیدت رہی۔ بعد میں بی۔ اے پاس کیا اور سنہ ۱۹۱۰ء سے مشن اسکول سردھنہ۔ ضلع میرٹھ میں اُستاد رہے انگریزی۔ عربی۔ لاطینی۔ فارسی، اردو۔ ہندی اور سنسکرت میں بھی دسترس رکھتے تھے۔

حضرت نوح ناروی کے مطابق تاریخِ وفات ۳ر ستمبر ۱۹۵۴ء ہوتی ہے۔ لیکن صحیح تاریخِ وفات ۳ر اگست ۱۹۵۴ء ہے۔ اُستاد نوح ناروی نے ان کی وفات پر اظہارِ غم فرمایا۔ متعدد مسیحی شعراء نے بھی مرثیے کہے۔

حضرت نوح ناروی :۔

انفاس فقط چند حقیقت کی نظر میں — بس ان کے علاوہ نہیں کچھ اور بشر میں
عابد بھی جہاں سے اٹھے تو یہ بھی سدھارے — اک داغ میرے دل میں ہے اک داغ جگر میں

طالب شاہ آبادی :۔

غم ابھی تازہ ہی تھا مرگِ شفا مرحوم کا — زخم بھرنے بھی نہ پایا تھا دلِ مغموم کا
آہ دُنیا سے سدھارے عابدِ شیریں سُخن — جائے عبرت بن گئی شعر و سخن کی انجمن
آج اشکوں میں مجسّم ہو گئے ہیں غم کے راگ — سچ کہوں تو شعر کی دیوی کا اجڑا ہے سُہاگ

نادر شاہجہانپوری :۔

توصیف بیاں ہو تیری کیا کیا عابد — تعریف بڑی مُنہ میرا چھوٹا عابد
نادر نے یہ صحرائے سخن میں دیکھا — تھا تو ہی فقط علم کا دریا عابد
شاگردِ نوح تھا تو اور داغ کا مقلد — ہر شعر میں ہے تیرے سیلاب کی روانی
بچپن کا مرا ساتھی تو میرا ہم جماعت — ہر داستانِ ماضی ماتم کی ہے نشانی

مسیحی شعراء میں اُستادی کا درجہ رکھتے تھے آپ کو ابو الفصاحت کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ مدتوں پنجاب کے مشہور تعلیمی ماہنامہ "رہنمائے تعلیم" میں مضامین نظم و نثر شائع کرتے رہے۔ میدانِ تحقیق کے بھی شہسوار تھے۔

صحیح معنوں میں فنکار کہلانے کے مستحق ہیں۔ طرزِ ادا نہایت دلکش ہے۔ الفاظ کا انتخاب بڑی چابکدستی کے ساتھ کرتے ہیں۔ کلام میں فصاحت و بلاغت بدرجہ اُتم ہے غزل اور کیف و اثر کے اشعار بکثرت پائے جاتے ہیں۔ چھوٹی بحروں میں بہت عمدہ غزلیں کہی ہیں۔ کلام معرفت و عرفان میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور تغزل کی حدود سے باہر نہیں ہوا۔

حضرت تمامیرٹھی کے الفاظ میں

"نہایت قابل و مشاق شاعر جن کو فنِ شاعری میں اُستادی کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ علاوہ خوش گو شاعر ہونے کے بہترین خوش خط بھی تھے۔ مسیحی تغزل کے وہ بادشاہ تھے۔ اپنے ذاتی جذبات کو اس طرح الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں کہ زبان اور محاورہ کی خوبی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ وہ جذبات میں ڈوب ضرور جاتے ہیں لیکن بہتے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار پُر تاثیر ہونے کے ساتھ ساتھ لطیف زبان سے بھی محروم نہیں۔ کلام وارداتِ قلب کا آئینہ دار ہے۔"

طبیعت میں حلیمی اور انکساری بہت تھی۔ ہمیشہ فقر اور کفایت شعاری سے زندگی بسر کردی۔ دُنیاوی عزت و مرتبہ و شہرت سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔

نمونۂ کلام:۔

رُباعی

دلِ ایماں کو محبت کیوں نہ ہو — مادرِ شہ سے عقیدت کیوں نہ ہو
جس کی عزت خود کرے ابنِ خدا — میرے دل میں اسکی عزت کیوں نہ ہو

توصیفِ مسیحا

کرے گا نہ ہم سے کنارا مسیحا ۔۔۔ رہے گا ہمارا سہارا مسیحا
گراں بار تھا میں گناہوں سے اپنے ۔۔۔ مرا بوجھ تم نے اُتارا مسیحا
نہ تھی اور جب عفوِ عصیاں کی صورت ۔۔۔ جہاں میں ہوا جلوہ آرا مسیحا
تیرے عشق میں دردِ آزارِ الفت ۔۔۔ مجھے شوق سے ہے گوارا مسیحا
جُدائی کے صدمے کہاں تک اٹھاؤں ۔۔۔ جگر ہو گیا پارا پارا مسیحا
تڑپتا ہوں دن رات فرقت میں تیری ۔۔۔ نہیں صبر کا اور یارا مسیحا
تیرے سوز نے مجھ کو رفعت وہ بخشی ۔۔۔ ہر اک داغِ دل ہے ستارا مسیحا
اُٹھایا بٹھایا ترے ناتواں کو ۔۔۔ دیا دردِ دل نے سہارا مسیحا

جو فرزندِ حق سرورِ انبیا ہے
وہ مریم کی آنکھوں کا تارا مسیحا

سلام

صابرِ اعظم مسیحا شافعِ محشر سلام ۔۔۔ ابنِ مریم شاہِ دیں کہتی ہے دنیا بھر سلام
گر پڑے جب سنگریزوں پر مسیحِ نامور ۔۔۔ عرش نے مولا کے قدموں پر کیا جھک کر سلام
جسمِ اطہر اور بھی مجروح گرنے سے ہوا ۔۔۔ دلِ شکستہ مادرِ حق نے پڑھا رو کر سلام
آہ وہ دارِ گراں ثابت ہوئی بارِ گراں ۔۔۔ کسقدر صدمہ اٹھایا اے شہِ انور سلام

قولِ عابدؔ ٹھیک ہے شہ کی اذیت دیکھ کر
بیٹھتے اٹھتے پڑھا کرے دلِ مضطر سلام

بڑا دن

جہاں میں شۂ جنت کی آمد آمد ہے
سرورِ فرحت و راحت کی آمد آمد ہے

فلک سے بارشِ انوار کیوں نہ ہو پیہم
کہ آفتابِ صداقت کی آمد آمد ہے

پیامبر نے فلک سے زمین پر آ کر
کہا کہ مالکِ خلقت کی آمد آمد ہے

نسیمِ لطف و مروّت نہ کس لئے چلتی
بہارِ مہر و محبت کی آمد آمد ہے

سُنا ہے مژدہ جو سرور کی آمد آمد کا
دلوں میں جوشِ عقیدت کی آمد آمد ہے

بنا ہوا ہے مرا دل بھی مرکزِ شادی
اِدھر اُدھر سے مسرت کی آمد آمد ہے

مٹے گا دہر سے اب سلسلہ کثافت کا
طبیعتوں میں لطافت کی آمد آمد ہے

کسی طرح نہیں ممکن قیامِ دورِ مجاز
کہ اب شریکِ حقیقت کی آمد آمد ہے

یہ بزمِ عیدِ ولادت ہے عابدِ خوش گو
یہاں کچھ اہلِ فصاحت کی آمد آمد ہے

غزل

ہوا ہے عشق دل کو شاہ کی زلفِ معنبر سے
بتا دینا ذرا خونِ جگر یہ دیدۂ تر سے

نہ یہ مہ کی تجلی ہے نہ جلوہ مہرِ تاباں کا
منور ہے جہاں مولا تمہارے روئے انور سے

ہوا ثابت رونے سے بھری ہے آگ سینہ میں
نکلتے ہیں ہمارے پارہ ہائے دل جو اخگر سے

دکھا دو حسنِ رعنا کی جھلک اے شاہِ شامی
تمہارا عاشقِ ناکام کب تک دید کو ترسے

شفیعِ دوسرا کا داغِ الفت دل میں رکھتے ہیں
ڈریں تو ہم ڈریں کیوں کر خیالِ روزِ محشر سے

تصور سے لبِ عیسیٰ کے جانِ تازہ آتی ہے
تعجب کیا جو پیری میں جواں ہو پھر مرے

کہاں ہے دل نہ زخمی ہو جو تیرے تیرِ مژگاں کا
بچا ہے کون سا سینہ ترے ابرو کے خنجر سے

فراقِ شاہ میں بیٹھے ہیں ہم آمادۂ گریاں
برستی ہے جو ساون کی گھٹا کچھ سو جگر سے

نصیحت ہے یہ سب بیکار تجھ سے ہاتھ اٹھا ناصح
جنونِ عشقِ عیسیٰ جا نہیں سکتا مرے سر سے

شہا کل دیجیے اس بے نوا کو درد و غم اپنا
نہیں محروم پھرتا کوئی سائل آپ کے در سے

کسی کے عارضِ رنگیں کی الفت دل میں ہے عابد
مقابل ہوں نہ کیسے داغ سینہ کے گلِ تر سے

غزل

تمہیں چھوڑوں مسیحا مجھ سے ایسا ہو نہیں سکتا
تمہارا ہو کے بندہ اب کسی کا ہو نہیں سکتا

حسینوں کا ہمارے دل پہ قبضہ ہو نہیں سکتا
جو بندہ ہے خدا کا ان کا بندہ ہو نہیں سکتا

چھپو گے ہم سے کیونکر تم ہمارے مہماں ہو کر
ہمارے دل میں رہ کر ہم سے پردہ ہو نہیں سکتا

تمہارے وصل ہی میں دم نکل جائے تو اچھا ہے
جیوں تم سے جدا ہو کر گوارا ہو نہیں سکتا

میسر ہو گا بے شک وصلِ جاناں جان دینے پر
یہ وہ سودا ہے دل جس میں خسارا ہو نہیں سکتا

وہی عاقل ہیں جو رہتے ہیں مست بادۂ الفت
جو متوالا نہ ہو وہ عقل والا ہو نہیں سکتا

برا جو آپ کو جانے نہیں کہتے برا اس کو
جو سمجھے آپ کو اچھا وہ اچھا ہو نہیں سکتا

ہمارا دل ہوا بے فیض ہم سے بے وفا ہو کر
جو اپنوں کا نہیں ہوتا کسی کا ہو نہیں سکتا

دعائے خیر بدخواہوں کے حق میں فرض ہے عابد
نہ مانوں دل سے فرمانِ مسیحا ہو نہیں سکتا

عاشق مُرادآبادی

عاشق مسیح نام۔ عاشق تخلص ۲۱ مارچ ۱۹۱۹ء وطن مُرادآباد میں پیدا ہوئے۔ دستکاری میں سند حاصل کی اور بہت لائق و قابل دستکار ثابت ہوئے۔ دمہ کے مریض تھے اسی مرض میں ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء انتقال ہوا۔

کلام نعتیہ اور حقانی ہے۔ حضرت عیسٰی سے بہت محبت وعقیدت تھی جس کا اظہار شعر و شاعری میں کرتے تھے۔ کلام صاف اور سُلجھا ہوا ہے شعر بحو کر کہتے تھے۔

نمونہ کلام

توصیفِ مسیحا

ہے ترا مرتبہ سرورِ سروراں — نورِ چشم خدا سرورِ سروراں
ہو تمھیں ابتدا سرورِ سروراں — ہو تم ہی انتہا سرورِ سروراں
میری کشتیٔ دل کا تمہارے سوا — کون ہے ناخدا سرورِ سروراں
بادشاہِ ازل تاجدارِ ابد — فخرِ ارض و سما سرورِ سروراں
تیرا داغِ تمنا ہے میرے لئے — مشعلِ راہنما سرورِ سروراں
مرہمِ زخمِ دل چارۂ سوزِ جاں — رازدارِ شفا سرورِ سروراں

عاشقِ زار پر ہو نگاہِ کرم
وہ ہے محوِ ثنا سرورِ سروراں

بڑا دن

گنہ گارو نہ گھبراؤ حضور پاک آئے ہیں
تھکے ماندو ادھر آؤ حضور پاک آئے ہیں

بجز اُن کے نہیں ہے کوئی بھی جو زندگی بخشے
تم ایماں ان پہ لے آؤ حضور پاک آئے ہیں

گناہوں کی وجہ سے دلمیں تم اپنے جھجکتے ہو
چلے آؤ نہ شرماؤ حضور پاک آئے ہیں

ستاروں کا سہارا لیکے عاشق تم بھی آجاؤ
اگر تم زندگی چاہو حضور پاک آئے ہیں

غزل

مجھے کیا ڈر ہے گر دشمن جہاں ہے
مسیحا مجھ پہ جب تو مہرباں ہے

ہر اک شے میں ترا جلوہ عیاں ہے
عیاں ہو کر بھی نظروں سے نہاں ہے

جہاں پر ہے ترا فیضِ شفاعت
زمانہ آج تیرا مدح خواں ہے

فلک سے ارض پر ہے جلوہ افروز
غضب کی میری بھی آہ و فغاں ہے

وہیں لے چل مجھے اے قاصدِ مرگ
حضور پاک کی تربت جہاں ہے

ہمارے واسطے سولی پہ جاں دی
وہ کتنا اس جہاں پر مہرباں ہے

ہمیں ٹھکرا نہیں سکتا ہے کوئی
کہ ابن اللہ ہمارا قدرداں ہے

زمانہ معترف ہے آج عاشق
کہ اُردو کس قدر پیاری زباں ہے

وائی ایل چرن عشرت ادیب (علیگ)

۳ر جنوری ۱۹۲۸؁ء علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۳۵؁ء والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ خدا ترس نیک سیرت والدہ نے چھ بہن بھائیوں کی پرورش کا بار اٹھایا۔ پری یونیورسٹی پاس کیا اور ذاتی شوق کی بنا پر ادیب کامل پاس کر لیا شعر و سخن کا شوق پرانا ہے۔ خوش قسمتی سے حضرت پیارے لعل شاکر میرٹھی کی صحبت میسر آئی۔ انھیں کی سفارش سے ابو الخیال نادر شاہجہانپوری سے تلمذ ہوا۔ حضرت نادر کی وفات کے بعد جناب مخمور جالندھری شاگرد علامہ سیماب اکبر آبادی سے فیض حاصل کرتے رہے۔

کلام میں پختگی ہے۔ لیکن کم لکھتے ہیں۔ ترکیبیں چست اور دلآویز ہیں۔ کلام میں سیاسی رنگ بھی ملتا ہے۔

آج کل دہلی سے ایک رسالہ سراج الحق نکال رہے ہیں۔

نمونۂ کلام:۔

غزل

آج سلطانِ شفاعت آشکارا ہو گیا
ہم تو اس کے ہو گئے ہیں وہ ہمارا ہو گیا

دل میرا جب ان کے غم میں پارا پارا ہو گیا
خوش نصیبی دیکھئے ان کا نظارا ہو گیا

میری قسمت رنگ لائی گو کسی قابل نہ تھا
دیکھتے ہی دیکھتے میں انکو پیارا ہو گیا

مشکلوں ہی کی بدولت مجھ کو آسانی ملی
موج دریا کا تلاطم ہی کنارا ہو گیا

یہ سیاہ بختی بدل جائے گی عشرت یک قلم
گر مسیحا کی نظر کا اک اشارا ہو گیا

غزل

شمیم زلفِ جاناں کی پریشانی نہیں جاتی
دن آتا ہے مگر یہ رات کی رانی نہیں جاتی

تصور میں تو آزادی ہے انکا حسن و جلوہ بھی
مگر بگڑا ہے رنگ ایسا کہ پہچانی نہیں جاتی

اگر چاہو ابھی میں جان و دل قربان کر ڈالوں
مگر تم سے مری ایک بات بھی مانی نہیں جاتی

مٹا دو آپ کو تم اکتسابِ علم کی خاطر
خدا کی ذات بھی بے علم پہچانی نہیں جاتی

چمن کے غنچہ و گل اسکی رزاقی کے مظہر ہیں
دلِ بد ظن کی پھر بھی تنگ دامانی نہیں جاتی

کسے جا کر دکھاؤں دل گناہ آلود ہے عشرت
مرا سر شرم سے خم ہے پشیمانی نہیں جاتی

غزل

اب چار سو ہے مکر و دغا دشمنی کی بات
کس سے کریں زمانے میں ہم دوستی کی بات

کیوں روکتے ہو کہنے دو فرزانگی کی بات
جنگ و جدل فساد ہیں دیوانگی کی بات

جنتا سے کر رہے ہیں وہ فاقہ کشی کی بات
خود انکو سوجھتی ہے شکم پروری کی بات

انکے لبوں پہ گیت ہمارے لبوں پہ بین
ایک کجروی کی بات ہے ایک برہمی کی بات

ہم نے لبوں کو سی لیا کھاتے ہیں غم پہ غم
ہم کیوں کریں کسی سے ترکِ رفتی کی بات

ہر گوشۂ چمن میں لگائی انہوں نے آگ
بڑھ بڑھ کے کر رہے تھے سلامتی کی بات

بزمِ طرب کو ان کی تم عشرت لگا دو آگ
اپنوں سے کر رہے ہیں یہ بیگانگی کی بات

فانیؔ اکبرآبادی

نام نامی جے سندر داس ۔ فانیؔ تخلص فرماتے ہیں ۔ ۳ر جولائی ۱۹۲۲ء
دیوبند ۔ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے ۔ والد بزرگوار جناب پادری جیون داس
کا وطن ضلع آگرہ تھا ۔ اسلئے اکبرآبادی کہلانے لگے ۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے
بعد ۱۹۵۹ء سے گورنمنٹ آف انڈیا کے ثقافتی ادارے سے منسلک ہیں
اور مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہیں ۔

۱۹۴۷ء سے حضرت نادر شاہجہانپوری کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے
اور بہت کچھ اکتساب کیا ۔ مسیحی شعراء میں صف اوّل کے شاعروں میں شمار
ہوتا ہے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں ۔ کلام پر اُستاد کے رنگ کی
گہری چھاپ لگی ہوئی ہے ۔

زبان صاف و شستہ ہے ۔ کلام میں فصاحت ہے ۔ طرزِ ادا دلکش ہے
اشعار میں سوز و گداز ، یاس و حسرت اور کیف و اثر پایا جاتا ہے ۔
نثر نگاری کا شوق بھی ہے ۔ مسیحی پرچوں میں مذہبی و ملی موضوعات پر مقالے
شائع ہوئے ہیں ۔

افسوس کہ گذشتہ چند سالوں سے ادبی دُنیا سے علیحدگی
اختیار کرلی ہے ۔

ایسٹر

مرحبا صد مرحبا زندہ ہوا — مظہرِ ذاتِ خدا زندہ ہوا
سرورِ ارض و سما زندہ ہوا — مر کے فرزندِ خدا زندہ ہوا
آنکھ والو آنکھ ہے تو دیکھ لو — ہے وہی یا دوسرا زندہ ہوا
زندگی ہے جس نے دامن بھر دیئے — وہ شہِ جود و سخا زندہ ہوا
ہے فنا میں جس سے امیدِ وفا — وہ ہمارا آسرا زندہ ہوا

مجھ کو لے جانا تھا فانیؔ خلد میں
اس لئے ابنِ خدا زندہ ہوا

رُباعی

خورشیدِ حقیقت کی ضیا مِل جائے — اس سعیٔ مسلسل کا صِلا مِل جائے
کیوں گرمِ تجسس نہیں منزل کیلئے — دِل سے جو تو ڈھونڈے تو خدا مِل جائے

توصیفِ مسیحا۔ غزل

صلیب پر یہ کرشمہ دکھایا تو نے — وفا کی راہ میں مِٹنا سکھا دیا تو نے
وجودِ کفر جہاں سے مٹا دیا تو نے — بشر کو زیست کا مقصد بتا دیا تو نے
لحد سے اُٹھ کے وہ نغمہ سُنا دیا تو نے — اجل کا خوف دلوں سے مٹا دیا تو نے
معاف کر کے خطائیں ستم شعاروں کی — نیا سبق یہ جہاں کو پڑھا دیا تو نے

دنیا چمن ہے نئے گل ہیں اور نئی خوشبو زمیں پہ خُلد کا منظر دکھا دیا تو نے
ہٹا کے ظلمتِ عصیاں خیالِ فانی سے
سیاہ خانۂ دل جگمگا دیا تو نے

وادیٔ ناصرت

میرے ہمدم، میرے ہمسفر ــــــ وادیٔ ناصرت میں چلیں

اہلِ دُنیا تو ہیں مطلبی درد سر ان کی ہے دوستی
غم سے بھرپور ہے زندگی چھین لی دشمنوں نے خوشی
پُر سکونِ زندگی کے لئے دل کی آسودگی کے لئے
روح کی تازگی کے لئے وادیٔ ناصرت میں چلیں

میرے ہمدم، میرے ہمسفر ــــــ وادیٔ ناصرت میں چلیں۔

آفتابِ صداقت کے پاس ترجمانِ محبّت کے پاس
دِل کو راحت ملے گی وہاں وادیٔ ناصرت میں چلیں
ابنِ مریم ملے گا وہاں ہے وہی مالکِ دو جہاں
آشنائے دلِ ناتواں وادیٔ ناصرت میں چلیں

صلیب

یاد آتی ہے داستانِ صلیب ہے نشانِ وفا نشانِ صلیب
پوچھتے کیا ہو کیا ہے شانِ صلیب ہے نشانِ ظفر نشانِ صلیب
چُپ رہے گی زباں تو آنکھوں سے مَیں سُناؤں گا داستانِ صلیب

کیوں نہ محلوں کو بھی وہ ٹھکرائے جس کو مل جائے آستانِ صلیب
کیوں لگاؤں نہ اس کو سینہ سے راحتِ جاں ہے جب نشانِ صلیب
کم سے فانی سُنی نہ جائے گی
جب بیاں ہو گی داستانِ صلیب

غزل

غمِ دل سُنانے کو جی چاہتا ہے انھیں بھی رُلانے کو جی چاہتا ہے
جہاں روز گرتی ہو برق اس چمن میں نشیمن بنانے کو جی چاہتا ہے
ترے سنگِ در پر جبیں سائیوں سے نصیب آزمانے کو جی چاہتا ہے
نہ اُبھرے جہاں زورِ بازو سے کشتی وہاں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے
تجھے دیکھنے کو ترستی ہیں آنکھیں ترے پاس آنے کو جی چاہتا ہے
ترے سنگِ در میں کشش ہے کچھ ایسی کہ خود سر جھکانے کو جی چاہتا ہے
ہزاروں ہی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں مگر مُسکرانے کو جی چاہتا ہے
فضا میں ہے شوخی ہوا میں ہے مستی نئے گیت گانے کو جی چاہتا ہے
جو آنکھوں سے دل میں سمائے ہیں فانی
انھیں بھول جانے کو جی چاہتا ہے

فرہاد پردیسی

اسم گرامی شیر سنگھ تخلص فرہاد پردیسی ۳ ستمبر ۱۹۱۷ء رائے کوٹ ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد مدرسی کا پیشہ اختیار کیا ۱۹۳۶ء سے میدانِ سخن میں قدم رکھا۔ حضرت علامہ منوّر لکھنوی کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ بیشتر کلام نعتیہ و حقانی ہے جس میں حضرت مسیح کی تعریف و توصیف ہوتی ہے۔ کلام سلیس اور منجھا ہوا ہے۔ زبان صاف اور پاکیزہ ہے۔ ایک مجموعہ کلام تیشۂ فرہاد کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

نومبر ۱۹۸۲ء شب۔ اِنتقال کر گئے

بڑا دن

اصطبل[۱] میں ہے شور کہ اوتار ہو گیا — پردے سے نورِ پاک نمودار ہو گیا
اندھے کو نین مل گئے تیری جناب سے — آباد بے سہاروں کا سنسار ہو گیا
لعزر کو زیرِ خاک ہوئی زندگی نصیب — خوابیدہ جو پڑا تھا وہ بیدار ہو گیا
تعمیرِ عقل و ہوش سے ملتی ہیں برکتیں — قصرِ خرد وہ کیا ہے جو مسمار ہو گیا

فرہاد رشتۂ سدی انفاس کے طفیل
یاروں کا تھا جو یار مرا یار ہو گیا

۱؎ اصطبل میں حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی تھی۔

غزل

ختم ہو جائے گا دُنیا بھر کا میلہ ایک دن
ہم نشیں تو روئے گا بیٹھا اکیلا ایک دن

راہوارِ عمر کی رفتار کتنی تیز ہے
خود ہی ہو جائے گا سُونا یہ طویلا ایک دن

گرم بازاری رہے گی عیش و عشرت کی مدام
جیب میں ہوگا نہ ایک پیسہ دھیلا ایک دن

بھول سکتا ہے کوئی باغِ عدن کا ماجرا
یاد ہے ہم کو جو تم نے کھیل کھیلا ایک دن

تا بکے فرہاد آخر کفر و دیں کی کشمکش
ختم ہو کر ہی رہے گا یہ جھمیلا ایک دن

غزل

پورے تمام خلق کے ارمان ہو گئے
جو دل کے تھے فقیر وہ سُلطان ہو گئے

جنت میں نادری کی جو چشمِ کرم اُٹھی
تعمیر عاصیوں کے بھی ایوان ہو گئے

یہ مہربانیِ ابنِ مریم تو دیکھئے
مجھ ایسے خستہ حال کے مہمان ہو گئے

ابلیس کی کبھی رہی جن میں قیام گاہ
ایواں وہ کیا عجب ہے جو ویران ہو گئے

جب سے ادائیں اُنہیں مجھے آپ کی ملیں
گلشن کے خار و گل بھی مری جان ہو گئے

حیوان انکو لوگ جو سمجھیں تو کیا عجب
اِنسانیت سے دور جب انسان ہو گئے

اُٹھی نہ آنکھ سامنے اہلِ گناہ کے
ہم بے گناہ بن کے پشیمان ہو گئے

فرہاد جامِ بادۂ عرفاں سے تر ہوں لب
پورے تری نجات کے ساماں ہو گئے

فکر کانپوری

نام نامی اے بی دسن ہے۔ وطن کانپور نگر ادٹ گنج میں ۱۵ر فروری ۱۹۱۹ء
ولادت ہوئی۔ تعلیم رڑکی۔ میرٹھ اور انگرامیم انسٹی ٹیوٹ غازی آباد میں
حاصل کی۔ غازی آباد میں مولوی ظہیر الدین ظہیر صاحب کی شفقت سے
اُردو ادب سے لگاؤ پیدا ہوگیا اسکے بعد متھرا گئے۔ اور وہاں جناب ظہیر عالم صاحب
سحر سے اکتساب کیا۔ شعر گوئی کا شوق ۱۹۳۵ء سے پیدا ہوگیا تھا۔
۱۹۳۹ء میں وطن کانپور واپس ہوئے اس عرصہ میں تخلص مقیم رکھا۔
خوش قسمتی سے یہاں مولانا حسرت موہانی مرحوم تک رسائی ہوگئی اور تخلص
فکر ہوگیا۔ بی۔ اے پاس کیا بعد میں ذوق کی تکمیل کی غرض سے امتحان
ادیب پاس کیا۔ سرکاری ملازمت میں رہنے کی وجہ سے ہندی میں ساہتیہ رتن
بھی پاس کرلیا ۱۹۴۱ء سے کانپور ڈیفنس فیکٹری میں ملازمت کی۔ اور
۱ر اپریل ۱۹۷۸ء ملازمت سے سبکدوش ہوکر وطن میں مقیم ہیں۔

دُعا

وہ خصلت وہ دِل وہ جگر دے مسیحا | جو گھر دل میں دُنیا کے کر دے مسیحا
دعا میں وہ میری اثر دے مسیحا | جہانِ گناہ خاک کر دے مسیحا
گنہگار آیا ہے دامن پسارے | تو رحمت سے جھولی کو بھر دے مسیحا

ہر اک شے میں جلوہ نظر آئے تیرا — بلندیٔ ذوقِ نظر دے مسیحا
اُٹھا لوں گا سر آستانے سے تیرے — تجلّی سے دِل کو تو بھر دے مسیحا
تا شام و سحر فکر قربت میں آئے
خرد اور جو یا نظر دے مسیحا

قطعہ ——— بڑا دن

صبا جہاں سے تو کہہ دے نجات آئی ہے — گھٹا نشاط کی عالم پہ پھر سے آئی ہے
زمانہ نور میں تاریکیوں سے بدلا ہے — مسیح پاک جو آیا نجات آئی ہے

غزل

مسرتوں کی لہر زندگی میں آئی ہے — مسیح کے خون سے ہم نے نجات پائی ہے
ستارہ ڈھونڈنے نکلا ہے عرش عالم پر — کرن نجات کی کس جا پہ جگمگائی ہے
فلک پہ گیت ملائک یہ گنگناتے ہیں — نجات آئی ہے دیکھو نجات آئی ہے
گناہگار کا حامی جہاں میں آیا ہے — دیئے کی لو تری شیطان ٹمٹماتی ہے
وہ معجزے دِکھلائے کوئی دِکھا نہ سکا — گواہ ہم ہی نہیں اس کی کُل خدائی ہے
نا کر سکے گا زمانہ کبھی تجھے گمراہ — اے فکر یسوع کی حاصل جو رہنمائی ہے

قطعات

زیست اک واردات ہوتی ہے — ایک گذری سی بات ہوتی ہے
ہمسفر جب کوئی حسینہ ہو — کتنی آساں حیات ہوتی ہے

اب وہ نالۂ شب فراق نہیں
اب زمانہ کا وہ مذاق نہیں
شکوۂ غیر فکر بیجا ہے
بھائی بھائی میں اتفاق نہیں

غزل

عجیب رنگ میں تھا آج تیرا شیدائی
کرم کیا جو نگاہ کرم نہ فرمائی
چمن کو چھوڑ کے جاتے ہیں تیرے سودائی
ہوائے فصل بہاراں نہ انکو راس آئی
ادا شناس کی نظروں میں ایک انگڑائی
ہزار جلوۂ رنگیں ہزار رعنائی
اسیر نو پہ یہ قسمت نے اور ظلم کیا
چمن کی سمت سے ہوتی ہوئی بہار آئی
وہ پختہ کار محبت ہے میرا ذوق جنوں
کبھی قریب آیا خیال رسوائی
پڑی ہے عارض جاناں پہ فکر جب سے نظر
اتر گئی ہے نظر سے گلوں کی رعنائی

غزل

سبکو بقدر ظرف عطا نور ہو گیا
موسیٰ ہوا کوئی، کوئی منصور ہو گیا
یاد آگئی جو آئینہ بندی بہار کی
اہل قفس کا شیشۂ دل چور ہو گیا
اب فکر برق ہے نہ غم باغباں مجھے
اچھا ہوا کہ مجھ سے چمن دور ہو گیا
ہاں مجھ کو فکر ساغر و مینا نہیں رہی
ساقی کی چشم مست سے مخمور ہو گیا
یہ بھی تھی اک ادائے حسین حسن کی قسم
نظارۂ جمال سر طور ہو گیا
دو دن نہ فکر ایک طرح پر ہوئی بسر
دل شاد ہو گیا کبھی رنجور ہو گیا

فہیم شملوی

نام ہنجن سوہن لعل ۔ تخلص فہیم ۔ وطن ہماچل پردیش ۔ مستقل سکونت شملہ ۔ ہماچل پردیش پولیس میں ملازم ہیں ۸ نومبر ۱۹۲۸ء بمقام چمبہ ہماچل پردیش میں پیدا ہوئے ۔ ہائی اسکول اردو، فارسی کے ساتھ پاس کیا۔ بچپن سے شعروشاعری و کہانیاں لکھنے کا شوق ہے ۔ لیکن کسی استاد سے مستفیض نہیں ہوئے ۔ اکتساب فن کی ضرورت ہے ۔

نمونۂ کلام

میں بات سناؤں گا ادھر کی نہ ادھر کی
چھوٹی سی کہانی ہے سنو فتح و ظفر کی

راتوں کی سیاہی میں گناہوں کے نشے میں
میں بھول گیا راہ مسیحا ترے گھر کی

دولت کی ہوس نے مرے دامن کو سجایا
صد حیف کہ میں ڈوب گیا چاہ میں زر کی

اک روز مجھے میرے ہی سایہ نے جگایا
سوکھے ہوئے ٹوٹے ہوئے پہلو سے شجر کی

ٹوٹے ہوئے قدموں کو ذرا تھام لو شافی
منزل ہے بہت دور ابھی میرے سفر کی

واعظ کی سنے بات نہ زاہد کی سنے گا
مانے گا فہیم اب تو خدا ترے بسر کی

کہدو یہ فہیم آج زمانے میں بشر سے
دیتا ہے مسیحا ہی دوا دردِ جگر کی

غزل

اس جہاں میں ہم نفس کیا چاہیے
زندگی کیا ہے اشارا چاہیے

لٹ چکا ہے زندگی کا کارواں
اب کوئی پُر خار صحرا چاہیے

جنگ شیطاں سے ہے مومن سے نہیں
ساتھ تیرا اے مسیحا چاہیے

کوچۂ قاتل میں یارو لے چلو
اہلِ محفل کو تماشا چاہیے

مشکلیں آئیں تو کچھ پروا نہیں
ابنِ مریم کا سہارا چاہیے

اے فہیم آ جائے گا ابنِ خدا
اس سے ملنے کی تمنا چاہیے

غزل

محبت کا عَلم کر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں
لعینِ شیطاں کدھر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

تیری رحمت سے دنیا میں اجالا ہی اجالا ہو
جہاں تک بھی نظر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

برائی کا گناہوں کا جفاؤں کا عداوت کا
نشہ سارا اتر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

کھڑا ہے سامنے جام ہلاکت ہاتھ میں تھامے
وہ دشمن ہم سے ڈر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

نشانِ کافری کے سامنے جھک جائے یہ دنیا
ہر ایک عاصی سدھر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

خودی سے تم ابھر جاؤ یہ کہتا ہے فہیم اپنا
یہ چمن خوشیوں سے بھر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

قربان مرادآبادی

ڈی۔ اے ہیریسن نام۔ تخلص قربان۔ ۱۲ مارچ ۱۹۱۹ء آبا و اجداد کے وطن مرادآباد میں ولادت ہوئی۔ انگریزی ادب اور اُردو ادب میں ایم۔ اے کیا۔ الٰہ آباد سے منشی کامل (فارسی) اور اعلیٰ قابلیت (اُردو) کے امتحانات پاس کئے۔ بعد میں بی۔ ٹی کیا۔

مُلازمت کا آغاز اردو، فارسی معلّم کی حیثیت سے کیا بعد میں ریلوے تعلیمی محکمہ میں انگریزی ادب کے لیکچرار کی حیثیت سے تقرّر ہوا۔

تعلیم کے دوران شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا اور ۱۹۳۸ء سے باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدائی دَور میں نفیس الکلام حکیم محبوب علی خاں اختر فیروزآبادی کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ ان کی وفات کے بعد سلسلۂ شاعری منقطع ہو گیا اور نثر نگاری کی طرف توجّہ دی۔ بہت سے افسانے۔ مقالے۔ ڈرامے لکھے جو مقتدر رسالوں کی زینت بنے۔

ایک عرصہ بعد خوش قسمتی سے اُستادِ زماں حضرت علاّمہ منشی بشیشور پرشاد مُنوّر لکھنوی سے فخرِ تلمذ حاصل ہوا۔ اُستاد کی وفات کے بعد ان ہی کے ایماء پر جناب پادری ایس ایس ریحانی لکھنوی مرحوم سے مشورۂ سُخن کیا۔ ان کے انتقال پُرملال کے بعد اُستادِ دوراں عالی جناب طُرفہ قریشی بھنڈالوی سے فیض حاصل ہوا۔ اب علاّمہ رتن پنڈوری سے فیض حاصل ہے۔ نثر میں شیکسپیر کی کہانیاں، ترجمہ

غلام اینڈ ولس اور شیر (برنارڈ شا) ڈرامہ مسیح دو جہاں اور فکرِ حسین و سمن زار شائع ہوچکی ہیں۔ "فکرِ حسین" پر یوپی اردو اکیڈمی نے انعام سے نوازا ہے نظم میں مثنوی داستانِ عجب عرف حیاتِ مسیح زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکی ہے۔

مُلازمت سے سُبکدوش ہوجانے کے بعد سہارنپور میں مستقل طور سے قیام ہے۔ کُل ہند مسیحی اُردو مصنفین کانفرنس و مشاعرہ منعقدہ ۱۳، ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء دہلی میں وقارِ سُخن کے اعزازی خطاب سے نوازا گیا۔ کل ہند مسیحی اُردو مصنفین انجمن نے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے منتخب کیا ہے۔ ہینری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے سہ ماہی رسالہ "ہما" لکھنؤ کا نائب مدیر ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

چند آرائے گرانقدر

انجمن ترقیِ اُردو شاخ سہارنپور

محترم جناب ڈی اے، ہیریسن قربانؔ کی خدمت میں ہدیۂ سپاسنامہ

جناب ڈی۔ اے ہیریسن قربانؔ صاحب مسیحی دُنیا میں اُردو کے مترجم، مؤلف اور مصنف کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن ادبی سطح پر آپ ایک بُلند مقام رکھتے ہیں شعر و افسانہ، تنقید و تحقیق سبھی اصنافِ ادب کو آپ نے فنکارانہ چابکدستی اور عالمانہ بصیرت کے ساتھ برتا ہے۔ آپ کی شاعری میں سادگی و روانی اور نثر میں خوبصورت اور برمحل جملوں کا استعمال آپ کو اپنے عہد کے ادیبوں اور شاعروں میں ایک خاص مرتبہ دلاسکا ہے۔ ہندوستان اور بیرونِ ہند بھی آپ کی تخلیقات بڑی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

سہارنپور کی انجمن ترقی اُردو اور تمام ادب دوست اس بات پر فخر

محسوس کرتے ہیں کہ قربانؔ صاحب ہمارے ہیں۔

اردو اکاڈمی اُتر پردیش نے قربانؔ صاحب کو جو اعزاز دیا ہے اس پر شہر کے تمام علمی اور ادبی حلقے آپ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ظہور احمد ظہورؔ (صدر)

انجمن ترقی اردو۔ شاخ سہارنپور

۵ مئی ۱۹۸۱ء

اُستاد طرفہؔ قریشی بھنڈالوی:۔

قربانؔ صاحب عیسائی جماعت کے بہترین ادیب و شاعر ہیں ان کی چھوٹی بڑی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں ان کا کلام نظم و نثر ہند و پاک کے موقر رسائل و اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے قربانؔ صاحب ایک خوش فکر و باوقار شاعر ہی نہیں۔ اعلیٰ درجہ کے نثر نگار بھی ہیں، پُر مغز مقالے بھی لکھتے ہیں اور بہترین اصلاحی افسانے بھی۔ ان کی شاعری میں جو خاص صفت ہے وہ سہل ممتنع ہے اور اس صفت میں جو کمال انھیں حاصل ہے وہ دوسروں کے یہاں کم پایا جاتا ہے۔ زبان کی صحت اور عروض و قواعد کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ انکی اُستادانہ شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

طرفہ قریشی

ڈاکٹر طالبؔ شاہ آبادی ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی۔ایم۔او۔ایل

قربانؔ صاحب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ہندوستانی مسیحیوں میں اُردو اور فارسی میں اعلیٰ اسناد حاصل کرنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ قربانؔ صاحب

اُنھیں میں سے ایک ہیں۔ اردو فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ساتھ ہی انگریزی زبان وادب میں ایم۔ اے کیا۔ قربان جتنے پڑھے لکھے ہیں اتنے ہی حلیم اور فروتن ہیں۔ انمیں غرور اور تکبّر کی بُو تک نہیں آئی۔

قربان اعلیٰ درجہ کے مترجم بھی ہیں وہ انگریزی کی بعض کتابوں کے مختصر ترجمے بھی شائع کر چکے ہیں جن میں شیکسپیئر کی کہانیاں بہت مقبول ہیں۔

وہ ڈرامہ نویس بھی ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک نہایت ہی اعلیٰ ڈرامہ "مسیح جہاں" شائع ہو چکا ہے۔ مسیحی شاعری میں قربان غالباً پہلے شاعر ہیں جنھوں نے خداوند یسوع مسیح کی داستانِ حیات اور آپ کے ارشادات کو مثنوی کی ایک مقبول ترین بحر (متقارب مثمن محذوف یا مقصور) میں نظم کیا ہے۔ لہٰذا اگر میں یہ کہوں کہ قربان کی یہ تازہ ترین شعری تصنیف داستانِ عجب اردو میں مسیحی مذہب سے متعلق غالباً پہلی طبع زاد مثنوی کا درجہ رکھتی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

نثر میں سادہ نویسی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ قربان نثر بھی سادہ لکھتے ہیں اور نظم بھی۔ قربان ہمارے مسیحی شعرائے اردو کے لئے باعثِ ناز ہیں وہ بہت سوچ سمجھ کر قلم کو حرکت دیتے ہیں۔

سیّد حسن عبّاس۔ بہار یونیورسٹی مظفّر پور

اُردو والوں کے لئے یہ امر باعثِ مسرّت ہے کہ ایک مسیحی شاعر اور ادیب اُردو کے سرمایہ میں روز افزوں اضافہ پہ اضافہ کرتا جا رہا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو والے کہاں تک اس کی ہمّت افزائی کرتے ہیں دوسرے لفظوں میں اس کا

حق ادا کرتے ہیں۔

قربان صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ درس و تدریس میں گذارا ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ جو شخص درس و تدریس ہی میں مشغول رہے گا اس میں کتنی صلاحیتیں ہوں گی۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل سے باہر ہے۔ فکرِ حسین" سمن زار — مثنوی داستانِ حیات، شیکسپیئر کی کہانیاں۔ غلام اندروکلس وغیرہ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے اور تجربے کے بعد ہی لکھا ہے۔ شعر گوئی میں اتنی ساری خوبیوں کے حامل شخص کو وقارِ سخن کا خطاب بہت پہلے مل جانا چاہیئے تھا۔ ان کا شعری آہنگ اتنا سجل اور مترنم ہے کہ شاید ہی کوئی رسالہ ہو گا جس میں ان کی تخلیقات کو بلند مقام حاصل نہ ہوا ہو۔

ممتاز الشعراء، لسان الہند استاذی
علامہ رتن پنڈوروی صاحب مدظلہٗ

قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ تحیّر خیز ہے جس کے زیرِ اثر بعض طبائع ہمہ گیر اور ہمہ رس معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ ان میں ایک شخصیت حضرت قربان کی بھی ہے۔ آپ جہاں اردو کے نامور شاعر ہیں وہاں ادیب لبیب اور مسیحی ادبیات کے عاشق ہیں اس ضمن میں آپ کی متعدد کتب خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں مثلاً حیاتِ مسیح۔ فکرِ حسین۔ شیکسپیئر کی کہانیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حال ہی میں آپ کی بے نظیر اور نادر تصنیف" اردو کے مسیحی شعراء"

منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہی ہے۔ امید ہے شائقین ادب اس کا خیر مقدم کریں گے۔ اور یہ نادر تذکرہ اپنی برق پاش تجلیات کی رعنائیوں سے دُنیائے ادب کو مجلّی کر دے گا۔ خدا حسنِ قبول روزی کرے۔

خاک نشیں :۔ رتن پنڈوروی

ادیبِ ملّت جناب ہنری ولیم ہما میرٹھی

قربانؔ صاحب کی مثنوی دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو زبان پر وہ قدرت رکھتے ہیں، شاعری میں ان کی صنّاعی کے باوجود صفائی۔ روانی۔ برجستگی وہ فنکاری ہے جو کم شعراء کو نصیب ہے۔ ان کا اندازِ فکر کافی بالغ نظر آتا ہے۔ اُردو شاعری میں قربانؔ صاحب دھیرے دھیرے اس مقام کو پہنچ چکے ہیں جہاں وہ اپنے معاصرین سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

مسیحی دُنیا کے اس کہنہ مشق اور مشّاق شاعر کا اَدبی مستقبل بہت ہی درخشاں ہے۔ اپنے اشعار کی بدولت یہ اپنی انفرادی عظمت کے نقوش قائم کر چکے ہیں۔ اُردو نواز اور مسیحی قوم ان پر جتنا فخر کرے وہ کم ہے۔ یہ کہنا بجا ہے کہ قربانؔ صاحب ایک متین۔ تجربہ کار مشّاق اور صاحبِ نظر شاعر ہیں۔ خوش گوئی ان کا طرّہ امتیاز ہے۔ زبان نرم اور شیریں ہے اور شعر کہنے کا انداز بڑا دلکش ہے۔ شعر کے معائب اور محاسن پر بھی اچھّی نظر رکھتے ہیں اور شعر بڑے مشاقانہ انداز میں کہتے ہیں۔ ●●۔

توصیفِ مسیحا

تیرا در ہے مخلصی کے واسطے
تیرا سر ہے بندگی کے واسطے

کون تھا تیرے سوا جو دار پر
جان دیتا آدمی کے واسطے

تو نے دُنیا میں سہے کیا کیا نا غم
مجھ سے بیکس کی خوشی کے واسطے

مرحبا لیکر نجاتِ دائمی
آ گیا وہ ہر کسی کے واسطے

بہہ رہی ہے جو شرابِ کلوری
پی رہا ہوں بے خودی کے واسطے

ظلمتِ عصیاں نے جب گھیرا ہمیں
آ گیا تو روشنی کے واسطے

بُلبلہ پانی کا ہے قُربان وہ
مرتے ہیں جس زندگی کے واسطے

بڑا دن

کیسی بدلی ہے زمانے کی فضا آج کی رات
دونوں سجدے میں جھکے ارض و سما آج کی رات

آسمانوں سے یہ آئی ہے صدا آج کی رات
پردۂ وہم و گماں چاک ہوا آج کی رات

اک نئے عہد کی تہذیب کا آغاز ہوا
جلوہ افروز ہے انساں میں خدا آج کی رات

عدن کے باغ میں جو حکمِ سزا آیا تھا
ٹل گیا ٹل گیا وہ حکمِ سزا آج کی رات

مل گئی حضرتِ انساں کو حیاتِ جاوید
منہ چھپائے ہوئے پھرتی ہے قضا آج کی رات

مانگ لو مانگنا ہے جو بھی تمہیں اے قرباں
ہو گی مقبول جو مانگو گے دُعا آج کی رات

صلیب

کیا خوب معجزات دکھائے صلیب نے
لاکھوں گناہگار بچائے صلیب نے

ظلم و ستم کے داغ مٹائے صلیب نے
امن و اماں کے گیت سنائے صلیب نے

برباد کر دیا تھا جو شیطاں نے خلد میں
اُجڑے چمن میں پھول کھلائے صلیب نے

دیکر جہاں کو اس نے محبت کا درسِ نو
تاریکیوں میں دیپ جلائے صلیب نے

ڈاکو کو وقتِ مرگ بھی جنت ہوئی نصیب
کلماتِ خوشگوار سنائے صلیب نے

دل سے تمام داغ گناہوں کے دُھل گئے
چشمے حیات کے جو بہائے صلیب نے

سب زندگی کے معنی و مطلب بدل گئے
اُلفت کے ایسے درس پڑھائے صلیب نے

قربان یہ کمال ہے ایک بوند خون میں
سب رنج و غم ہمارے مٹائے صلیب نے

ایسٹر

ابنِ مریم پہ میری جان فدا ہے یارو
مر کے جو قبر سے پھر آج جیا ہے یارو

میرے عیسیٰ نے اجل کو بھی کیا ہے پسپا
موت سے ورنہ کہیں کوئی بچا ہے یارو

گوشۂ قبر منور ہے ضیاء سے اس کی
پردۂ خاک سے جلوہ نما ہے یارو

دشمنوں نے جسے پامالِ ستم کر ڈالا
قبر کے بند سے آزاد ہوا ہے یارو

شرم سے منہ بھی چھپائے ہوئے پھرتی ہے اجل
سامنے آنے سے محبوب قضا ہے یارو

جن کو انکار تھا اعجازِ مسیحائی سے
اُن کے ہونٹوں پہ بھی اب ذکرِ خدا ہے یارو

ہر طرف عیش و مسرت کی سجی ہے محفل
لڑکھڑاتی ہوئی مستی میں قضا ہے یارو

ہم نے قرباںؔ کو دیکھا ہے فنا گشتۂ عشق
اور پھر کون سزاوارِ بقا ہے یارو

غزل

اُٹھائے دوش پہ ہم آپ اپنی دار چلے
ہے اپنے حوصلے پہ جس کو اعتبار چلے

گلوں نے ساتھ دیا ایک دو قدم لیکن
تمام راہ میرے ساتھ ساتھ خار چلے

یہ کیسی تشنہ لبی ہے ہوئی نہ سیرابی
اگرچہ دورِ مئے عشق بار بار چلے

تمہارے ہاتھوں رہا اب غمِ جہاں یارو
بساط بھر تو ہم اپنی اسے نکھار چلے

ہمارے بعد کی نسلیں نبھائیں گی کیسے
جہاں میں ہم تو کسی طور سے گذار چلے

بکھر تا کیوں نہ میری زندگی کا شیرازہ
ہوا کے دوش پہ کب تک کوئی سوار چلے

وہ جو کہیں صحیح ہم جو کہیں غلط قرباںؔ
مزا تو جب ہے ہمارا بھی اختیار چلے

——— از مثنوی داستانِ عجب ———

پادری کی لڑکی کو زندہ کرنا

ہوئے اب وہ پادری کے گھر کو رواں
ملے چند اسکے مُلازم وہاں

کہا غم سے "آقا ضرورت نہیں
مسیحا کو زحمت کی حاجت نہیں

وہ دختر تیری کر گئی انتقال
مقدر میں لکھا تھا رنج و مَلال

ملازم کی یہ بات سُن کر حضور
ہوئے لب کشا ہم چلیں گے ضرور

وہاں جا کے دیکھا تو کہرام تھا
جو حاضر تھا وہ غرق آلام تھا

کہا آپ نے کیوں ہے محشر بپا
لبوں پہ ہے کیوں سب کے آہ و بکا

یہ لڑکی تو سوتی ہے آرام سے
تمہیں خوف ہے موت کے نام سے

ہنسے سُن کے سب ابنِ مریم کی بات
حقیقت میں وہ کر گئی تھی وفات

گئے آپ بے جان لڑکی کے پاس
تھے ہمراہ مادر پدر بدحواس

چھُوا جا کے بے جان بچّی کا ہاتھ
کہا اس سے لطف و محبّت کے ساتھ

مرا حکم ہے دُخترِ نیک خو
تو اُٹھ کر کھڑی ہو مرے روبرو

یہ آواز کانوں میں جب دم پڑی
ہوئی اُٹھ کے بے جان لڑکی کھڑی

تعجّب سے دیکھا اِدھر اور اُدھر
ہجوم ایک لوگوں کا آیا نظر

وہ معصوم گھبرائی کیا راز ہے
خوشی کی ہے یا غم کی آواز ہے

کہا آپ نے کچھ کھلا دو اسے
مقوّی کوئی شے پلا دو اسے

لوقا $\frac{8}{49-56}$

قطعات

رباب خدا میں کوئی اُن سا نہ ملے گا
رہبر بہت ملیں گے آپ کو عیسیٰ نہ ملے گا

ڈھونڈیں گے اگر آپ محبت کی مثالیں
قربانؔ کہیں دار کا سایا نہ ملے گا

اک مُرجھائی کلی ہو جیسے
رات بھر شمع جلی ہو جیسے

یوں اس طرح کٹی ہے قرباںؔ
ناؤ کاغذ کی چلی ہو جیسے

دیکھئے صفحہ ۲۹۳

کامل

اسمِ گرامی برٹی ٹرنر۔ کامل تخلص۔ ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ایم۔ اے بی۔ ٹی ... کرسچن ہائی اسکول بدایوں کے پرنسپل ہیں ۱۹۵۶ء سے شاعری کا آغاز ہوا اور جناب رونق بدایونی سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔

کلام صاف۔ سلیس اور عام فہم ہوتا ہے۔ کم لکھتے ہیں رسالوں میں کلام شائع کرانے کا شوق نہیں ہے۔

نمونۂ کلام

توصیفِ مسیحا

وہ جس نے کفر کا نقشہ زمانے سے مٹایا ہے
وہ جس نے صورتِ انساں میں نور اپنا دکھایا ہے

وہ جس نے اپنی رحمت سے مریضوں کو شفا بخشی
وہ جس نے قم بہ اذنی کہہ کے مُردوں کو جلایا ہے

وہ جس نے پیار کی شمع جلائی تھی زمانے میں
وہ جس نے ظلمتوں میں نور کا دریا بہایا ہے

وہ جس نے حکم سے اپنے چلائے سینکڑوں لنگڑے
وہ رُوحُ اللہ کا جس نے لقب دُنیا میں پایا ہے

وہ جس نے بیکسوں کو اپنے سینہ سے لگایا تھا
وہ جس نے حق سے ملنے کا ہمیں رستہ دکھایا ہے

اُسی ابنِ خدا کامل بشر سے میرا مطلب ہے
صلیبِ پاک پر اپنا لہو جس نے بہایا ہے

تری کشتی کو اے کامل وہی ساحل پہ لائے گا
کہ جس نے سینۂ امواج پہ چل کر دکھایا ہے

۱ مئی ۱۴ / ۲۲ تا ۲۳

غزل

لی کے لب پہ ہنسی پھول پہ نکھار آیا
چمن میں جبس گھڑی وہ جانِ صد بہار آیا

فس میں ایک زمانہ تو میں گذار آیا
الٰہی خیر کہ پھر موسمِ بہار آیا

سی نے حق و صداقت کا ذکر جب چھیڑا
زبانِ دہر پہ ذکرِ صلیب و دار آیا

ہو سے غنچوں کو سینچا گلوں کو اشکوں سے
بہر طریق گلستاں کو میں سنوار آیا

سی کو دین سے کھویا کسی کو دنیا سے
سکوں نہ پھر بھی تجھے اے نگاہِ یار آیا

پلا گیا نہ رہِ عشق میں تو تنگ آکر
میں سر سے بارِ غمِ زندگی اتار آیا

قفس نصیب ہوا آشیاں جلا کامل
مجھے بہار کا موسم نہ سازگار آیا

غزل

زیزاں کیوں نہ ہوں شیخ و برہمن سے جہاں والے
خدا سے دور رکھتے ہیں اُنھیں یہ درمیاں والے

ریبوں کی وہ ہستی ہے غریبوں کا وہ سینہ ہے
بنالتے ہیں نشانہ جس کو سب تیر و کماں والے

نھیں اتنی بھی اب فرصت نہیں پھولوں کی دُنیا سے
شہیدانِ چمن کو یاد کرلیں گلستاں والے

نہ آوازِ جرس ہے اور نہ گردِ کارواں کامل
خدا جانے کہاں پہنچے ہمارے کارواں والے

کیفی

جان وکٹر نام تخلص کیفی ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۸ء راجہ جنگ ضلع لاہور میں پیدا ہوئے
۱۹۲۸ء میں کرسچین ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ہائی اسکول بارہ پتھر سیالکوٹ میں داخل
ہوئے۔ وہاں کے ہیڈ ماسٹر جناب مولا بخش صاحب کی تحریک سے شوقِ شاعری
پیدا ہوا۔ اسکے بعد راولپنڈی کالج میں داخلہ لیا۔ اردو، فارسی کے ساتھ بی۔ اے پاس
کیا وہاں کالج میگزین میں اردو اور پنجابی میں نظم و نثر لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۴۰ء میں
فوج میں داخل ہوئے اور دوسری جنگِ عظیم میں غیر ممالک کی سیر و سیاحت کا موقع
حاصل ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں کپتان (کیپٹن) کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ انگریزی
ادب میں ایم۔ اے پاس کیا۔

آجکل فرید آباد (ہریانہ) میں مقیم ہیں۔ کلام نعتیہ و حقانی ہے۔ بہت زیادہ
نہیں لکھتے نظموں سے زیادہ لگاؤ ہے جن میں جوش اور ولولہ بھرا ہوا ہے۔ آپ کے
بڑے بھائی علامہ گریفن جونز شرر گوجرانوالوی بہت اچھے شاعر ہیں ان کے
دو مجموعے نقوشِ صلیب اور صلیبِ زندہ ہیں۔ ہندوستان میں ہنری مارٹن
انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز نے شائع کئے ہیں۔ شرر صاحب مستقل
طور پر انگلستان میں مقیم ہیں۔

"نقوشِ صلیب" پر اردو اکیڈمی بہار نے انعام دیا ہے۔ •

توصیفِ مسیحا

زندگی کے راستے سنسان تھے تیرے بغیر
بے کس و بے آسرا انسان تھے تیرے بغیر

شدّتِ دردِ گناہ سے ہو رہے بے حال تھے
یہ سراپا بے سروسامان تھے تیرے بغیر

ہر قدم پیشِ نظر پھوٹی ہوئی تقدیر تھی
ظلمتوں کے چار سو طوفان تھے تیرے بغیر

کیا ہے انساں اور اسکی آخری منزل ہے کیا
اس حقیقت سے بشر انجان تھے تیرے بغیر

تو نے آکر زندگی کا راز افشا کر دیا
عاقبت سے بے خبر انسان تھے تیرے بغیر

تیرے آگے جھک گئے دُنیا کے لاکھوں تاجدار
غیر معبودوں پہ جو قربان تھے تیرے بغیر

کھِل گیا آمد سے تیری گلستانِ زندگی
زندگی کے سب چمن ویران تھے تیرے بغیر

بڑا دن

آج دھرتی میں محبت کا خدا آیا ہے
مہر کا فضل کا رحمت کا خدا آیا ہے

چھوڑ کر عرشِ بریں اہلِ زمیں کی خاطر
عظمت و حشمت و رفعت کا خدا آیا ہے

اسکی آمد نے دی شیطاں کو شکستِ مطلق
اس قدر طاقت و قوت کا خدا آیا ہے

آگئے پیار کے دن ختم ہوئی شامِ الم
میری دُنیا میں مسرت کا خدا آیا ہے

نوعِ انساں کو نئی راہ دکھانے والا
عرش سے فرش پہ جنت کا خدا آیا ہے

پیار دشمن سے ہمیں کرنا سکھایا جس نے
آج وہ مہر و محبت کا خدا آیا ہے

یوں تو لاکھوں ہی خدا آئے جہاں میں لیکن
آج دیکھو تو حقیقت کا خدا آیا ہے

توڑ دے گا وہ جو باطل کے ہیں ایوان و قصور
راہِ حق اور صداقت کا خدا آیا ہے

اب کہاں موت ترا ڈنک کہاں تیری فتح — زندگی اور قیامت کا خدا آیا ہے

ہو کے تم نغمہ سرا کیفی خوشی سے ناچو
اپنے گھر آج مسرت کا خدا آیا ہے

وطن

گو ہمارے پاس غیروں کے سے اٹم بم نہیں — ہم صفِ اوّل کے ملکوں میں کسی سے کم نہیں
گونجتی ہے چار سو آواز ہندوستان کی — ماسکو لنڈن یا واشنگٹن سے دلّی کم نہیں
گھر میں بیٹھا کوئی دے سکتا ہے گیدڑ بھبکیاں — سامنے آئے ہمارے یہ کسی میں دم نہیں
اور آگے کوہساروں سے ہیں اپنی منزلیں — راہ کچھ مشکل تو ہے پر ڈرنے والے ہم نہیں

ہندوستانی سپاہی

سرحدوں پر تو کھڑا رہتا ہے یوں سینہ سپر — جیسے سینے میں ترے ہے آہنی قلب و جگر
رفعتوں میں کوہساروں کی ترا کاشانہ ہے — راہ میں تیری کبھی صحرا کبھی کاشانہ ہے
قابلِ تقلید ہے ہر رسم وفاداری تیری — ہر گھڑی بیدار ہے دنیائے خودداری تیری
مذہب و ملت کا تجھ کو کچھ نہیں ہے امتیاز — تو سپاہی الجھنوں سے ہے سراسر بے نیاز
تو جہاں میں ہے درخشندہ مثالِ آفتاب — ہے ترا ہر کارنامہ بے مثال و لاجواب
تو محافظ دیش کا ہے تو نگہبانِ وطن — تو فداکارِ وطن ہے تو ہی ہے شانِ وطن

غیر ملکوں کی نظر میں تیرا اونچا نام ہے
امن عالمگیر کا لب پر ترے پیغام ہے

اکتوبر ۱۵ : ۵۵

گُل امرتسری

جی ایم سنگھ نام۔ تخلص گُلؔ ۸ر اکتوبر ۱۹۲۲ء امرتسر میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۳۸ء میں میٹرک پاس کر کے فوجی خدمت اختیار کی اور بیرونِ ہند تشریف لے گئے ۱۹۴۳ء میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کی انڈین نیشنل آرمی میں کپتان کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ جنگی قیدی بن کر جیل میں رہے۔ فوج سے واپس آکر ۱۹۵۶ء میں علم الہیات حاصل کیا اور پادری کا منصب سنبھالا۔ شاعری کا شوق عرصہ سے ہے۔ حضرت رسؔا لکھنوی کے شاگرد ہیں کلام تمام نعتیہ ہے۔ رسؔا صاحب کے انتقال کے بعد کسی صاحب فن سے استفادہ نہ کر سکے۔ زبان میں پنجابیت نمایاں ہے۔ شاعری رسمیہ ہے تمام تر آورد ہے البتہ مسیحی عقائد کو شعر کے ڈھانچے میں بخوبی ڈھال لیتے ہیں۔ اپنے متعلق فرماتے ہیں ؎

میں ہوں انجیل کا مدّاح اے دِل مجھ کو دُنیا میں
صداقت کو عیاں کرنے سے شرمانا نہیں آتا
میں اپنی حسرتوں کی ترجمانی کر نہیں سکتا
سمجھتا ہوں مگر اوروں کو سمجھانا نہیں آتا

٥

بڑا دن

مسیحا کلامِ خدا ہو کے آیا
وہ صد نازشِ انبیاء ہو کے آیا

یہ راز اہلِ دانش نہ سمجھے ابھی تک
خدا کیسے ابنِ خدا ہو کے آیا

بشر تو بشر کہہ رہے ہیں فرشتے
ہمارا ابھی وہ رہنما ہو کے آیا

یقیناً کنارے پہ کشتی لگے گی
مسیحا میرا ناخدا ہو کے آیا

اسی دن کے اے گُل سبھی منتظر تھے
بڑا دن یہ بے شک بڑا ہو کے آیا

غزل

محبت یہی ہے عقیدت یہی ہے
مسیحا ملے میری چاہت یہی ہے

مجسم ہوا دینے فدیہ جہاں کا
بڑی اس کی ہم پر عنایت یہی ہے

مسیحا مسیحی کریں تجھ کو رسوا
تیری بارگاہ میں شکایت یہی ہے

تجھے جان کر بھی ہیں انجان رہتے
یہ ہے بیوفائی بغاوت یہی ہے

جسے تو نے بخشا وہ جنت میں پہنچا
حقیقت میں اے گُل قیامت یہی ہے

— غزل —

کسقدر دلکش ہے انساں کے لئے
دہر میں ابلیس کا بازار دیکھ

یوں تو کہتے ہیں سبھی ہے پارسا
کہنے والوں کا ذرا کردار دیکھ

بادِ سحری بن گئی بادِ سموم
برگِ گل اب بن گئی تلوار دیکھ

غزل

خونِ عیسیٰ میں جو دل کو دھو چکے — خُلد میں جانے کے قابل ہو چکے
دیکھ کر ابلیس کا جاہ و جلال — غافلوں نے منزلِ حقیقی کھو چکے
روزِ محشر کا نہیں کھٹکا ہمیں — کیونکہ ہم ابنِ خدا کے ہو چکے
ہائے وہ ساعت بھی کیا ہوگی عجب — کاٹنا ہوگا وہی جو بو چکے

وقت کیوں برباد کرتا ہے تو گِل
سُن یہ ہے وقت جو کبھی کے سو چکے

غزل

میں کتنا پیار کرتا ہوں یہ جتلانا نہیں آتا — مٹا ہوں نام پر تیرے یہ بتلانا نہیں آتا
میں ہوں انجیل کا شادی آدل مجھ کو دُنیا میں — صداقت کو عیاں کرنے سے شرمانا نہیں آتا
کنارے جا لگے گی کشتیِ عمرِ رواں میری — مسیحا ناخدا ہے مجھ کو گھبرانا نہیں آتا
وہ انساں لائق نورِ الٰہی ہو نہیں سکتا — جسے اپنی سیہ کاری پہ شرمانا نہیں آتا
میں اپنی حسرتوں کی ترجمانی کر نہیں سکتا — سمجھتا ہوں مگر اوروں کو سمجھانا نہیں آتا

تمہارے اضطرابِ دل کا حاصل کچھ نہیں اے گِل
تڑپتے ہو مگر اوروں کو تڑپانا نہیں آتا

مجبُور جالندھری

نام بنجمن فرینکلین۔ تخلص مجبور ۱۵ مارچ ۱۹۳۵ء روپڑ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ والد مشن اسکول میں ٹیچر تھے اور قلیل تنخواہ میں آٹھ بچوں کی پرورش کرنا مشکل امر تھا اس لئے پندرہ پندرہ برس کی عمر سے مُلازمت کا سہارا لینا پڑا دو سال کی ملازمت کے بعد ملک تقسیم ہوگیا ملازمت جالندھر ہی اسلئے آپ فوج میں داخل ہوگئے اور وہاں سے صوبہ دار میجر ہوکر ریٹائر ہوئے۔ اسکے بعد سے آئی ٹی آئی سودا لنسی میں مُلازمت کر رہے ہیں ۱۹۵۳ء سے شوق شاعری ہوا۔ جناب شوق جالندھری کی حوصلہ افزائی نے شاعر بنا دیا۔ تخلص بھی شوق صاحب کا عطیہ ہے۔ آجکل جالندھر میں قیام ہے۔

کلام اکثر مسیحی رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ محنت کر کے لکھتے ہیں۔ اکتساب فن کا شوق ہے۔ اگر مشق جاری رہی اور کسی اچھے اُستاد کا فیض حاصل ہو جائے تو اچھا کہنے لگیں گے۔

توصیف مسیحا

میرے لئے مسیح نے اپنا لہُو بہا دیا ۔۔۔ راہِ بقا صلیب ہے دُنیا کو یہ دِکھا دیا
گردیں مسیحِ پاک نے دُنیا کی نعمتیں عطا ۔۔۔ اُس کے حضورِ پاک میں جس نے بھی سر جھکا دیا

اپنے گلے لگا لیا یسوعؑ نے کتنے پیار سے
سب بے گناہ گنہگار کو نظروں سے جب گرا دیا۔
خود ہی عطا کرے گا وہ جو بھی میری مراد ہے
مَیں نے تو اس کے سامنے دامنِ دل بچھا دیا

غزل

مسیحا دُکھ میرے کیا کم نہ ہوں گے
وہ دن کب آئے گا جب غم نہ ہونگے
گُناہوں نے کیا ہے دُور تجھ سے
کبھی یہ فاصلے کیا کم نہ ہونگے
ترے خونِ مقدّس کے جلائے
یہ توبہ کے دِیے مدّھم نہ ہونگے
تری بخشش کی ہم دینگے گواہی
کبھی مُنکر مسیحا ہم نہ ہونگے
مسیح ہو مہرباں مجبورؔ جس پر
اسے پھر زندگی کے غم نہ ہونگے

غزل

حسرت دید کو جب شوق ہوا دیتا ہے
کتنے بھولے ہوئے زخموں کا پتا دیتا ہے
ہچکیاں آنے کا انداز بتا دیتا ہے
کوئی بیمار کو جینے کی دُعا دیتا ہے۔
جانے کیا بات ہے اب صحرا نوردی کیلئے
دشت دیوانوں کو خود آپ صدا دیتا ہے
سیکھ لو رسم محبّت کسی پروانے سے
اس کا جل جانا بھی اک درسِ فنا دیتا ہے
سُنتے آئے ہیں کہ دستورِ محبّت ہے یہی
درد جو دیتا ہے وہ آپ دوا دیتا ہے
جانے کس جرم کی پاداش میں مجبورؔ خدا
بامشقت ہمیں جینے کی سزا دیتا ہے

محبوب بدایونی

نام ایس جے ولنگٹن۔ محبوب تخلص۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۱۹ء وطن بدایوں میں پیدا ہوئے۔ بی۔ ایس۔ سی تک تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کیا۔ مستقل طور پر بدایوں میں سکونت رکھتے ہیں ۱۹۴۰ء سے شاعری کے میدان میں قدم رکھا پہلے حضرت سبطین جہاں عبرت کے حلقۂ شاگردوں میں داخل ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد جناب رونق علی خاں رونق بدایونی سے استفادہ کرتے ہیں۔

کلام میں سلاست ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہے۔

غزل

واپس ہوئی میری دعا باب اثر سے
عصیاں کا تھا اک بارِ گراں ٹل گیا سر سے

یہ سچ ہے کہ دنیا مری تاریک ہے یارب
ہو سکتی ہے روشن تری رحمت کے اثر سے

ہیں جن کی نظر میں تری زلفیں ترا چہرا
محفوظ وہ رہتے ہیں غم شام و سحر سے

تنگ آ کے زمانے سے ترے در پہ پڑے ہیں
اٹھ کر نہیں جائیں گے کہیں اب ترے در سے

اٹھی تو ہے رحمت کی گھٹا جھوم کے ہر سو
مانگو یہ دعا کشتِ گنہ گار پہ برسے

حالِ دلِ مایوس بتاؤں گا میں ایسے
مل جائے گی فرصت جو مجھے دردِ جگر سے

جنت میں وہ لے جائیں گے امت کو یقیناً
محبوب پھر آئیں گے وہ اللہ کے گھر سے



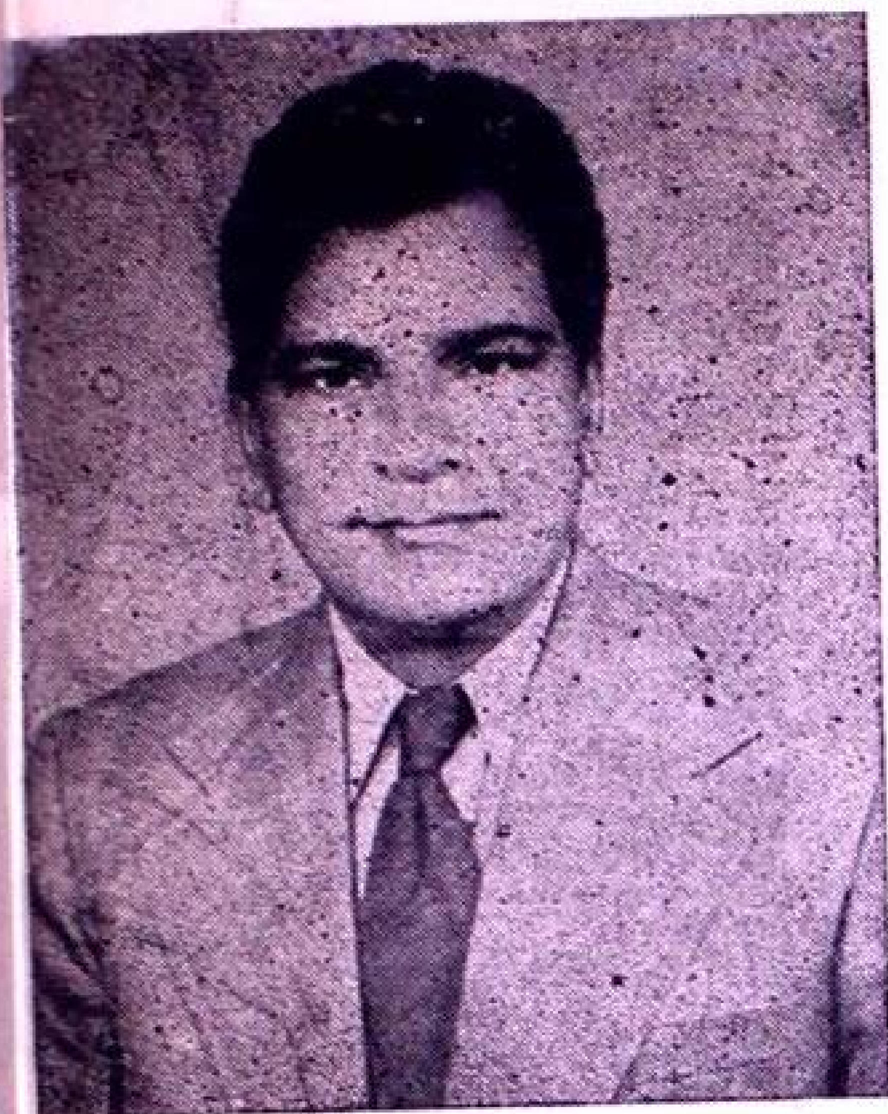
MAG Page-277



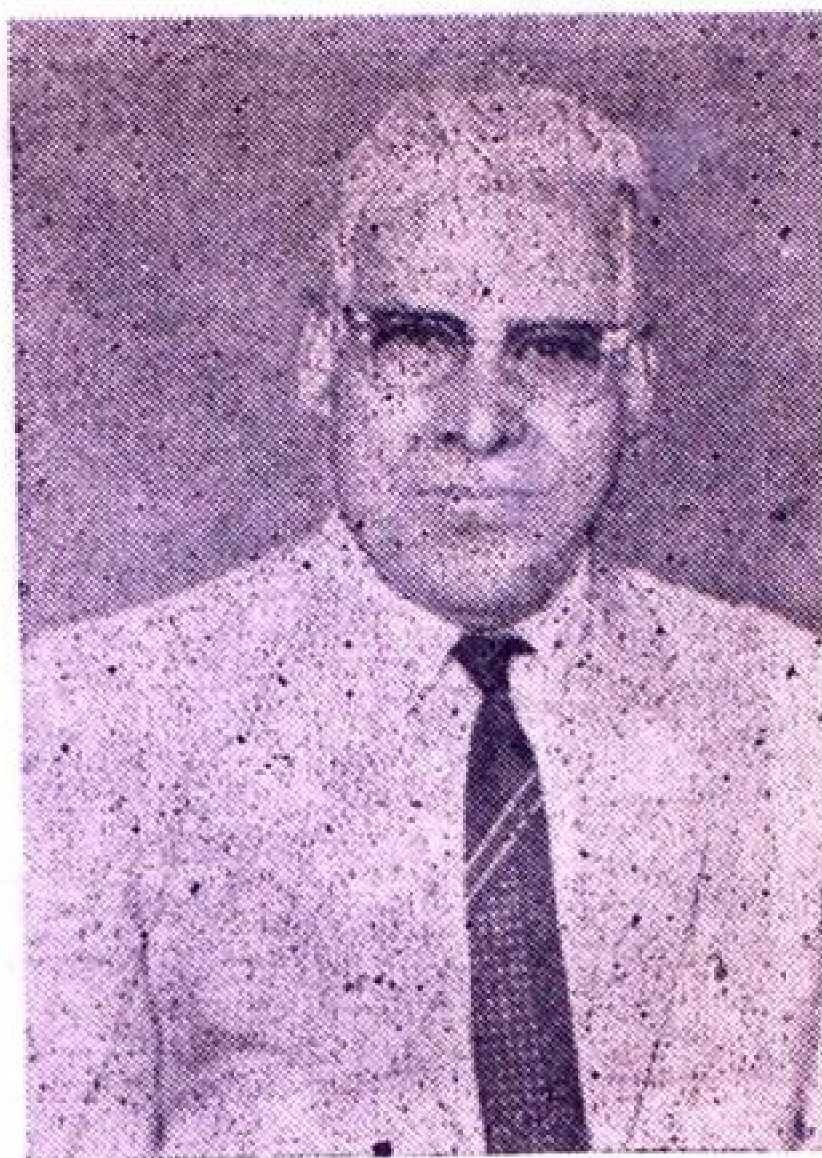
NAZ Page-288



B.S. NASIR Page-299



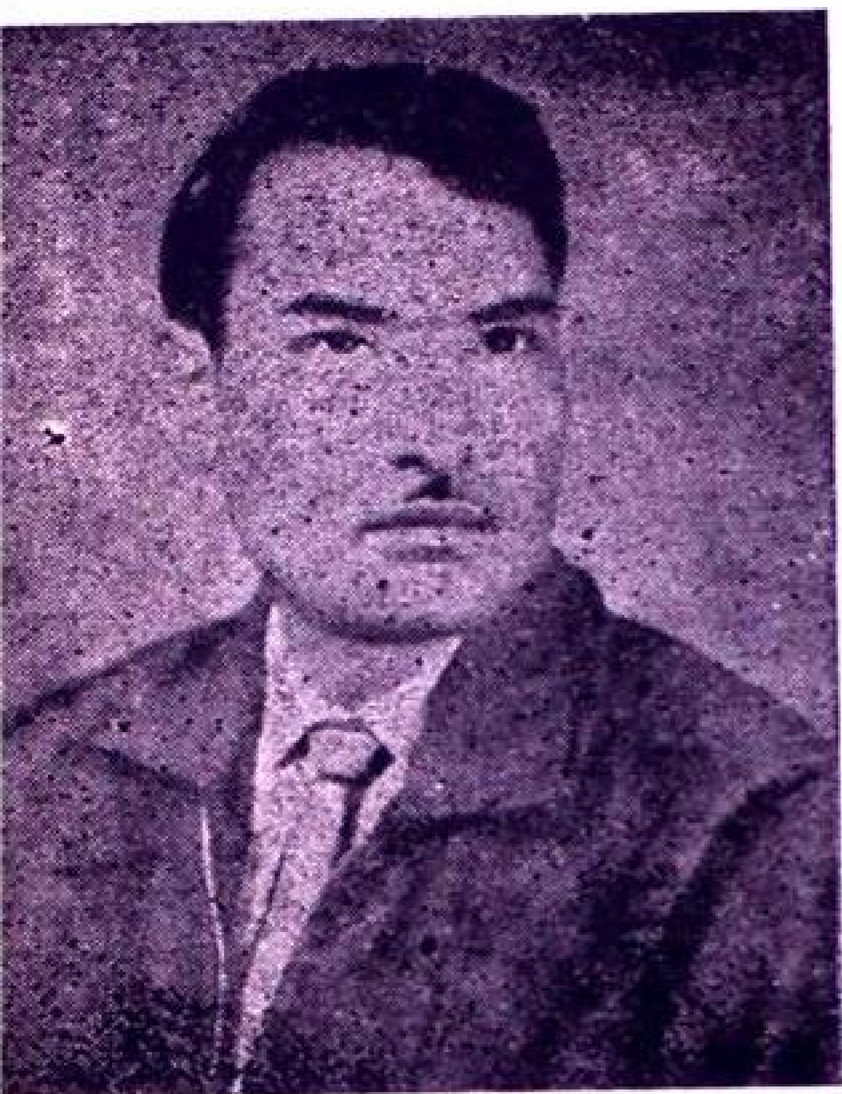
KAIFI Page-254



MEHBOOB Page-262



GUL Page-257



MASUM Page-264



MANZOOR Page-268



MAUJ Page-270



QURBAN'S BOOK 'Flkar Hasan' U.P. Urdu Adademy Awarded Released.

بڑا دن

فرش سے یہ عرش تک شہرہ ہوا
آج شاہِ دوجہاں پیدا ہوا

تھا گناہوں کا اندھیرا ہر طرف
جب مسیحائے زماں پیدا ہوا

مل گئی اس کو حیاتِ جاوداں
جو بھی انساں آپ پر شیدا ہوا

جب زباں پر آگیا نامِ مسیح
ظلمتوں میں نور کا تڑکا ہوا

تو نے دیکھا جس کسی بیمار کو
رحمتوں سے وہ تیری اچھا ہوا

ہر مصیبت سے گذر جاتا ہوں میں
کلمۂ ابنِ خدا پڑھتا ہوا

اس لئے پُرکیف ہے سارا جہاں
ابنِ حق نورِ خدا پیدا ہوا

میری بس محبوبؔ یہ ہے آرزو
مَیں مَروں عیسیٰ کا دم بھرتا ہوا

غزل

بیکسی ہے کہ بے بسی کیا ہے
غم کے ماروں کی زندگی کیا ہے

ان کے دل پر نہ ہو اثر نہ سہی
آہ کرنے میں ہرج ہی کیا ہے

جب نہیں سوزشِ غمِ جاناں
پھر مرے دل میں آگ سی کیا ہے

تیری جنّت تو خوب ہے واعظ
کوئے جاناں کی بات ہی کیا ہے

روز مرتے ہیں روز جیتے ہیں
اک تماشا ہے زندگی کیا ہے

زندگی خواب ہی سہی لیکن
پھر بھی دلچسپ ہے بُری کیا ہے

میرے گھر آرہے ہیں وہ محبوبؔ
آج دیکھوں گا تیرگی کیا ہے

معصوم ۔ امرتسری (بھنڈالوی)

نام جارج سویٹ۔ تخلص معصوم۔ ۳ نومبر ۱۹۳۲ء اپنے وطن موضع بھنڈال۔ گورداس پور میں پیدا ہوئے۔ مشن اسکول دھاریوال میں میٹرک پاس کیا اس کے بعد بی۔ اے؛ بی ایڈ پاس کرکے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔ بچپن سے شوقِ شاعری پیدا ہوگیا اور پانچویں درجہ تک پہنچتے پہنچتے تُک بندی کرکے ایک مثنوی کہہ ڈالی۔ حضرت الیاس داس رسا کے شاگردوں میں شامل ہوئے ان کی وفات کے بعد راج کوی جناب پنڈت میلارام وفاؔ سے اصلاح لیتے رہے۔

پنجاب کے اچھے مسیحی شاعروں میں سے ایک ہیں۔

کلام مسیحی رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے اور مقبول عام ہیں۔ زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ تخیل کی بلند پروازیاں ہیں۔ الفاظ کا انتخاب نہایت موزوں ہوتا ہے۔

توصیفِ مسیحا ۔ غزل

کفر و باطل کو مٹانے کے لئے آپ آئے
راہ عرفاں کی دکھانے کیلئے آپ آئے

جامِ توحید پلانے کے لئے آپ آئے
تشنگی دل کی بجھانے کیلئے آپ آئے

عظمتِ زیست بڑھانے کیلئے آپ آئے
موت کو نیچا دکھانے کیلئے آپ آئے

دہر میں اپنی محبت کا اُٹھا کے طوفاں
قصرِ نفرت کو گرانے کیلئے آپ آئے

اپنی بخشش کا سہارا میرے دل کو دیکر　　سوئے ایماں کو جگانے کیلئے آپ آئے
بختِ معصوم کا اب کیوں نہ ستارہ چمکے
اس کو تابندہ بنانے کیلئے آپ آئے

بڑا دِن

میرے حبیب کی آمد ہے باغِ دنیا میں　　بہار دپھول کھلاؤ نجات کا دِن ہے
امید و فتح کا روزِ عظیم آ پہنچا　　اٹھو رباب اٹھاؤ نجات کا دن ہے
قبول کر چکا تم کو خدا مُبارک ہو　　دلِ حزیں کی دُعاؤ نجات کا دن ہے
جہاں کو بھیجا ہے حق نے سلامتی کا پیام　　چراغِ امن جلاؤ نجات کا دن ہے

ایسٹر

صلیب پر جسے کھنچوا دیا تھا دشمن نے　　وہ جس کو جان سے مروا دیا تھا دشمن نے
وہ جس کو قبر میں دفنا دیا تھا دشمن نے　　وہ جس پہ پہرہ بھی بٹھوا دیا تھا دشمن نے
کمال زور سے وہ تیسرے ہی دِن جی اٹھا
شکست موت کو دیکر وہ ہو گیا زندا
نئے سفر نئی منزل کا راستہ لیکر　　نیا یقین نیا شوق ولولہ لیکر
نئی اُمنگ نیا جوش و حوصلہ لیکر　　حیات و نور کی امید پُر ضیا لیکر
اُٹھے رسُول کہ دُنیا کو پھر نیا کر دیں
شعور و فہم سے دُنیا کو پُر ضیا کر دیں

غزل

میں دعاگو ہوں اب اُٹھا کے ہاتھ
دیکھیو بیمار پر شفا کے ہاتھ

موت اب سر اُٹھائے گی کیسے
اُس نے دیکھے تو ہیں خدا کے ہاتھ

زندگی بھر نہ تا کبھی اُٹھّے
وار شیطاں پہ کر جما کے ہاتھ

دلِ برگشتہ آ خدا کے پاس
منتظر ہیں ترے خدا کے ہاتھ

پار آخر وہی اُترتا ہے
جس کی کشتی پہ ہیں خدا کے ہاتھ

وہ عنایت کی بھیک دو کہ کبھی
پھر نہ خالی ہوں مجھ گدا کے ہاتھ

موت ہوگا نتیجہ عصیاں کا
کارِ عصیاں سے رکھ بچا کے ہاتھ

آگ سے کھیلنا نہیں اچھا
دیکھ پچھتائے گا جلا کے ہاتھ

جن پہ معصومؔ کا توکّل ہے۔
وہ فقط ہیں بس خدا کے ہاتھ



منظور لکھنوی

نام مجل مہندر داس۔ تخلص منظور۔ حضرت رسا لکھنوی کے فرزند اصغر ہیں۔ یعنی شاعری ورثہ میں پائی ہے۔

۲۸ نومبر ۱۹۳۰ء تاریخ ولادت ہے۔ انٹر اردو۔ فارسی انیکلر پاس کیا بعد ازاں ٹیکنیکل ڈپلومہ حاصل کیا۔ فی الحال چنڈی گڈھ انجینئرنگ کالج میں کام کرتے ہیں۔ بقولِ خود "حضرت رسا کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی میری بد قسمتی تھی کہ میں نے والد مرحوم سے جو کچھ سیکھا بہت کم سیکھا۔"

ان کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے چونکہ والد صاحب کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد کسی اُستاد سے مستفیض نہیں ہوئے اس لئے کلام میں فن کا مظاہرہ نہیں ہو پاتا۔ کلام نعتیہ ہے۔ واقعاتِ بائبل کا ذکر بھی جا بجا کرتے ہیں مگر کلام میں گہرائی اور گیرائی نہیں۔ لب یادہ اور تہ دو لٹیس ہیں۔ لکھنوی ہونے کے باوجود زبان پر پنجابیت کا زیادہ اثر ہے۔ شاید اس لئے کہ عمر کا بیشتر حصہ پنجاب میں گذارا۔ کلام میں حُبّ الوطنی کے جذبات بھی موجود ہیں۔ غزلیں طویل ہوتی ہیں۔ جن میں بعض شعر اچھے ہو جاتے ہیں۔

ہرادن

بیکسوں کا اور غریبوں کا سہارا آگیا
وہ خدائے برحق و منجی ہمارا آگیا

نور ہے جس کے منور ہیں زمین و آسماں
کبریا میرا میری آنکھوں کا تارا آگیا

جب یہ دیکھا بحرِ عصیاں میں بہے جاتے ہیں ہم
ناخدا کشتی کا بن کر وہ ہمارا آگیا

کیا دگرگاڑے گا لعیں اب ڈر نہیں مجھ کو ترا — میرا رہبر میرا شافی میرا پیارا آ گیا
دیکھ کر بادا جسے کرتے چلے سجدے مجوس — آج وہ چرنی میں مریم کا دُلارا آ گیا
ابتدا میں جو خدا کے ساتھ تھا جو تھا کلام — رازِ حق دُنیا میں کرنے آشکارا آ گیا
اس نے پہنا جامۂ انساں انساں کیلئے — تا بچیں عصیاں سے ہم شافی ہمارا آ گیا
جب سُنا منظور نے یہ آج ہے یوم کلاں
وہ بھی کرنے اپنے منجی کا نظارا آ گیا۔

غزل

رحمتِ حق کے سہارے سے سنبھلتے دیکھا — مَیں نے طوفان سے کشتی کو نکلتے دیکھا
یاد کر کرکے تجھے جیتا رہا فرقت میں — شبِ غم یوں دلِ مضطر کو بہلتے دیکھا
تیری تصویر کو جب ہم نے رکھا سینے پر — ہم نے پہلو میں نہ پھر دل کو مچلتے دیکھا
یاد جب آ گئے ایام مصیبت مجھ کو — پھر خوشی میں نہ کبھی دل کو اُچھلتے دیکھا
کسی کروٹ نہ ملا چین ترے عاشق کو — شبِ فرقت اُسے پہلو ہی بدلتے دیکھا
کر گئی اس کی درازی تو قیامت کو بھی مات
ہجر کے دن کو تو منظور نہ ڈھلتے دیکھا

ایسٹر

ہم گناہگاروں کی بخشش کو ہوا مصلوب وہ — کر گیا اپنے لہو سے فیض کے اسلوب وہ
چشمِ حق بیں میں یہ فدیہ کر گیا مرعوب وہ — بن گیا اس پیار سے ہر شخص کا محبوب وہ
اسکے اعجازِ مکرم کی زمانے میں ہے دھوم
اسکے اس کارِ مقدم کی زمانے میں ہے دھوم — سن امنجم۔ عالم۔

دوڑتی پھرتی ہے ہر سُو آج موجِ زندگی
ہر طرف نورِ مسیحائی کی ہے تابندگی
آج ہے آفاق میں خوشنودگی خرسندگی
کیوں نہ ہم دل سے کریں پھر جھُک کے اس کی بندگی

ہو گیا قائل جہاں شانِ مسیحائی کا آج
ہر طرف ہے نور اس کی حسن زیبائی کا آج

وطن

وطن سے مجھ کو اُلفت ہے وطن سے پیار ہے مجھ کو
میرا پیارا وطن میرے لئے دلدار ہے مجھ کو
وطن کی عزّت و حُرمت پہ اپنی جان دیتے ہیں
جو بدظن اس سے ہوں ہم اس پہ خنجر تان لیتے ہیں
جو ہم پہ چڑھ کے آئے گا مزا اس کو چکھا دیں گے
لہُو کی ندیاں ہم رزم گاہوں میں بہا دیں گے
ہمارا ہر جواں بھارت کی خاطر جان دے دیگا
ہمیشہ غیر پر وہ تیغ و خنجر بن کے برسے گا
سرِ جرمن کیا تھا جس نے نیچا وہ ہمیں تو ہیں
زمانے میں ہوا تھا جس کا سر اونچا ہمیں تو ہیں
شجاعت کو ہماری کوئی پوچھے جا کے ہٹلر سے
لیا تھا ہم نے کیسا کام اپنی تیغ و خنجر سے

موج زیبائی

نام نامی عبدالمعبود خاں عرف ڈبلیو اے صمد خاں۔ تخلّص موج محلّہ کلاں دہلی میں ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۹ء سنہ پیدا ہوئے دادا فیروز خاں احمدی فوج میں صوبیدار میجر تھے۔ چھ ماہ کی عمر میں والدہ کی وفات کے بعد دادا نے پرورش کی والد ماجد سے فارسی اور قرآن شریف پڑھا۔ والد صاحب جنڈ سے میں ریلوے کلرک تھے یہاں آپ کی ملاقات پادری اصغر علی صاحب سے ہو گئی اُن کی محبت نے دل پر بہت اثر کیا سوتیلی ماں کی سختی و ایذا رسانی کی وجہ سے گھر چھوڑ کر نکل گئے اور دہلی میں مسیحی صحبتوں میں شریک ہوتے رہے بالآخر دین عیسوی قبول کر لیا۔

حضرت حکیم صغیر حسن زیبا تلمیذ حضرت نوح ناروی کے شاگرد رشید ہیں اسی مناسبت سے زیبائی کہلاتے ہیں ؎

ہے نوح سے نسبت موج ہمیں زیبا نے یہ بخشا اوج ہمیں
ہم بحرِ سخن میں بڑھ بڑھ کر طوفان اٹھائے جاتے ہیں

فارسی کلام پر پروفیسر اختر امرتسری سے اصلاح لیتے رہے۔

اُستادوں میں شمار ہوتا ہے بہت سے لوگ آپ کی اصلاح سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ طرزِ ادا اور طرزِ بیان نہایت دلکش ہے۔ فصاحت و بلاغت سے کلام بلند پایہ ہو جاتا ہے۔

زبان میں حسن اور شیرینی ہے۔ فن پر عبور ہے۔ آل انڈیا مسیحی مصنفین اُردو کانفرنس منعقدہ ۱۳ ر ۱۴ ر اکتوبر ۱۹۷۹ء دہلی نے آپ کو بہارِ سُخن کے خطاب سے نوازا ہے۔ مجموعۂ کلام "موجِ سُخن" عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

سلام

امینِ عظمتِ کون و مکاں سلام تجھے / کلامِ پاک کے روحِ رواں سلام تجھے
دکھا دے جلوہ پھر اے حبرِ پاک سلام تجھے / اب آ جا سامنے پھر جانِ جاں سلام تجھے
میری حیات کا اک اک لمحہ تجھ پہ نثار / فدا ہوں تجھ پہ مرے جسم و جاں سلام تجھے
نمازِ دید کی حسرت ہے مضطرب ہوں میں / نظر پھر آ جا شہِ دو جہاں سلام تجھے
دکھا دے جلوۂ رنگیں لباسِ ہستی میں / چھپا ہوا ہے تو آخر کہاں سلام تجھے

کرم جو موجِ حزیں پر ہو مسیحِ کونین
لبوں پہ آئے نہ آہ و فغاں سلام تجھے

بڑا دن

ذرّہ ذرّہ حسنِ پیکر نور ساماں ہو گیا / بزمِ امکاں میں چراغاں ہی چراغاں ہو گیا
مسیحِ عالم کے آنے کی خبر پھیلی تمام / ہر شجر باغِ جہاں میں گل بداماں ہو گیا
رونقِ محفل ہوا انسانیت کا تاجدار / کارِ عالم بن گئے سرورِ انساں ہو گیا
اللہ اللہ اہتمامِ یومِ میلادِ مسیح / گوشہ گوشہ بزمِ ہستی کا درخشاں ہو گیا
کر گئی کام اُس مسیحائے دو عالم کی نظر / موج مرے دردِ دل کا آج درماں ہو گیا

غزل ۔ بڑا دن

پکار اُٹھا زمانہ مسیحِ عالی نشاں آیا ۔ گنہ لرزا ستم تھرا اُٹھا معجز بیاں آیا
تصدق اس پہ انساں ہیں ملائک اس پہ قرباں ہیں ۔ مبارک ہو مبارک دو جہاں کا حکمراں آیا
بھنور میں بحرِ عصیاں کے نہ گھبراؤ ڈوبنے والے ۔ بچالے تیری کشتی مسیحِ رحمت نشاں آیا
سیاہی کفر و بدعت کی چھٹی جلوے نظر آئے ۔ تعالی اللہ وہ ایمان کی روحِ رواں آیا
خزاں رخصت چمن سے ہے چمن والو مبارک ہو ۔ بہاریں کیوں نہ جھوم اٹھیں چمن کا باغباں آیا
خبر دی جس کی نبیوں نے بھی وہ ابنِ مریم ہے ۔ پئے تعظیم جس کے واسطے سارا جہاں آیا
جنابِ موج کے آتے ہی بولا شاعرِ انساں ۔ وہ دیکھو بزم میں ابنِ خدا کا مدح خواں آیا

رُباعی

اک اک نے کہا دیکھ کے مولا آئے ۔ ایمان کی ضو شانِ کلیسا آئے
جس وقت ہویدا ہوئے ابنِ مریم ۔ دنیا میں ہوا شور مسیحا آئے

صلیب

ذرہ ذرہ ہو رہا ہے دل سے قربانِ صلیب ۔ جس طرف دیکھو عیاں ہے عظمت شانِ صلیب
ہر رگِ دل کیوں نہ ہو جائے ثنا خوانِ صلیب ۔ وجہ رونق ہو رہا ہے نورِ عرفانِ صلیب
قلب میں رکھتے ہیں پنہاں ہم بھی ارمانِ صلیب
رشکِ حسرت بن گیا ہر قطرۂ خونِ جگر ۔ زخمِ دل بھی معتبر دردِ وفا بھی معتبر
نام جب سنتا ہوں سجدے کو جھکا دیتا ہوں سر ۔ ہو گیا ہے عشقِ ابن اللہ کا دل میں گذر
ساری دنیا مجھ کو کہتی ہے ثنا خوانِ صلیب

ہر نظر کو دیکھنے والوں کی حیراں کر دیا — ساری دنیا کیلئے بخشش کا ساماں کر دیا
کیا نہ کیا کچھ عالم آکر تا بہ امکاں کر دیا — واہ رے ذوقِ حقیقت خود کو قرباں کر دیا

ابنِ خالق ہو گیا کونین میں جانِ صلیب

اس طرح گویا زبانِ آرزوائے متوجہ ہو — جملہ جملہ کاروانِ آرزو اے متوجہ ہو
جنبشِ لب اک نشانِ آرزوائے متوجہ ہو — لطف جب ہے یوں بیانِ آرزو آمتوجہ ہو

داستانِ زندگی ہو زیرِ عنوانِ صلیب

قطعہ

دل آگیا فریبِ تماشائے دہر میں — دل ہو کے دل خدا کی قسم دل نہ ہو سکا
وہ لمحہ جس کا نام محبت میں جینا ہے — افسانۂ حیات میں شامل نہ ہو سکا

غزل

ہیں بہم شیر و شکر اب یوں آس کچھ بھی نہیں — فاصلہ ان کے ہمارے درمیاں کچھ بھی نہیں
قافلہ پہونچے گا کیونکر منزلِ مقصود پر — جب نہ میرِ کارواں ہو کارواں کچھ بھی نہیں
ہاں اٹھا لنگر سفینے کو بڑھا پروا نہ کر — سامنے ہمت کے بحرِ بیکراں کچھ بھی نہیں
گلشنِ ہندوستاں پر چھائی کچھ ایسی خزاں — یعنی پہلی سی بہارِ گلستاں کچھ بھی نہیں

پرسشِ اردو ادب ہے انجمن در انجمن
متوجہ کس سے کہیں یا اردو زباں کچھ بھی نہیں

غزل فارسی

بہ پیشِ منجی مخدوم بندگانہ گذر
سرِ نیاز نگوں کردہ عاشقانہ گذر

بہ رہگذارِ تو ما دیدہ فرش کردہ ایم
شئہ نجات بہ اندازِ خسروانہ گذر

دلِ کثیف بفضلِ مسیح پاک شود
بہ پیش رو بصدِ ایقان و بے گمانہ گذر

نقوشِ پائے مسیحا بہ رہ اگر بینی
بہ بوس سجدہ ادا کش مفاخرانہ گذر

بہ اندرونِ کلیسا تکبرانہ مرو
بہ کوئے منجی خود موجؔ عاجزانہ گذر

غزل

سو فتنے اب آئے دن اس بزم میں ڈھلے جاتے ہیں
ہر روز قیامت ہوتی ہے طوفان اُٹھائے جاتے ہیں

آزار و اذیت سُنا کیا آزار و اذیت کیا کم ہو
ہر گام پہ راہِ اُلفت میں سو خار بچھائے جاتے ہیں

آنکھوں میں حیا نظروں میں فسوں ماتھے پہ شکن ہونٹوں پہ ہنسی
اس ڈھنگ سے دل کی دُنیا پر وہ ٹوٹ کے چھائے جاتے ہیں

یہ ابرِ سیاہ یہ گل خانہ یہ برقِ غضب ان کا ڈھانا
برسات کے بھیگے موسم میں وہ آگ لگائے جاتے ہیں

ہے نوحؔ سے نسبت موجؔ ہمیں زیبا ہے یہ بخشا دج ہمیں
ہم بحرِ سخن میں بڑھ بڑھ کر طوفان اٹھائے جاتے ہیں

موسیٰ کانپوری

اسم گرامی سی ای موزز۔ تخلص موسیٰ۔ وطن کانپور تعلیم بی۔اے۔
نادر شاہجہانپوری کے شاگرد تھے برسوں محکمۂ فاع میں اچھے عہدہ پر فائز تھے۔
سبکدوش ہو کر وطن میں مقیم ہیں۔

کہنہ مشق شاعر ہیں۔ کلام میں پختگی ہے زبان شُستہ اور شیریں ہے۔
تخئیل کی گلکاریاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ عرفان اور ذاتِ الٰہی کی محبت اور اس
کی پہچان کے اشعار نہایت دلاویز ہیں۔

نمونۂ کلام۔

بڑا دِن

یہ قدرت کا کیسا کرشمہ ہوا ہے
ستم عرش چرنی میں پیدا ہوا ہے

وہ اس شان سے جلوہ آرا ہوا ہے
کہ فرشِ زمیں عرشِ اعلیٰ ہوا ہے

خطائیں میری جتنی افزوں ہوئی ہیں
کرم اس کا اتنا زیادہ ہوا ہے

فدائی بنے اور آئے جہاں میں
یہ کیسا انوکھا تماشا ہوا ہے

سرِ حشر ہوگی اُسے سرخروئی
جو تیرے لہو کا خریدا ہوا ہے

وہ بازارِ الفت میں ہے آنکھ والا
جسے تیری الفت کا سودا ہوا ہے

وہ موسیٰ کہ دُشوار تھا جس کا بچنا
کرم سے تیرے اب وہ اچھا ہوا ہے

لے طویل اور شدید بیماری میں مبتلا ہو کر شفایاب ہوئے تھے۔

غزل

میری بے خودی یوں بڑھائے چلا جا
کہ جلوے پہ جلوے دکھائے چلا جا

تخیل میں میرے تصور میں میرے
تو آئے چلا جا سمائے چلا جا

بس اتنا سا تیرا کرم چاہتا ہوں
میں مرتا رہوں تو جلائے چلا جا

ترے میکشوں کی تمنا یہی ہے
وہ پیتے رہیں تو پلاتا چلا جا

مسیحا تجھے تیری الفت کا صدقہ
مرے دل کی دنیا بسائے چلا جا

ترے منھ سے الفت کی باتیں مسیحا
میں سنتا رہوں تو سنائے چلا جا

کبھی تو پسیجیگا دل ان کا موسیٰ
اسی در پہ دھونی رمائے چلا جا

غزل

غیر ممکن جس گھڑی بچنا ہمارا ہو گیا
خود مسیحا اس جہاں میں آشکارا ہو گیا

جس طرف چشم عنایت کا اشارا ہو گیا
در دِ قلب عاصیاں کا خوں سارا ہو گیا

چھوڑ کر عرش بریں فرشِ زمیں پر آ گیا
جو خدا کا تھا ابھی تک وہ ہمارا ہو گیا

شانِ رحمت بڑھ گئی میری خطا کے ساتھ ساتھ
بحرِ عصیاں کا تلاطم ہی کنارا ہو گیا

میں ترا دامن پکڑ کر اے مسیحا بچ گیا
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہو گیا

ذوقِ نظارہ جو دیکھا میرا اس نے طور پر
مسکرا کر کہہ دیا موسیٰ ہمارا ہو گیا

میگ اجمیری

ایم ایم فلپ نام۔ میگ تخلص۔ ۴ر نومبر ۱۹۱۴ء اجمیر شریف میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں اجمیر شریف سے میٹرک پاس کیا۔ اور ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ ٹیلیفون ایکسچینج میں بطور آپریٹر ملازم ہوئے ۴ر نومبر ۱۹۷۲ء سینئر سپروائیزر ٹیلیفون ٹریفک کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

طویل عرصہ سے شاعری کر رہے ہیں حضرت نادر شاہجہانپوری سے تلمذ رہا اُن کی وفات کے بعد علامہ حضرت ریحانی لکھنوی سے اصلاح لینے لگے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنا وقت شعر و شاعری میں صرف کرتے ہیں۔ اور مستقل طور پر اجمیر شریف میں مقیم ہیں۔

شعر سوجھ بوجھ کر کہتے ہیں اسلئے صاف اور سلجھا ہوا ہوتا ہے اظہارِ خیال پر قدرت رکھتے ہیں تخیل کی رنگینیاں بھی بہار دکھاتی ہیں۔ کلام اکثر رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ فارسی میں بہت اچھی استعداد رکھتے ہیں۔ ●

علامہ جناب ریحانی لکھنوی کی فارسی غزل کا منظوم ترجمہ چند اشعار پر ریحانی مرحوم نے اظہار پسندیدگی کیا ہے:

روزی ز اتفاق شنیدند دیگراں
درگوشِ من ہنوز بیاید نوای دوست

اوروں نے اتفاق سے اک دن سنی تو کیا
آتی ہے میرے کان میں ہر دم نوائے دوست

(بہت اچھا ترجمہ ہے)

در ہر قدم چوں جلوہ گری ہوشاں کنند
سہواً گہے نظر نہ کنند رہگرائے دوست

گو ہر قدم پہ چاند سی صورت ہو سامنے
بھولے سے بھی نہ ڈالے نظر رہگرائے دوست

(بہت خوب ہے)

افتادمے ز سیل حوادث ضرور بود | میں ڈوب جاتا سیل حوادث میں بالیقیں
در بر نمی کشید اگر اعتنائے دوست | ہوتی نہ میرے ساتھ اگر اعتنائے دوست
اندراز مرگ و زیست مراداد آگہی | میں ہوں حیات و موت کی لذت سے آشنا
برمن فگند سایہ چوں زلفِ دوتائے دوست | سایہ فگن ہے مجھ پہ جو زلفِ دوتائے دوست
دلیشب چساں گذشت ندارم خبر ولی | کل رات کیسی گزری مجھے کچھ خبر نہیں
پیراہنم پُر است ز بوئے قبائے دوست | آتی ہے میرے کپڑوں سے بوئے قبائے دوست

توصیفِ مسیحا

ابنِ مریم مجھ کو تجھ پہ ناز ہے | مر کے جی اُٹھنا ترا اعجاز ہے
قبر میں بھی تھا تجھے میرا خیال | تو حقیقت میں مرا دمساز ہے
تو ہے مرے حال سے دل آشنا | میرا ہر ایک راز تیرا راز ہے
ہر طرف سُنتا ہوں میں آہٹ تیری | ہر خموشی میں تیری آواز ہے

میگ — اب میں اور آگے کیا کہوں
کیا قیامت ہے یہ ایک اعجاز ہے

غزل — بڑا دن

بشکلِ انساں میں کون آیا ہے | آب و گل میں خدا سمایا ہے
آمدِ حق سے کیوں نہ سب خوش ہوں | بہر عاصی نجات لایا ہے
حضرتِ دل عبث اُداس ہیں آپ | جس نے ڈھونڈا ہے اس نے پایا ہے

کیوں نہ قربان ہوں مسیحا پر
جلوۂ حق مجھے دکھایا ہے

موت کے مارو تم نہ گھبراؤ
ابنِ مریم حیات لایا ہے

میگ سے چمکا جو نور اس کا اب
دلِ تاریک جگمگایا ہے

عید الظفر

دار پر موت گر نہیں ہوتی
تو قضا پر ظفر نہیں ہوتی

مر کے عیسیٰ جو جی نہیں اٹھتے
زندگی بارور نہیں ہوتی

مر کے وہ خود جلا گئے مجھ کو
ورنہ میری خبر نہیں ہوتی

دیکھنے پر بھی جو مکرتا ہے
آنکھ وہ دیدہ ور نہیں ہوتی

شرط توبہ دلی سے ہے ہمدم
دیر اللہ کے گھر نہیں ہوتی

صبحِ صادق لحد پہ جا پہنچوں
رات کیوں مختصر نہیں ہوتی

میگ سے عید الظفر مبارک ہو۔
اب دعا بے اثر نہیں ہوتی

غزل

کون رُکتا ہے آنے جانے سے
آ بھی جاؤ کسی بہانے سے

عشق نے دی ہے وہ توانائی
کون ڈرتا ہے سر کٹانے سے

دخترِ تاک ہے یہاں ساقی
کون جائے شراب خانے سے

معجزہ یہ نہیں تو اور کیا ہے
مِل گئے دِل جو مُسکرانے سے

دین، دُنیا، حسیں، خدا بھی تو
سب یہ مِلتے ہیں دِل لگانے سے

مِل گئی دو جہان کی دولت
تیرے قدموں پہ سر جھکانے سے

میگؔ تو ہو نجات کا طالب
تجھ کو لینا ہے کیا زمانے سے

غزل

زخمِ تیرِ نظر دیکھئے
رشکِ گل ہے جگر دیکھئے

بات کہنی ہے کہہ دیجئے
کیوں اِدھر اُدھر دیکھئے

آس کی پھوٹ نکلی کرن
شامِ غم کی سحر دیکھئے

اُٹھ گئیں اُنگلیاں غیر پر
حال اپنا مگر دیکھئے

جل گئی برق بھی یک بیک
سوزِ دِل کا اثر دیکھئے

ان کی صورت ہے دلمیں بسی
دیکھئے عمر بھر دیکھئے

کیا مِلا میگؔ یہ عشق سے
ہر گھڑی آنکھ تر دیکھئے

نادر شاہجہانپوری

یہ باکمال شاعر ۲۶ فروری ۱۸۸۹ء ضلع شاہجہانپور کے ایک موضع داداپور میں پیدا ہوا۔ جان البرٹ پال نام رکھا گیا۔ بچپن میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا اس لئے آپ کی دو بہنوں، دو بھائیوں، ماں اور آپ کی پرورش لودی پور ضلع شاہجہانپور کے مشن یتیم خانے میں ہوئی۔ ۱۹۰۷ء میں انٹرنس پاس کیا۔ ایک مشنری خاتون نے آپ کو لکھنؤ کرسچن کالج میں داخل کرا دیا لیکن وہاں طلبہ کی شان و شوکت دیکھ کر آپ کو احساس کمتری ہوا۔ اور آپ کالج کو خیرباد کہہ کر قصبہ تلہر میں مدرس ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں شادی ہوئی۔ اور ۱۹۱۷ء میں بسلسلۂ ملازمت وطن چھوڑ کر جھانسی تشریف لے گئے اور تاحیات وہیں مقیم رہے۔ زمانۂ طالب علمی سے شاعری کا شوق ہو گیا تھا۔ بنارس کے دوران قیام پروفیسر الٰہی بخش قرین نیازی ان کے استاد تھے۔ ایک مرتبہ استاد نے اس مصرع پر مصرع لگانے کی فرمائش کی۔

ہو گئے پتھر ہی پتھر زیر یا بالائے سر

آپ نے کچھ دیر فکر کی اور مصرع چسپاں کر دیا۔ ؎

کوہ غم سر پر لئے فرہاد پہنچا کوہ پر   ہو گئے پتھر ہی پتھر زیر یا بالائے سر

استاد سنکر بہت خوش ہوئے۔ ابتدا میں مولوی قرین نیازی صاحب کی رہنمائی میں فارسی میں طبع آزمائی کی پھر ۱۹۱۴ء سے استاد کے ایماء پر اردو میں شعر کہنے لگے اور علامہ خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے ان کو اپنی شاگردی میں قبول کر لیا

۱۹۱۷ء میں یہ کہہ کر کہ آپ خود اُستاد ہیں اصلاح سے مستغنی کر دیا۔

آپ کا کلام قریب قریب تمام مسیحی رسالوں میں شائع ہوا ہے در حقیقت آپ کو قدرت نے شاعر بنا کر پیدا کیا تھا۔ آپ نے اس نعمت خداداد کو اپنی محنت و جانفشانی سے درجۂ کمال تک پہونچا دیا۔

آخری ایام نہایت خستہ حالی و مفلسی میں بسر ہوئے۔ ۳۱ مئی ۱۹۶۲ء کو عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ آپ کی وفات پر متعدد مسیحی اور غیر مسیحی شعراء نے مرثیے و نوحے لکھ کر اظہار غم کیا۔

آپکے کلام کی قدر دانی اور دیوان کی اشاعت کے لئے یو۔ پی سرکار نے دو ہزار روپے منظور کئے تھے۔ رقم کی ادائیگی کے لئے ایک ماہ کا وقت دیا تھا لیکن ظالم موت نے ایک ماہ کی مہلت نہ دی۔ اور دیوان چھپوانے کی حسرت پوری نہ ہوئی۔ ان کے دیوان کی اشاعت یقیناً اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ثابت ہوگی۔ آپ کو ابو الخیال اور بلبلِ ہند کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔

آپکے شاگردوں کی تعداد بہت ہے جسمیں مسیحی، مسلمان اور ہندو سب شامل ہیں۔ آپکے نعتیہ کلام سے آپ کے اعتقادات، ایمان اور حضرت مسیح سے والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ نعتیہ کلام میں شاعر کو تخیل کی بلند پروازیاں دکھانے کا موقع کم ملتا ہے لیکن اس محدود دائرے میں بھی آپ کا تخیل آسمان کی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ اقوال حضرت مسیح اور انجیل کے واقعات کو بڑے دلکش انداز میں نظم فرماتے ہیں۔ اس موضوع پر کوئی مسیحی شاعر ان کا مدِّمقابل نظر نہیں آتا۔ قول حضرت مسیح سے ۔ دیکھنا غیروں کا تنکا بعد میں ؛ پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر کھینچ

غزلیں مختصر مگر انتخاب ہیں۔ چھوٹی بحروں میں غزلوں کا حُسن اور بھی نکھرا ہوا ہوتا ہے۔ کلام میں سوز و گداز، یاس و حسرت۔ تشبیہات، استعارات سب کچھ موجود ہے۔ جذباتِ محبّت اور وارداتِ قلب کی صحیح ترجمانی کی ہے۔

زبان نہایت سلیس، بامحاورہ اور شیریں و لطیف ہے۔ صنائع بدائع سے کلام بھرا ہوا ہے۔

بڑا دِن

دردِ دل کے آتے ہی ہمدردِ جانی آگیا
آنکھ میں جبسدم گرا اشکا تو پانی آگیا

شاد ہو قلبِ حزیں رحمت کا بانی آگیا
آج فرشِ خاک پر عرش آشیانی آگیا

رحم و انصافِ خدا میں بال بھر آیا نہ فرق
مردِ اوّل[1] کی جگہ پر مردِ ثانی[2] آگیا

گو کہ سر رکھنے کو حرنی میں جگہ پائی مگر
جس کی ٹھوکر میں ہے ملکِ جاودانی آگیا

کلمۂ حق جو ازل کے دن خدا کے ساتھ تھا
لیکے وہ خود ہی پیامِ زندگانی آگیا

دیکھ اے بیمارِ عصیاں دیکھ آنکھیں کھول دے
خود ہی لے چارہ گر دردِ نہانی آگیا

اب ہوش آئے نہ آنکھ اپنی کھلے پیارے مسیح
تیرے آنے سے سرورِ جاودانی آگیا

نذر کرنے کو یہاں کچھ بھی نہیں دل کے سوا
میزباں کُل برائے مہمانی آگیا

نذر کو کچھ بھی نہیں پھر بھی تیرے دربار میں
نادرؔ نادار بہر حمد خوانی آگیا

صلیب

گر ابنِ خدا کی شہادت نہ ہوتی
تو ظاہر خدا کی محبّت نہ ہوتی

جہنم کے شعلے بھڑکتے ہی رہتے
میسّر کسی کو بھی جنّت نہ ہوتی

[1] حضرت آدم علیہ السلام [2] حضرت مسیح

نہ آتی کبھی جوش میں رحمتِ حق — جو میرے گناہوں کی کثرت نہ ہوتی
وہ کیوں اپنے بیٹے کو قربان کرتا — خدا کو جہاں سے جو الفت نہ ہوتی
تڑپتا تیرے عشق میں زندگی بھر — مجھے کاش مرنے کی فرصت نہ ہوتی
مسیحا جو درسِ محبت نہ دیتا — تو انسان میں آدمیت نہ ہوتی
مزے سے کٹتی میری زندگانی — مسیحا کے غم میں جو لذت نہ ہوتی
نہ بنتی کبھی بگڑی بات اپنی نادر — گر ابنِ خدا کی شفاعت نہ ہوتی

ایسٹر

کب مسیحا سا کوئی ہوا ہے — مر کے جو قبر سے جی اٹھا ہے
میرے محبوب یہ کیا کیا ہے — میرے بدلے تو خود مر گیا ہے
تیری تربت نہیں تیری تربت — یہ تو حدِ نمودِ وفا ہے
زخم پہلو تیرا بھر چکا ہے — زخمِ دل اب بھی میرا ہرا ہے
اور ارمان تو جی سے نکلے — تیرے ملنے کا ارماں رہا ہے
اللہ اللہ تیری خود نثاری — قلبِ نادر کو سکتہ ہوا ہے

رُباعی

سرکوبیٔ آدم سے جو لعنت آئی — جس سے سرِ انساں پہ قیامت آئی
اس کو ہی مٹانے کے لئے اے نادر — عیسٰو کو لئے دوش پہ رحمت آئی

قطعہ

کوئی بھی مسیحا کا ثانی نہیں ہے — زمینی تو کیا آسمانی نہیں ہے
خدا کو مسیحا کی صورت میں دیکھا — یہ حق بات ہے لن ترانی نہیں ہے

کلام میں آمد ہی آمد ہے جذباتِ محبت اور وارداتِ قلب کی عکاسی ہے روزمرہ اور محاورہ بندی کا لطف ہے۔ حسنِ بیان اور طرزِ ادا کی دلکشی ہے۔ ؎

لا دے دے مے طرفہ بیابانی ساقی — محفل میں نہ ہو آبرو پانی ساقی
نادر کو وہ شے دے کہ جسے پیتے ہی — اشعار میں آجائے روانی ساقی

کلام میں درد و مایوسی کا عنصر غالب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمام عمر ناکامیوں سے کام رہا۔ اسلئے کلام آپ بیتی معلوم ہوتا ہے گویا دل کی آواز اشعار کے سانچے میں ڈھالی گئی ہے جو سراسر درد و غم میں ڈوبی ہوئی ہے کچھ اشعار میر تقی میر اور فانی بدایونی کے رنگ میں بھی ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

جیتے جی اُٹھ سکا نہ اس در سے
سر پہ احسان ہے ناتوانی کا

آزارِ عشق تو ہے مرے جیتے جی کے ساتھ — بے موت کی یہ موت بھی ہے زندگی کے ساتھ
کوتاہیِ نصیب کی رنگت تو دیکھئے — اشکوں میں خون آنے لگا ہے کمی کے ساتھ

چھوٹی بحروں میں لاجواب غزلیں کہی ہیں۔ یہ بحریں مترنم اور رواں ہیں۔ غزل کی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے جو نرم لطیف اور سادہ ہونا چاہیئے۔ یہ تمام اوصاف ان کی غزلوں میں بدرجۂ اُتم موجود ہیں۔ سماعت فرمایئے۔ ؎

حکم ان کا ہے گھر جایئے — جایئے تو کدھر جایئے
زندگی ہو کے تم ہو خفا — کیوں نہ بے موت مر جایئے
دل توڑ دیتا ہے کیونکر کہوں — ہو چلی ہے سحر جایئے

خشک ساحل ہے تر دامنی سوکھے سوکھے اُتر جائیے
گر ہے مطلوب دُرِّ خوشی بحرِ غم میں اُتر جائیے
نادر اب دم چُرانے سے کیا
عشق میں نام کر جائیے

غزل

تیرے دیدار کی حسرت نے جِلا رکھا ہے ورنہ مدت سے کفن اپنا سِلا رکھا ہے
درد کا نام جو ظالم نے دوا رکھا ہے اس لئے میں نے کلیجے سے لگا رکھا ہے
دیکھیے زیر لحد حال ہمارا کیا ہو جیتے جی خاک میں جب تم نے ملا رکھا ہے
مرنے دیتی نہیں افسوس تمہاری اُلفت اتنی سی بات نے مجبور بنا رکھا ہے
کس کے گیسو کا تجھے ہو گیا سودا نادر
حال جو تو نے پریشان بنا رکھا ہے

غزل

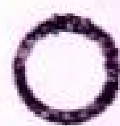
کیا ہوا دلِ حزیں گر خوشی گذر گئی غم اگر چلا گیا جنبش معتبر گئی
ایک تمہارے عشق سے کسقدر ضرر ہوا دل گیا۔ جگر گیا۔ دُور بین نظر گئی
اب بھی ملال ہے کیوں انہیں غلط لکھا آپ سے وہ چل دیئے جب میری خبر گئی
گردشِ نصیب کا ذکر کیا دلِ حزیں جس طرح گذر گئی اس طرح گذر گئی
موجہ سراب نے یہ سبق دیا مجھے زندگی بھی خاک ہے آبرو اگر گئی

حسرتِ مدام ہی زندگی کی جان ہے — آدمی ہی مرگیا آرزو جو مرگئی
دل بڑھلکے دم دیا آپ نے یہ کیا کیا — ہم سمجھ رہے تھے اب زندگی سنور گئی
دوسروں پہ منحصر ناخدا کے منتظر — دیکھ مجھ نحیف کی ناؤ پار اتر گئی
دشمنی کو بھول کر بیکسی پہ رو دیا — جب رقیب کی نظر میری قبر پر گئی

فاتحہ کو ہاتھ اٹھا دے دعائے مغفرت
نعش نادرِ حزیں قبر میں اُتر گئی

جذبات نگاری اور وارداتِ قلب کی ترجمانی غزل کی جان ہوتی ہے
ان اشعار کو پڑھیئے اور لطف لیجئے ۔

ہر دم گذارتا ہوں میں بیقرار ہو کر — مٹی میں مل رہا ہوں تم پر نثار ہو کر
میری نگاہ میں تو پھولوں سے بھی ہو نازک — پھر کیوں کھٹک رہے ہو تم دل میں خار ہو کر
اب میری تربت پہ بنکے سوگوار آئے تو کیا — خاک میں جب ملگیا میں تم ہزار آئے تو کیا
بیٹھے بیٹھے دیکھتے ہو نبض کیا اے دوستو — کیا کوئی جا کر انھیں بالیں پہ لا سکتا نہیں
دم اخیر بھی کچھ کچھ بہار باقی ہے — نظر نہیں ہے مگر انتظار باقی ہے



نازؔ جالندھری

اسمِ گرامی لچھمن داس۔ تخلص نازؔ۔ یکم مارچ ۱۹۱۰ء موضع بڈھن وال علاقہ شاہ کوٹ ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قصبہ کھنّہ میں ہوئی موگا سے نارمل ٹریننگ پاس کی۔ بعد میں ادیب فاضل پاس کیا اور مدرسی کا کام کیا وہاں سے سبکدوش ہو کر تعلیم بالغان میں کام کیا بعد ازاں ۱۹۶۷ء میں انگلینڈ تشریف لے گئے وہاں پانچ سال تک ایک فیکٹری میں کام کیا ۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء وطن واپس آ گئے اور اب وطن میں مقیم ہیں۔

شعر و شاعری کا شوق تعلیم کے زمانے سے ہے اسی شوق میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا اور عروض سے واقفیت پیدا کی۔ جناب گوربخش سنگھ مخمورؔ جالندھری کی شاگردی سے فیض یاب ہوئے۔

کلام نعتیہ اور حقانی ہے۔ سلجھا ہوا صاف اور سپاٹ ہے۔

نمونۂ کلام :۔

توصیفِ مسیحا

کوئی ثانی نہیں دنیا میں مسیحا تیرا
کوئی ہم پایہ نہیں شاہِ کلیسا تیرا

تیرے قربان تو آیا ہے مسیحا بنکر
نقشِ پا ڈھونڈتا پھرتا ہے زمانہ تیرا

تو مرے مانگنے سے مجھ کو سوا دیتا ہے
غیر کے در پہ نہ جائے گا یہ منگتا تیرا

کل تو ہوتے تھے ترے اہلِ فلک میں چرچے
آج کیا ہو گیا ہے حال کلیسا تیرا

بندہ پرور تو مجھے غیر کا محتاج نہ کر — یہ دُعا مانگتا ہے تجھ سے یہ بندا تیرا
مَیں تو کچھ چیز نہیں تیرا کرم ہے مجھ پر — جان تیری بدن تیرا ہے اثاثا تیرا
اس زمانے کے سہاروں کا بھروسہ کیا ہے — مجھ کو درکار ہے بس ایک سہارا تیرا
تیرا انکار لبِ ناز سے توبہ توبہ — دل میں ہے یاد تیری سر میں ہے سودا تیرا

توصیفِ مسیحا

اُسے تو نے ہر نعمتِ زندگی دی — تیرے در پہ جو آ گیا سُولی والے
تیری بادشاہی زمیں پر بھی آئے — یہ کرتا ہوں ہر دم دُعا سُولی والے
تیرا شکر یہ تو نے سب کچھ دیا ہے — مرے مانگنے سے سوا سُولی والے
سوا تیرے کوئی بھلا کیا کرے گا — میرے دردِ دل کی دوا سُولی والے

بڑا دن

شانِ جرنی کی ہے جنّت سے سوا آج کے دِن — کیوں نہ ہو آ ہی گیا ابنِ خدا آج کے دِن
نارِ دوزخ کو بجھانے کیلئے جنّت سے — خوب برسی تیری رحمت کی گھٹا آج کے دِن
آ گیا بانیِ الفت بخدا آج کے دِن — خوفِ محشر سے ڈرے میری بلا آج کے دِن
وہ محبت کا خدا اور مسیحِ عالم — لیکے آیا ہے گناہوں کی دوا آج کے دِن
تیری آمد نے بدل ڈالا نظامِ کہنہ — ہم نئے، دنیا نئی، تو بھی نیا آج کے دِن

تو نے گر میرے لیے عرشِ بریں کو چھوڑا
جان و دل نازؔ کا ہے تجھ پہ فدا آج کے دِن

ایسٹر

مسیحا آج کے دن جی اٹھا ہے جو حقیقت ہے
پیام زندگی ہم کو ملا ہے جو حقیقت ہے

پیام زندگی لیکر ہوا جنت سے آئی ہے
جہاں والو در جنت کھلا ہے جو حقیقت ہے

وہ جس نے زندہ ہو کر زندگی سارے جہاں کو دی
گنہگار و وہی ابن خدا ہے جو حقیقت ہے

جھکا دے اسکے قدموں پر سر و دل تو بھی اے ناجی
فلک آج اسکے قدموں پر جھکا ہے جو حقیقت ہے

فنا کا نام دنیا سے مٹا کر میرے منجی نے
بقا کا نام پھر سے لکھ دیا ہے جو حقیقت ہے

حیاتِ جاودانی سب کو ملتی ہے مسیحا سے
وہی اے نازؔ تاج انبیاء ہے جو حقیقت ہے

غزل

تیری جبینِ ناز کو سجدوں سے کام کیا
میں تجھ کو دیکھتا ہوں تو میری نماز دیکھ

گھیرا ہے برق و باد نے طوفانِ تیز نے
اے ناخدائے دو جہاں میرا جہاز دیکھ

میں بھی قطارِ سائلاں میں آ کھڑا ہوا
تیرے وفورِ فیض کا دستِ دراز دیکھ

مشکل کشائے بیکساں یہ کون آ گیا
ہے عندلیب زار بھی نغمہ طراز دیکھ

دو دن کی زندگی پہ تو نازاں نہ ہو بشر
بالشت بھر کی عمر ہے عمر دراز دیکھ

تیری نجات کے لئے وہ دار پر چڑھا
اسکے کرم کو اپنے گناہوں کو نازؔ دیکھ

نامی شاہجہانپوری

نام ایکیل جوئیل پال۔ تخلص نامی ۸ اگست ۱۹۰۷ء موضع پناہ پور ضلع شاہجہانپور میں پیدا ہوئے۔ مُراد آباد اور میرٹھ میں تعلیم حاصل کی ۱۹۲۷ء میں ریلوے مُلازمت میں داخل ہوئے ۱۹۶۲ء میں ڈرائیور کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور گونا مدھیہ پردیش میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ آجکل بمبئی میں مقیم ہیں۔

عمّ حقیقی جناب نادر شاہجہانپوری سے تلمذ رہا۔ لیکن عدیم الفرصتی یا اُستاد سے بہت دور رہنے کے باعث خاطر خواہ اکتساب فن نہ کر سکے اور پوری طرح مستفیض نہ ہوئے۔

کلام کم اور نعتیہ ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔

نمونۂ کلام :-

رُباعیات

راہوں پہ صداقت کی چلایا ہم کو
جینے کا قرینہ بھی سکھایا ہم کو
دراصل مسیحا نے جہاں میں آکر
فردوس کا حقدار بنایا ہم کو

آرام کی صُورت ہو میسّر سب کو
معبُود کی اُلفت ہو میسّر سب کو
مریم کے دُلارے کی بدولت نامی
کھوئی ہوئی جنّت ہو میسّر سب کو

توصیفِ مسیحا

واہ عیسو نے وہ دکھائی ہے
اب خدا تک میری رسائی ہے

جان تو نے صلیب پر دیکر
رسمِ اُلفت ہمیں سکھائی ہے

موت کا ڈر بھی کچھ نہیں باقی
زندگی آج مسکرائی ہے

ہو گئی خود بخود خزاں رخصت
یوں چمن میں بہار آئی ہے

وہ کسی اور میں نہیں دیکھی
بات جو ہم نے تجھ میں پائی ہے

ایک خلقت ہوئی تیری پیرو
موت بھی تیری رنگ لائی ہے

جو بھی ایمان تجھ پہ لے آیا
بس اسی نے نجات پائی ہے

بات بگڑی ہوئی بنی اپنی
تو نے بگڑی ہوئی بنائی ہے

جان میری بھی بچ گئی ناصحی
مُفت مَیں نے نجات پائی ہے

غزل

بیانِ غیر نہیں ہے میری زباں کے لئے
زباں ملی ہے فقط تیری داستاں کے لئے

یہ قدر خوب کی دُنیا نے ابنِ مریم کی
سرا میں وہی ہے جگہ ایسے مہماں کے لئے

ہزار شکر کہ آیا تو وقت پر ورنہ
یہاں تھا کون مدارات عاصیاں کے لئے

بنا ہے نقش تیرا نقش کالحجر دل پر
نشان اپنا مٹایا میرے نشاں کے لئے

غمِ مسیح میں مرنا ہی اب تو جینا ہے
دُعا میں کون کرے عمرِ جاوداں کے لئے

اُٹھا لے تو ہی گناہوں کا میرے پُشتارہ
بڑا پہاڑ ہے یہ مجھ سے ناتواں کے لئے

تیرے حضور مسیحا چڑھائے کیا ناصحی
یہی غزل ہے میری نذر ارمغاں کے لئے

از صفحہ ۲۵۱ مُسدّس قربان

نیند

ہے سبھوں کے واسطے آئینہ تو راحت رساں
اہلِ دنیا کو دکھا دیتی ہے جنت کا نشاں
بیکسوں پر بے بسوں پر سب پہ ہے تو مہرباں
ہے مریضوں کے لئے تسکینِ دل آرامِ جاں
درحقیقت غم زدوں کے واسطے ہے زندگی
ناامیدوں کے لئے امید کی ہے روشنی

جنکو اذکارِ جہاں سے اک ذرا فرصت نہیں
گردشِ آلام سے مطلق جنہیں راحت نہیں
چین سے دو سانس لیں جنکی یہ قسمت نہیں
جن غریبوں کے لئے آرام کی صورت نہیں
ان کو آغوشِ محبت میں جگہ دیتی ہے تو
خستہ حالوں کی بلائیں پیار سے لیتی ہے تو

جھونپڑے والوں کو دے دیتی ہے قصرِ لاجواب
بخش دیتی ہے ضعیفوں کو جوانوں کا شباب
تو الٹ دیتی ہے چہروں سے حسینوں کے نقاب
ہوش سے جو دور کر دے وہ پلاتی ہے شراب
جو ہے ناممکن اسے ممکن بنا دیتی ہے تو
جو خیالوں میں چھپا ہے وہ دکھا دیتی ہے تو

ہر مرض کی ہے دوا ہر درد کی اکسیر ہے
ہر پریشانی ہو جس سے دور وہ تدبیر ہے
شان ہے محنت کی غربت کی تو ہی توقیر ہے
جو غریبوں کو خدا نے دی ہے وہ جاگیر ہے
مفلسوں کی دوست ہے نادار کی غم خوار ہے
سچ کہوں تو فاقہ مستوں کی قناعت دار ہے

چھوٹے بچوں کو خیابانوں میں پہنچاتی ہے تو
نوجوانوں کو حسیں شکلوں سے بہلاتی ہے تو
منچلوں کو کل جہاں کی سیر کرواتی ہے تو
زاہدوں کو لیکے جنت کی طرف جاتی ہے تو
الغرض کرتی ہے پوری حسرتیں دل کی تمام
بادشاہوں سے گدا تک نیند ہیں تیرے غلام

نامی نادری

اسم گرامی عمانویل بنجمن۔ تخلص نامی۔ ۲۸ر اگست ۱۹۲۲ء دیوبند میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انگر اہم انسٹی ٹیوٹ غازی آباد میں حاصل کی۔ بعد ازاں انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا اور لکھنؤ سے ایل ٹی کر کے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔ عرصہ دراز سے دہرہ دون کرسچن کالج میں انگریزی کے لیکچرر ہیں

شاعری کا شوق دورانِ تعلیم پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت نادر شاہجہانپوری کے شاگرد ہیں اسی مناسبت سے نادری لکھتے ہیں۔ استاد نادر کی وفات کے بعد جناب علامہ مفتوں شکوہ آبادی سے استفادہ کیا۔ اور فنِ عروض میں قابلِ قدر قابلیت پیدا کی۔ رباعیات کہنے کا شوق ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ان کی رباعیات کا مجموعہ "باب السماء" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس پر یو۔پی سرکار نے انعام سے نوازا ہے۔ آجکل دہرہ دون سے ایک ماہنامہ "ساز سرمدی" نکالتے ہیں۔

ابو الفصاحت حضرت جوش ملسیانی کے الفاظ میں:۔

"زبان بہت سلیس اور عام فہم ہے"۔

حضرت سحر عشق آبادی:۔

تمام دو بیتیاں عروض اور عیوبِ فصاحت سے مبرا ہیں۔ تکرارِ لفظی و معنوی عیب بھی ہے اور صنعت بھی۔ لیکن نامی کے اشعار میں یہ تکرار حسنِ کلام بن کر رہ گئی ہے"۔

سحابِ سخن آبر گنوری :-

"آپ ناؔمی کی رُباعیوں میں وہ تمام اوصاف پائیں گے جو رُباعی میں ہونا چاہیئے۔ سب سے مقدّم بات تو ناؔمی کی سادہ پُرکار زبان ہے"

خود ناؔمی کا یہ عقیدہ ہے ؎

شعروں میں لطافت بھی ہو رعنائی بھی
جذبات میں شوخی بھی ہو دِل آرائی بھی
اندازِ بیاں بھی ہو انوکھا سب سے
معنی میں بلندی بھی ہو گہرائی بھی

نمونۂ کلام۔ **ولادتِ مسیح ؎**

جس وقت تولّد ہوا ابنِ مریم
دَلدل میں گناہوں کی پھنسا تھا عالم
کوئی بھی مددگار نہ تھا انساں کا
حد درجہ پریشان تھی نسلِ آدم

سادگی و پرکاری ؎

جس طور سے دِن آپ ہی ڈھل جاتا ہے
اِنساں کا بُرا وقت بھی ٹل جاتا ہے
رہ جاتی ہے کہنے کے لئے بات فقط
ہر شخص کا کام نکل جاتا ہے

محاورہ بندی ؎

اپنوں کو بھی منہ پھیر کے چلتے دیکھا
اپنوں کو بھی کترا کے نکلتے دیکھا
بدلے ہوئے ماحول میں اپنوں کو بھی
گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھا

طنز ؎

دُنیا میں غلط کام سے ڈرتا ہے کون
اس دَور میں انجام سے ڈرتا ہے کون
اب نامِ خدا ہے بس قسم کھانے کو
اللہ کے اب نام سے ڈرتا ہے کون

صفحہ ۲۹۱ پر درج رُباعیات اور صفحہ ۲۹۲ پر توصیف مسیحا جناب ناؔمی نادری صاحب کا کلام ہے اور ان کو صفحہ ۲۹۶ کے ساتھ پڑھیے: ترجمان

ایمان ؎

مانا کہ ہمیں آج تک آیا نہ شعور
ہوتے ہی رہے ہم سے بہر حال قصور
کیونکر نہ ترس کھائے گا ہم پر آخر
اعلان ہے جب اس کا کہ ہوں رب غفور

توصیف حضرت مسیح ؎

اک روز جہنم میں نظر آتے ہم
ہوتا فقط انجام پر اپنے ماتم
چھٹکارے کی امید نہ ہوتی کوئی
پیدا نہ ہوا ہوتا جو ابنِ مریم

اخلاق ؎

احسان سے دشمن کو دبانا سیکھو
الفت بھی سلیقے سے جتانا سیکھو
نفرت سے تو ملتا ہے کدورت کو فروغ
یہ راز محبت سے سکھانا سیکھو

عورت کی تفسیر ؎

بے شان کو ذیشان بنا دیتی ہے
انسان کو انسان بنا دیتی ہے
مومن کو بنا دیتی ہے کافر عورت
کافر کو مسلمان بنا دیتی ہے

تغزّل ؎

ویرانے سے ویرانہ ملا ہو جیسے
مے خانے سے میخانہ ملا ہو جیسے
ہوتا ہے گماں دیکھ کر انکی آنکھیں
پیمانے سے پیمانہ ملا ہو جیسے

تشبیہات ؎

پُر کیف ہی پُر کیف کہانی جیسے
نکہت سے لدی رات کی رانی جیسے
بڑھتا ہوا اُف جوشِ جوانی اُن کا
اُمڈے ہوئے دریا کی روانی جیسے

کلوری

تاجدارِ کلوری، شانِ شہانِ کلوری
آپ شانِ کلوری ہیں، آپ جانِ کلوری

وہ اکیلی جان، وہ بارِ گرانِ کلوری
مرحبا اے کامرانِ امتحانِ کلوری

صبح کا تارا ہے وہ، وہ کہکشانِ کلوری
نور سے اُس کے منوّر ہے جہانِ کلوری

ساری دنیا کی زباں پر ہے بیانِ کلوری
ابنِ یزداں نے بڑھادی کتنی شانِ کلوری

منسلک ہے کلوری، نامِ مسیحِ پاک سے
مِٹ نہیں سکتا کبھی نام و نشانِ کلوری

جامِ تاکِ کلوری ہے روح افزا کسقدر
تجھ پہ ہم قربان اے پیرِ مغانِ کلوری

کیا کہیں کتنی رسیلی، کتنی شہدیلی ہے یہ
کوئی دہراتا رہے بس داستانِ کلوری

موت کے پردے میں ناؔمی زندگی آئی نظر
ڈھل گئی خوشیوں کے گیتوں میں فغانِ کلوری

غزل

تو بھی انا پسند ہے میں بھی انا پسند
تجھ کو بھی کیا پسند ہے مجھ کو بھی کیا پسند

چاہے خدا پرست ہو چاہے صنم پرست
ہم نے جسے بھی دیکھا وہی انتہا پسند

رہتا ہے میرے ذہن میں ہر دم یہی خیال
کیا کیا انھیں پسند ہے کیا کیا ہے ناپسند

دونوں پہر ستاتی ہے اکثر کسی کی یاد
وقتِ سحر پسند نہ وقتِ عشا پسند

کتنا ستم ظریف ہے کتنا ادا فروش
لیکن پسند ہے تو وہی بے وفا پسند

آخر خدا خدا ہی رہے گا صنم صنم
چاہے خدا پسند ہو چاہے صنم پسند

لطف و کرم ہوں آپکے یا بے وفائیاں
جب آپ ہی پسند ہیں تو ہر ادا پسند

جلوہ فروشیاں تری اے دورِ بے ثبات
تیری ادا پسند نہ تیری قبا پسند

ناجی زمیں پہ رہتے ہوئے آسماں کے خواب
کیونکر کسی کو آئے کوئی بادِ لا پسند



ناصر دہلوی

نام بلدیو سنگھ تخلص ناصر دہلی میں ۱۲ر جولائی ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے۔ غازی آباد، متھرا اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر علم الہیات پاس کیا اور میرٹھ میں پادری کی حیثیت سے خدمت شروع کی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ گئے وہاں بی۔ ڈی، ایم۔ آر۔ ای اور ایم ٹی ایچ کی ڈگریاں حاصل کیں۔

آجکل دہلی میں مقیم ہیں میتھوڈسٹ کلیسا کی جانب سے کونسل آف کرسچین سوشل کنسرن کے معتمد اعلیٰ ہیں۔

طالب علمی کے زمانہ سے شاعری کا شوق پیدا ہوا پہلے حضرت نادر شاہجہانپوری سے اصلاح لیتے رہے۔ آجکل حضرت موج زیبائی سے فیض حاصل کرتے ہیں۔

کلام صاف اور سادہ ہے۔ مذہبی اور اصلاحی کلام لکھتے ہیں۔

غزل

ابنِ خدا کو مرکزِ ایماں بنائیے
سب مشکلوں کو اس طرح آسان بنائیے

لازم ہے یہ جماعت مسیحی کے واسطے
اپنے عمل کو قابلِ ایماں بنائیے

یہ فرضِ اولیں ہے ہمارا مسیحیو
دنیا میں سب کو صاحبِ ایماں بنائیے

وہ کھٹکھٹا رہا ہے درِ دل آپ کے
اس زندگی کو قابلِ یزداں بنائیے

دنیا کی اونچ نیچ کلیسا میں آ گئی ہے
ایماں کے راستوں کو تو یکساں بنائیے

ناصر بجھی بجھی سی ہے کیوں شمعِ زندگی
اب اس کو مثلِ سروِ چراغاں بنائیے

غزل

دل اپنا اگر تو نے منجی کو دیا ہوتا
فکروں میں زمانے کی ہرگز نہ گھرا ہوتا

رحمت نے مسیحا کی ہر دکھ سے بچایا ہے
بن ابنِ خدا میرا انجام بُرا ہوتا

دکھ درد میں کام آنا انسان کا شیوہ ہے
اوروں کی بھلائی میں تیرا بھی بھلا ہوتا

ہم عکسِ مسیحا ہیں تسلیم اگر کرتے
انسان کا پھر انساں دشمن نہ بنا ہوتا

توبہ کی نشانی ہیں اعمال تیرے ناصرؔ
اعمال بنا مردہ ایمان تیرا ہوتا

غزل

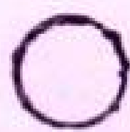
اے اجل تو نے کہیں کا مجھے رہنے نہ دیا
قصۂ زیست کسی طور کبھی کہنے نہ دیا

زندگی سے تھا پریشان اجل سے خائف
ان ہی دونوں نے مجھے چین سے رہنے نہ دیا

خوفِ رسوائی نے نالے سے نکلتے لب پر
حالِ دل اپنوں کے آگے بھی تو کہنے نہ دیا

یا خدا کیسے کروں شکر ادا میں تیرا
پستیِ زیست میں تو نے کبھی رہنے نہ دیا

زندگانی نے کچھ اس طور سے روندا ناصرؔ
حوصلہ جینے کا باقی کوئی رہنے نہ دیا



ناصر سنسارپوری

اسمِ گرامی داس لارنس تخلص ناصر۔ ۲۰ مئی ۱۹۲۲ء وطن موضع سنسارپور ضلع جالندھر میں ولادت ہوئی۔ تحصیلِ علم کے بعد دوسری جنگِ عظیم میں طویل عرصہ تک ملٹری میں بطور سول کلرک مُلازمت کی۔ والدِ بزرگوار کی وفات کے بعد اپنے خاندان کی پرورش کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کی ذمّہ داری بھی پوری کی۔

شاعری کا شوق لڑکپن سے پیدا ہو گیا تھا جناب بیتاب سنسارپوری مرحوم اور جناب ناز جالندھری کی ترغیب سے آپ کی رسائی جناب گوروبخش سنگھ مخمور جالندھری تلمیذ علّامہ سیماب اکبرآبادی تک ہو گئی۔ انہوں نے نظرِ کرم فرمائی اور ناصر صاحب نے ان سے بہت کچھ اکتساب کیا۔ اُستاد مخمور جالندھری کی وفات کے بعد جناب ضیاء فتح آبادی سے مستفیض ہوتے ہیں۔

آپ ہمیشہ مسیحی نعتیہ کلام لکھتے ہیں۔ اپنی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں۔

"حقیقت شناسی اور حقیقت گوئی پسندیدہ اور عزیز ہیں۔ مبالغہ سے پرہیز اور تصنع سے ہمیشہ احتراز رہا ہے بیانیہ لفظی بناوٹ اور سجاوٹ پر ندرتِ مضمون اور بلند خیالی کو ترجیح دیتا ہوں کوشاں رہتا ہوں کہ نعتیہ کلام میں انجیلِ مقدس کے نورانی ازلی اور ابدی حقائق کا مفہوم آیاتِ مقدسہ کے مضمون و مطلب کے عین مُطابق ہو۔ الفاظ کے انتخاب اور ترتیب بندش

میں نفسِ مضمون خبط نہ ہو۔ کوشش کرتا ہوں کہ مجازی، دُنیاوی یا جسمانی جذ
تخیلات کبھی روحانی و عرفانی بیانات میں مخلوط نہ ہونے پائیں۔

حضرت علامہ مہر لال سونی ضیاء فتح آبادی آپ کی غزلوں کے متعلق
فرماتے ہیں۔

"غزل کی صنف کو حقیر سمجھنے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ غزل میں صرف
حُسن و عشق، گُل و بلبل، کنگھی چوٹی، مئے و جام، ہجر و وصال اور لیلیٰ مجنوں کا
ذکر ہی نہیں بلکہ ان اعلیٰ اقدار کی آئینہ داری بھی ہے جن سے انسانیت ترکیب
پاتی ہے۔ نعتیہ شاعری کا انداز جُداگانہ ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار کو مسیحیت کا ذریعۂ
اظہار بنایا ہے۔ ان کا شوقِ شاعری فطری ہے۔ طبیعت کی موزونی اور تنقیدی
نگاہ کی وجہ سے ان کو ترقی کا زینہ طے کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔"

آپ ۱۹۶۲ء سے انگلینڈ میں مستقل طور پر قیام رکھتے ہیں۔
۱۹۸۲ء میں آپ کا مجموعۂ کلام "آبِ بقا" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

نمونۂ کلام:-

قطعات

فن میں نہ جو کامل ہو ماہر نہیں بن سکتا
جس کے نہ ہوں بال و پر طائر نہیں بن سکتا
تاثیر کے جوہر سے خالی ہے سخن جب تک
کہنے ہی کو شاعر ہے شاعر نہیں بن سکتا

ہے یہ رنگین میری شام تجھے کیا معلوم
کیوں ہیں پُر نور در و بام تجھے کیا معلوم
آمد آمد ہے میرے منجیِ دو عالم کی
بن گئے بگڑے ہوئے کام تجھے کیا معلوم

توصیفِ مسیحا

جو مریم کا قربان دُلارا نہ ہوتا — تو دردِ گنہ کا بھی چارا نہ ہوتا
مسیحا اگر جلوہ آرا نہ ہوتا — تو رازِ ازل آشکارا نہ ہوتا
مسیحا کرم جو تمہارا نہ ہوتا — تو دنیا میں کوئی ہمارا نہ ہوتا
زمانے کی ظلمت کا چارا نہ ہوتا — ترا نور جو آشکارا نہ ہوتا
اگر تھام لیتا نہ دامن مسیحا — کہیں بیکسوں کا سہارا نہ ہوتا
نکلتا نہ ہرگز بھنور سے سفینہ — خدا نا خدا جو ہمارا نہ ہوتا
نہ ملتی رہائی ہمیں دردِ غم سے — مسیحا اگر بزم آرا نہ ہوتا

تجھے وہ لگاتے گلے سے نہ ناصر
تو پھر تو کسی کا پیارا نہ ہوتا

بڑا دن

نیا آسماں آج پیدا ہوا ہے — شفیعِ جہاں آج پیدا ہوا ہے
میرا مہرباں آج پیدا ہوا ہے — میرا پاسباں آج پیدا ہوا ہے
بنے گا میرا آشیانہ اسی میں — مرا بوستاں آج پیدا ہوا ہے
بنے یوں ستارے ولادت کے شاہد — کہ شاہِ شہاں آج پیدا ہوا ہے
خدائی کے سب راز پنہاں ہیں جس میں — وہ سرِّ نہاں آج پیدا ہوا ہے

میں بیکس رہوں گا نہ مفلس رہوں گا
شۂ بیکساں آج پیدا ہوا ہے
شفایاب ہو جائیں گے زخم ہستی
مسیح زماں آج پیدا ہوا ہے
کرے گا تقاضا شریعت کا پورا
شہید جہاں آج پیدا ہوا ہے

سمجھتا نہیں کچھ کبھی ناصر کسی کو
بڑا نکتہ داں آج پیدا ہوا ہے

ایسٹر

مسیحا میرا جی اٹھا ہے
مرے درد دل کی دوا جی اٹھا ہے
ہر اک راہ پر روشنی ہو رہی ہے
کہ منزل نما رہنما جی اٹھا ہے
مرے آگے اب کوئی مشکل نہیں ہے
مسیحائے مشکل کشا جی اٹھا ہے
چمن میں ہے رنگ و نوا عطر و خوشبو
بہاروں کا فرماں روا جی اٹھا ہے
یہ جاں بخش مژدہ ملا عاصیوں کو
کہ ہمدرد کونین کا جی اٹھا ہے
چلو کھل گیا میکدہ سرخوشی کا
کہ وہ خضر آب بقا جی اٹھا ہے

نہ کر غم تو ناصر نہ ہو دل گرفتہ
ترا شاہ روز جزا جی اٹھا ہے



نُدرت کانپوری

اسم گرامی ڈیوڈ داس تخلص نُدرت ۳ مارچ ۱۹۰۲ء بمقام سہارن پور پیدا ہوئے تعلیم وتربیت اجمیر میں ہوئی شاعری کا شوق زمانۂ طالب علمی سے ہوگیا تھا. حضرت نادر شاہجہانپوری سے تلمذ تھا. اُستاد کی وفات پر فرمایا ہے ؎

لڑی اُلجھے ہوئے اشکوں کی جو گرتی ہے اے نادر
ترے ندرت کے غم کی داستاں معلوم ہوتی ہے

عرصہ دراز سے کانپور میں مقیم ہیں۔ کلام نہایت پاکیزہ ہے۔ زبان صاف، سلیس اور شُستہ ہے. طرزِ ادا خوبصورت و دلآویز ہے۔ محاورہ بندی اور روزمرہ کے لکھنے میں ملکہ حاصل ہے۔ حسین تشبیہات و استعارات سے اشعار کو سنوارتے ہیں۔ بُلند پروازی اور تغزل بھی موجود ہے۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

نمونۂ کلام:-

توصیفِ مسیحا

دونوں جہان نور ہیں نورِ مسیح سے
ذرّے چراغِ طور ہیں نورِ مسیح سے

اُن کے لئے ہی نارِ جہنم ہے شعلہ زن
جو لوگ اب بھی دور ہیں نورِ مسیح سے

جن کو ذرا بھی آنکھ ہے ان کو غم والم
سرمایۂ سرور ہیں، نورِ مسیح سے

ندرت خدائے فضل کا کیونکر کریں بیاں
بے داغ و بے قصور ہیں نورِ مسیح سے

غزل

گناہوں کی سیاہی میں جب کوئی نظر آیا
مری خاطر خدا کی آنکھ کا تارا اتر آیا
قدم آتے ہی اس سرو رواں کے باغ عالم میں
ہوئے غنچے شگفتہ رنگ پھولوں کا نکھر آیا
وہی اہلِ بصیرت ہیں وہی اہلِ بصیرت ہیں
مسیحا کے تجسم میں خدا جن کو نظر آیا
تری آمد سے چھائی مُردنی سی موت کے منھ پر
ترے دم سے حیاتِ جاودانی کا اثر آیا
اُجالا بن کے دو عالم کا فرشِ خاک پر ندرتؔ
ہٹا کر سات پردوں کو مہِ کامل اُتر آیا

بڑا دن

زمانے میں بڑے دن کی خوشی ہے
جو گُل ہنستے ہیں ڈالی جھومتی ہے
مبارک اللہ اللہ کیا گھڑی ہے
خوشی دستِ ادب باندھے کھڑی ہے
رُخِ غنچہ و گل پہ جو ہنسی ہے
خدائے پاک کی رحمت بڑی ہے
زمیں پر اپنے بیٹے کو اُتارا
گنہ گاروں کی کیا قسمت لڑی ہے
جہاں کو ہو گئی اُمیدِ بخشش
زمین و آسماں میں آشتی ہے
اِدھر آ کاروانِ راہِ ہستی
مسیحا ہی صراطِ زندگی ہے
جہاں میں ہے ہر ایک میرا پڑوسی
کوئی دشمن نہ کوئی اجنبی ہے
سرِ محشر ہی ہوش آئے گا ہم کو
ہماری بے خودی کیا بے خودی ہے
پرستارِ مسیحا ہم ہیں ندرتؔ
ہماری نیستی بھی زندگی ہے

کلوری

بڑھتی رہے گی تا ابد شانِ کلوری
پھولے پھلے گا اور گلستانِ کلوری

زنداں میں ہم کو طوق و سلاسل کا غم نہیں
آزاد ہیں ازل سے غلامانِ کلوری

ایماں پہ جان دیتے ہیں ہنس ہنس کے دوستو
ہوتے ہیں مر کے زندہ شہیدانِ کلوری

دشمن کے واسطے بھی نہ ہو جان سے دریغ
حاصل ہوا اسقدر ہمیں عرفانِ کلوری

ہر سمت ہے عیاں میرے مطلوب کی بہار
رونق پہ ہے خزاں میں بھی بُستانِ کلوری

تجھ کو اگر ہے نورِ ہدایت کی آرزو
اے دل پکڑ لے دامنِ سُلطانِ کلوری

ندرتؔ ہے یہ بھی فیضِ مسیحا کے عشق کا
اس طرح ہو گیا ہے ثنا خوانِ کلوری

توصیفِ مسیح

سر رہے سجدے میں مسیحا تیری رحمت دیکھ کر
آ گیا دُنیا میں تو دُنیا کی ظلمت دیکھ کر

کاش ہونٹوں پر رہے خنجر بھی تیرا نام ہو
موت کٹ کٹ جائے دم میں میری ہمت دیکھ کر

ابرِ رحمت گھر کے برسا بابِ جنت کھل گیا
حشر میں عیسیٰ کے سر تاجِ شفاعت دیکھ کر

میں ترے نقشِ قدم پر چل نہ پایا اے مسیح
خود ہی ہوں غرقِ خجالت اپنی غفلت دیکھ کر

قاتلوں کے واسطے کی جب دُعائے مغفرت
کانپ اٹھے ارض و سما شانِ محبت دیکھ کر

آرزو مٹ جائیگی حسرت فنا ہو جائے گی
ہنس پڑے گی موت اک دن تیری صورت دیکھ کر

اے مسیحا میں یہ سمجھوں گا ملی منہ مانگی مُراد
تیرا عاشق سب کہیں ندرتؔ کی نیت دیکھ کر

غزل

کہیں گھر آتے آتے وہ مہِ تاباں نہ رہ جائے
الٰہی ہوتے ہوتے وصل کا ساماں نہ رہ جائے

کمر سے ان کی کھنچ کر خنجرِ برّاں نہ رہ جائے
ہمارے قتل کا ہو کر سر و ساماں نہ رہ جائے

کروں تو اُس سے عرضِ مدّعا لیکن تحیّر ہے
دبا کر اپنی انگلی وہ تہہ داماں نہ رہ جائے

تڑپنے کا مزہ بھی لوٹ لینے دے مجھے ظالم
مزا کیا زخم میں جو لوٹ کر پیکاں نہ رہ جائے

تمہیں تو وعدۂ امروز فردا ہی کی عادت ہے
مجھے ڈر ہے کہ مل کر خاک میں ارماں نہ رہ جائے

کہا شیشہ نے جھک کر کان میں یہ ساغرِ مے سے
ترستا میکدے میں رند کا ارماں نہ رہ جائے

قدم رکھا تو ہے ندرتؔ مگر صحرائے الفت میں
اُلجھ کر خارِ وحشت سے کہیں داماں نہ رہ جائے

نحیف

نام جولیس یونس اللہ بخش۔ تخلص نحیف ۷ ستمبر ۱۹۲۷ء ضلع میرٹھ کے موضع جھکولی میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم حاصل کی اور وہاں پر ہی ملازمت اختیار کی اب مستقل طور سے دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔

۱۹۴۶ء سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور حضرت موج زیبائی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے۔ موسیقی سے بھی شوق رکھتے ہیں اسلئے کلام میں روانی پائی جاتی ہے۔

کلام صاف ستھرا ہے۔ زبان سلیس ہے۔ رعایتِ لفظی سے کام لیتے ہیں کہیں کہیں تخیل کی بلند پروازیاں بھی نظر آتی ہیں۔

نمونۂ کلام :-

توصیفِ مسیحا

یہ فرض ہے کہ مسیحا کو ہم سلام کریں
جہاں جہاں ملیں نقشِ قدم سلام کریں

جھکیں سلیقے سے اسکے حضور اہلِ سیف
اسے تمیز سے اہلِ قلم سلام کریں

خدا کا نقش ہے وہ بتکدے میں دُنیا کے
نہ کیوں خلوص سے اسکو صنم سلام کریں

اُسی کا سایۂ حکمت ہیں یہ وجود و عدم
اُسے یہ کیوں نہ وجود و عدم سلام کریں

وہی جہاں میں تقدّس مآب ہستی ہے
جسے اہالی دیر و حرم سلام کریں

ملی ہیں برکتیں ہم کو نحیفؔ دُنیا میں
مقامِ فخر ہے اس کو جو ہم سلام کریں

بڑا دِن

بڑا احسان یہ ہے وہ ہمارے درمیاں آیا
یہاں والوں کو سمجھانے وہاں کی داستاں آیا

گنہگاروں کی تقدیریں پلٹ دیں اک اشارے میں
خدا کے فضل سے جب اپنا منجیِ زماں آیا

چمک اُٹھا ہر اک ذرّہ منوّر ہو گئی دُنیا
زمیں پر جس گھڑی وہ آفتابِ دو جہاں آیا

حق و باطل کو پہچانا کلام اُس کا سُنا جس نے
وہ اک عالم کو سمجھاتا ہوا سود و زیاں آیا

بھٹکتا پھر رہا تھا کارواں گیتی کا ظلمت میں
دکھانے روشنی حق کی امیرِ کارواں آیا

نحیفؔ اپنی جبیں کیوں جُھک نہ جائے پاک قدموں پر
کہ خود ابنِ خدا بن کر شفیعِ عاصیاں آیا

کلوری

تیرا کرم جہاں پہ ہے سُلطانِ کلوری
انسانیت کی جان ہے عرفانِ کلوری

ہر اک بشر کو عفو کے قابل بنا دیا
دُنیا پہ تیرا ہو گیا احسانِ کلوری

لاکھوں شہید ہو گئے منجی کے نام پر
سینچا گیا ہے خون سے بُستانِ کلوری

خود جُھک گئی جبیں مری تعظیم کیلئے
آیا نظر جو سنگِ درِ جانِ کلوری

وہ بحرِ حادثات کے طوفاں سے بچ گیا
جو کوئی آ گیا تہہ دامانِ کلوری

ساقیِ کلوری کا ہوں متوالا اے نحیفؔ
پیتا ہوں روز ساغرِ عرفانِ کلوری

صلیب

آشکارا ایسا ہوا امروز احسانِ صلیب
سارا عالم ہو گیا دل سے ثنا خوانِ صلیب

نورِ یزداں سے منوّر خانۂ دل ہو گیا
کیوں نہ ایمان سے بڑھ کر ہو ایمانِ صلیب

ہے کلامِ پاک کے ہر اک نوشتے سے عیاں
دہر کے سب انبیاء تھے زیرِ احسانِ صلیب

اک ذرا سی بات پر ڈاکو پہ رحمت ہو گئی
اک طرف جو ہو رہا تھا ساتھ قربانِ صلیب

منجیِ کونین آخر تیسرے دن جی اُٹھے
دشمنوں کا ہو گیا بیکار سامانِ صلیب

کہہ رہی ہیں اہلِ باطن کی نگاہیں اے تحیف
ہر طرف چھایا ہوا ہے نورِ عرفانِ صلیب

ایسٹر

آج سُلطانوں کا سُلطاں جی اٹھا
ہو کے سُولی پہ وہ قرباں جی اُٹھا

کس طرح دُنیا کو سمجھائے کوئی
ابن اللہ ابنِ انساں جی اٹھا

زندگی کو زندگی پھر مِل گئی
دل کا اب ہر ایک ارماں جی اٹھا

آ چکا ہے سارے عالم کو یقیں
تیسرے دن شاہ ذی شاں جی اٹھا

جب ہوا توما کو دیدارِ مسیح
دل کے ہر گوشہ میں ایماں جی اٹھا

چاندنی ہر سمت چِٹکی ہے تحیف
دیکھئے وہ ماہِ کنعاں جی اُٹھا

۱۔ حضرت مسیح کے ایک شاگرد کا نام۔ لوقا ۲۰: ۲۴ تا ۲۹

قطعات

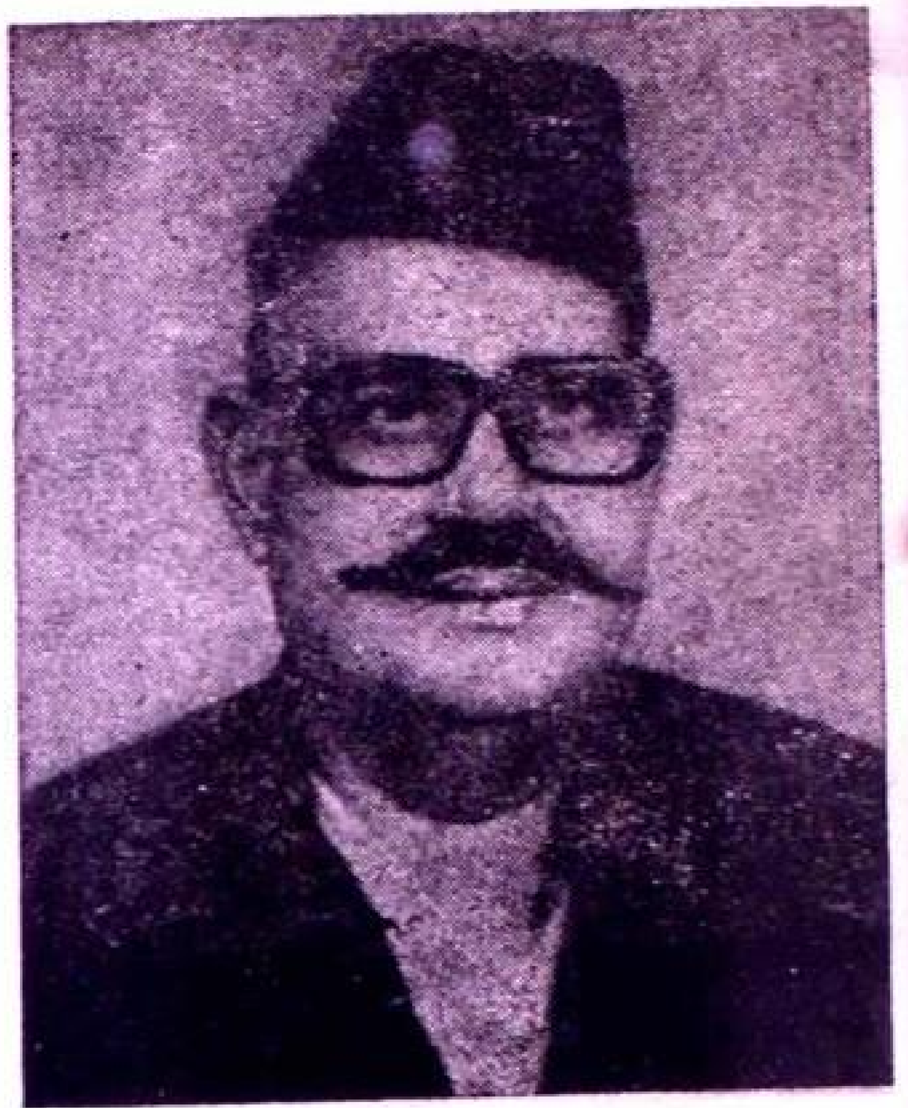
سخت راہوں سے گذرنا سیکھئے
دشمنوں سے پیار کرنا سیکھئے
ہو کے شرمندہ گناہوں سے نحیفؔ
بحرِ عصیاں سے اُبھرنا سیکھئے

نجاتِ عاصیاں کا مرحلہ پورا نہیں ہوتا
اگر جری نہیں وہ مُشکل کُشا پیدا نہیں ہوتا
نحیفِؔ زار پھر بھی آمدِ عیسیٰ ادھوری تھی
اگر وہ تیسرے دن قبر سے زندہ نہیں ہوتا

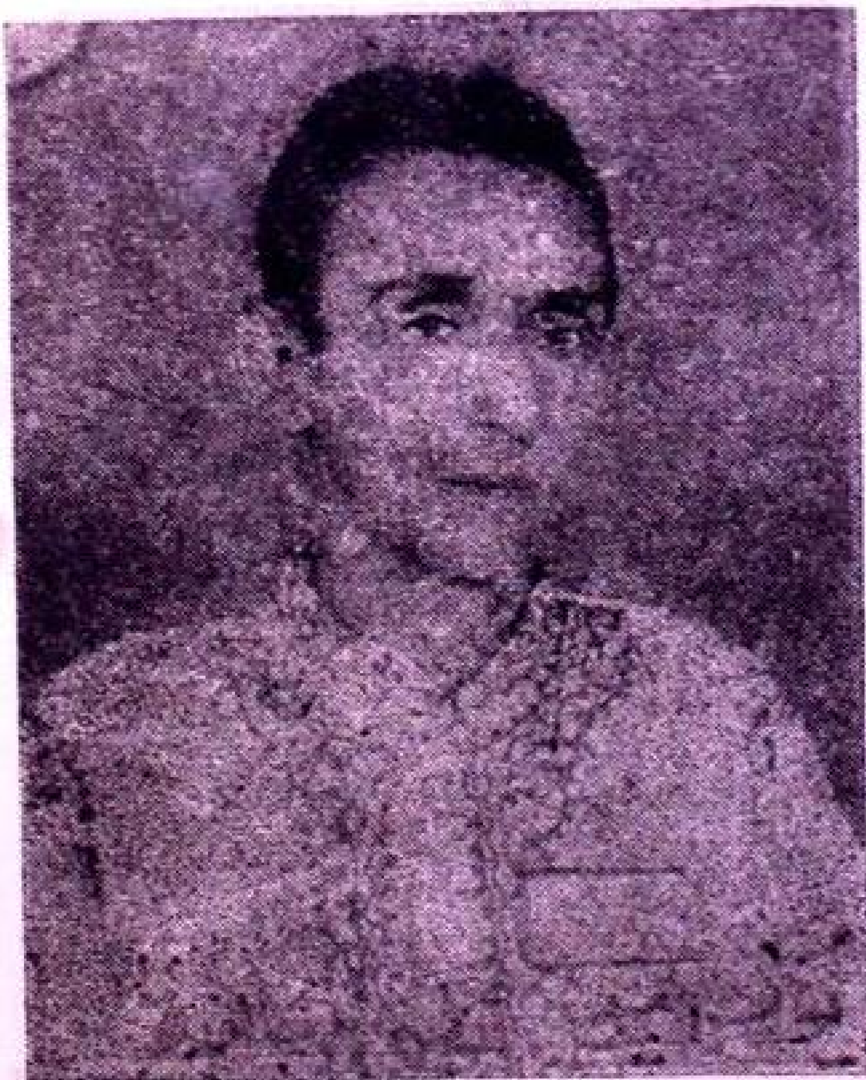
ان کی بکھری ہوئی سیہ زلفیں
جن سے کالی گھٹا بھی شرمائے
غرق ہو جائے عالمِ دُنیا
گر کہیں ٹوٹ کر برس جائے

مرگِ نہرو پر

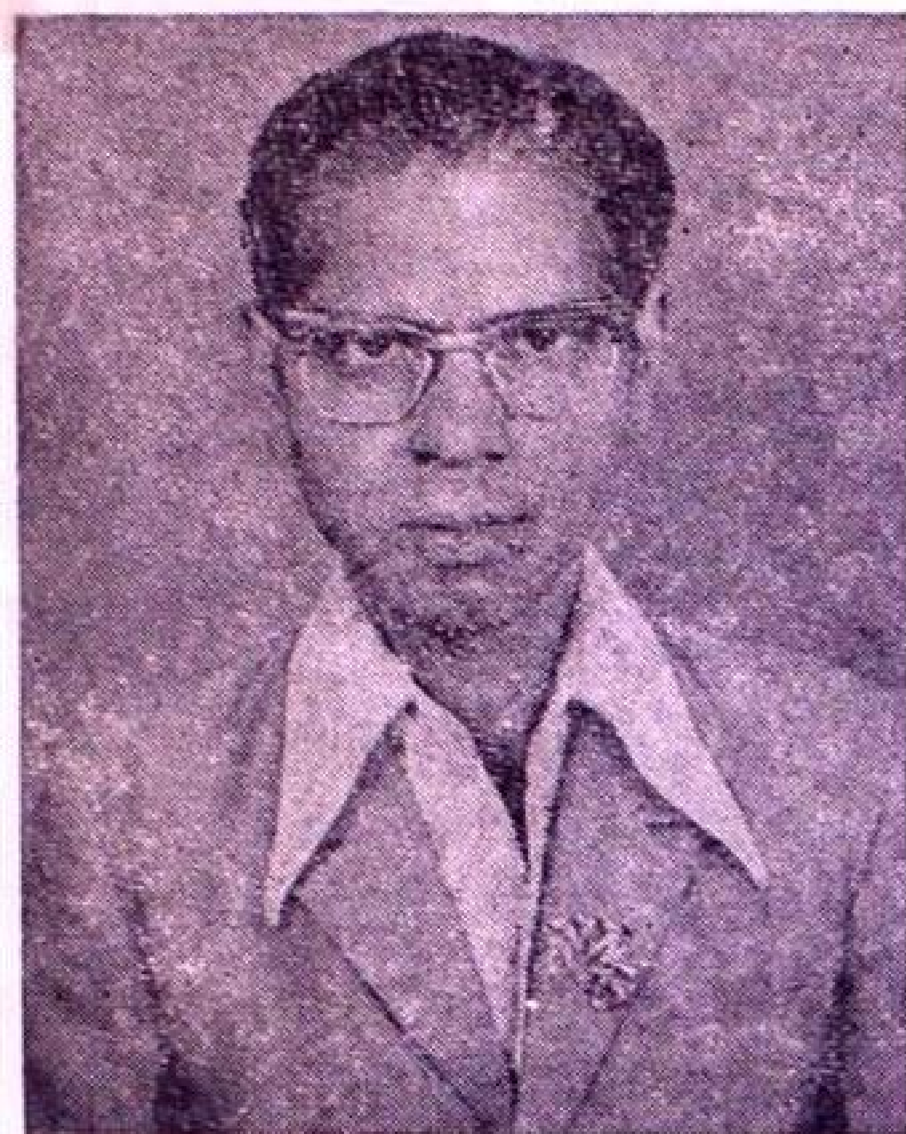
مرگِ نہرو سے اُداسی چھا گئی
آسماں رویا زمیں تھرا گئی
جب ہوا ہر بھارتی نوحہ کناں
آسمانوں سے زمیں ٹکرا گئی
موت سے اس کی ہمارے ہند میں
وقت سے پہلے قیامت آگئی
یک بیک ہی کھو گیا موتی کا لعل
ہمتیں ٹوٹیں اُداسی چھا گئی
باغباں کے پھول سب مُرجھا گئے
گلشنِ دل کی کلی کمہلا گئی
میں غمِ نہرو میں کیا لکھتا نحیفؔ
لکھنے بیٹھا تھا قلم تھرا گئی



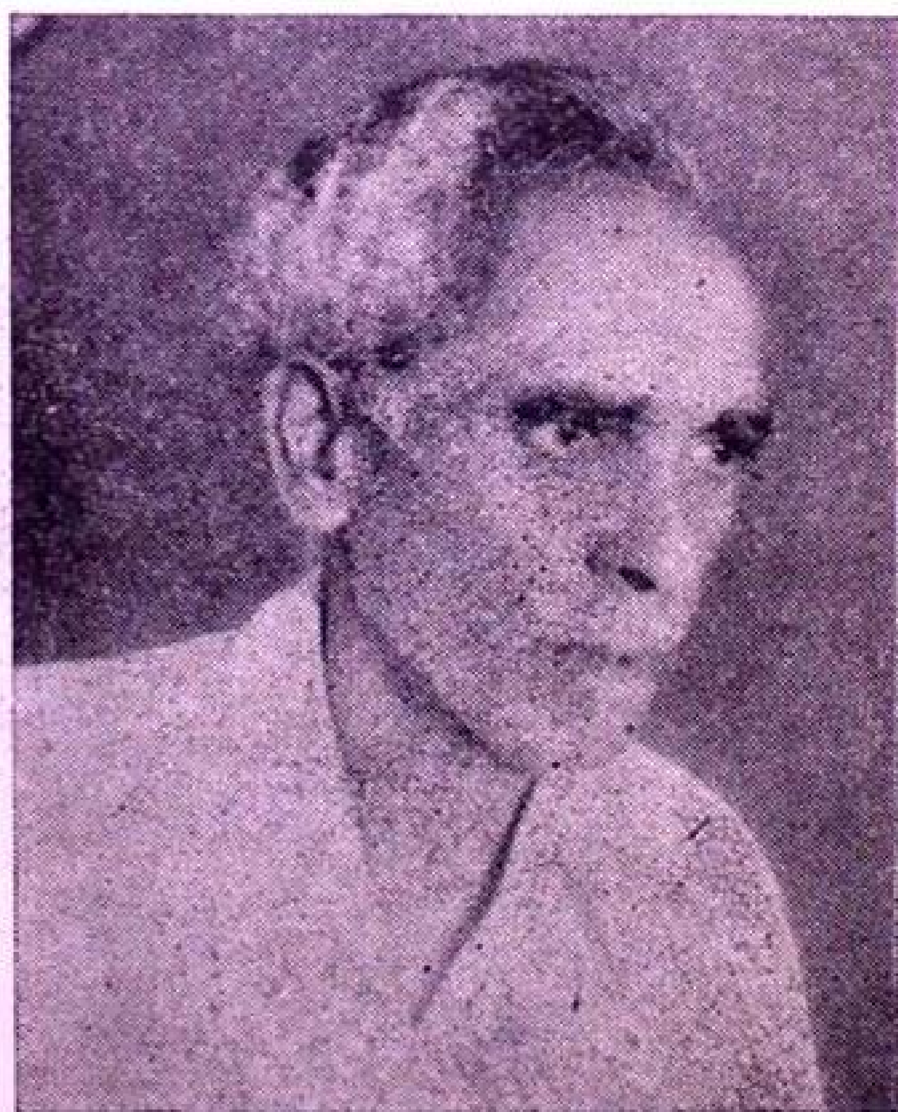
HUMA Page-317



YUNUS Page-322



NAHEEF Page-309



WAQIF Page-313

واقف جالندھری

نام ایڈ وین داس۔ تخلص واقف ۲۸ راپریل ۱۹۱۹ء جالندھر چھاؤنی میں پیدا ہوئے۔ ایف۔ اے پاس کیا اور پھر ادیب فاضل کا امتحان پاس کر لیا زمانۂ تعلیم سے شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا ۱۹۳۶ء سے جناب مخمور جالندھری تلمیذ علامہ سیماب اکبر آبادی سے اصلاح لیتے رہے۔ جالندھر سے ہفت روزہ "صلیب" نکالا جس کے آپ ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۴۸ء سے جالندھر ریڈیو میں ملازم رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر جالندھر میں مستقل طور پر مقیم ہیں۔ نثر نگاری کا بھی شوق ہے۔ ڈرامے اور افسانے بھی لکھتے ہیں، کلام کم و بیش لغزشوں سے پاک ہے۔ زبان صاف اور شستہ ہے۔ تخیل کی بلند پروازیاں ہیں اور کلام میں جدت پائی جاتی ہے۔ ترکیبیں چست اور دلکش ہیں۔ ایک ڈرامہ یہوداہ اسکریوطی شائع ہو چکا ہے۔ کل ہند مسیحی مصنفین کانفرنس نے ۱۹۸۶ء میں آپ کو روحِ سخن کے خطاب سے نوازا ہے۔

نمونۂ کلام :-

توصیف حضرت مسیح

ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح
بخشے گا کون آپ کی سرکار کی طرح

دامن کو چھو کے اسکے شفایاب ہو گئے
جو پھر رہے تھے دائمی بیمار کی طرح

بہرِ نجاتِ عاصیاں وہ مالکِ نجات
مصلوب ہو گیا تھا گنہ گار کی طرح

ابنِ خدا کے پاس چلے آئیں بے خطر
در در بھٹک رہے ہیں جو بدکار کی طرح

عقیدہ

جب مسیح پاک مجھ پر مہرباں ہو جائے گا
درد میرا حاصل کون و مکاں ہو جائے گا

ایکدن مٹ جائیں گی ہستی کی ساری کلفتیں
ابن مریم چارہ ساز بیکراں ہو جائے گا

رونما جس روز ہو گا پرتو حسن ازل
چپہ چپہ اس زمیں کا آسماں ہو جائے گا

بڑا دن

یہ ہے مخلوق کو یزداں کی عنایات کی رات
عاصیو شاد ہو آئی ہے مناجات کی رات

آج چرنی میں ہوئی ذات خدا جلوہ نما
اس سے بڑھ کر نہ ہوئی ہو گی کرامات کی رات

رشک آئینہ بنا دھل کے سیہ خانۂ دل
آج انوار الٰہی کی ہے برسات کی رات

میری راہوں کا اجالا ہے کلام عیسیٰ
اب نہ آئے گی میری زیست میں ظلمات کی رات

جاگنا فرض ہے اس رات عبادت کیلئے
اک نئی شان سے آئی ہے مراعات کی رات

سجدۂ شکر بجالاؤ شتاب اے واقف
آ گئی آ گئی جاں بخش بیانات کی رات

صلیب

عاشقان ابن مریم اور محبان صلیب
دیکھنا کس شان سے ہوتے ہیں قربان صلیب

جان کی بازی لگا دیں گے فدایان صلیب
سینچیں گے اپنا لہو دیکر گلستان صلیب

بخشکر اشجار کو تحفہ زبان برگ کا
کر دیا انکو مشیت نے ثنا خوان صلیب

ختم ہو جائیں گی ساری راہ کی دشواریاں
کر کے ہمت جب بڑھیں گے سر فروشانِ صلیب

اسکی بے پایاں محبت پر ہے عالم کی بنا
خوف دل میں کس طرح لائیں جوانانِ صلیب

چومتی ہے زندگیِ جاوداں اسکے قدم
مانتے ہیں دل سے آواقف جو قربانِ صلیب

ایسٹر

آج وہ آرامِ جان دل آرام جہاں زندہ ہوا
قبر خالی ہے مسیحائے زماں زندہ ہوا

تیسرے دن چھٹ گئیں وہم و گماں کی ظلمتیں
جگمگا اٹھا جہاں نورِ جہاں زندہ ہوا

موت کو مغلوب کر کے جی اٹھا ابنِ خدا
شور ہے ہر سو شہ کون و مکاں زندہ ہوا

جس کے خونِ پاک نے بخشی گناہوں سے نجات
آج کے دن وہ رفیقِ عاصیاں زندہ ہوا

قم باذنی کہہ کے جس نے مردے زندہ کر دیئے
فتح پا کے موت پر وہ مہرباں زندہ ہوا

تو بھی واقف مانگ لے اس سے حیاتِ جاوداں
آج آقائے حیاتِ جاوداں زندہ ہوا

غزل

اگر ادر چھوڑ کر ہم زندگانی پالنے کہاں جاتے
سزاوارِ جہنم تھے خدا جانے کہاں جاتے

ہم اس دارِ محن میں زیست بہلانے کہاں جاتے
تیرے رحمت کدے سے دور دیوانے کہاں جاتے

ہماری بیکسی پر تیری الفت کو ترس آیا
وگرنہ غرقِ عصیاں ہو کے بخشانے کہاں جاتے

بھٹکے ہالے بھٹکتے ہم اور بارِ عصیاں سخت بھاری تھا
جو تو رہبر نہ ہوتا ہم خدا جانے کہاں جاتے

ترے در سے نہ ہم امید گر رکھتے تو کیا کرتے
تہی داماں تھے جب ہم ہاتھ پھیلانے کہاں جاتے

نہ دیتا وہ اگر فدیے میں اپنی جان اے واقف
گنہگارانِ دنیا زندگی پانے کہاں جاتے

غزل

جہاں میں آیا وہ انسانِ بے نوا کے لئے
وہ اپنی جان پہ کھیلا میری بقا کے لئے

اے غمگسارو مجھے میرے حال پر چھوڑو
لو آگئے مسیرے عیسیٰ میری دوا کے لئے

قدم قدم مرا سجدہ نظر نظر ہے سلام
نفس نفس ہے میرا وقف اب دعا کے لئے

تمہارے در نے عطا کی ہے دولتِ کونین
نہ اب یہاں سے اٹھاؤ مجھے خدا کے لئے

یہ فرحتوں کا تلاطم یہ راحتوں کا ہجوم
یہ تیری چشمِ کرم مجھ سے بے نوا کے لئے

جہاں پہ چرنی میں اُتریں تھیں نور کی موجیں
وہیں سے ہم نے بہشتِ بریں کے خاکے لئے

تیری جناب سے طالب ہے داد کا واقف
درازِ دامنِ دل ہے تیری عطا کے لئے

ہُما میرٹھی

دُنیائے مسیحیت میں اس صفِ اوّل کے شاعر اور ادیب کا نام ہنری ولیم ابراہام اور تخلص ہُما ہے۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۳۵ء اپنے وطن میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے پاس کیا اور مختلف محکموں میں کام کیا۔ تلوّن مزاجی کے باعث کسی محکمہ میں زیادہ دن نہ ٹھہر سکے آخر میں پولیس کی ملازمت اختیار کی اور اپنی جانفشانی، ایمانداری، دلیری اور مردانگی کی وجہ سے بہت جلد پولیس افسر بن گئے۔ آج کل مدھیہ پردیش میں ریلوے پولیس سے وابستہ ہیں۔

شاعری کا شوق رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ پولیس کی ملازمت اور عدیم الفرصتی کے باوجود شعر و سخن کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ حضرت نادر شاہجہانپوری کے عزیز ترین شاگردوں میں ہیں۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ جدید شاعری سے متاثر ہیں۔ اپنے لئے نئی راہیں نکالنا پسند کرتے ہیں۔ طبیعت میں جدّت ہے کلام برائے ادب کا حامل نظر آتا ہے اسلئے کلام میں آمد اور آورد دونوں کا امتزاج ہے۔

کلام میں تغزل، جوش و خروش اور شباب کے ولولے و جوانمردی سے پُر بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ کلام میں طنز اور چُبھتے ہوئے تیر و نشتر بھی پائے جاتے ہیں۔ سوسائٹی اور سماج کی اصلاح اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

فن سے اچھی طرح واقف ہیں اور ایک فنکار کی حیثیت سے قلم اُٹھاتے ہیں

زبان شستہ اور صاف ہے۔ چست بندشیں اور خوبصورت ترکیبیں کلام کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔ سخن سنج اور سخن فہم ہیں۔ مذہب اور اپنے عقیدے سے محبت ہے۔ اسلئے اپنے عقائد کو اشعار کی شکل میں بحسن و خوبی ڈھال دیتے ہیں مطالعہ وسیع ہے۔ مسلسل نظمیں بہت خوب کہتے ہیں۔ کلام مسیحی اور غیر مسیحی حلقوں میں مقبول ہے۔

تاریخ گوئی کے مشّاق ہیں اور سادہ مادّوں سے تاریخ نکال لیتے ہیں۔ نثر نویسی میں بھی زورِ کلام دکھایا ہے۔ افسانے و مقالے لکھے ہیں۔ کہکشاں جس میں یوروپین شعراء کا تذکرہ ہے بڑی کاوش کے ساتھ قلمبند کیا ہے انجمن کُل ہند مسیحی اردو مصنفین نے آپ کو سنہ ۱۹۸۰ء میں ادیبِ ملّت کے خطاب سے نوازا ہے۔ اپریل سنہ ۱۹۸۷ء سے مسیحی دَور کے مدیر اعلیٰ ہیں جسے وہ اندور سے شائع کرتے ہیں۔

نمونۂ کلام:-

قطعات

گناہ کے ماروں نے امید زندگی پائی
خطا کے بوجھ سے بوجھل نے سر خوشی پائی
مسیح آئے تو ظلمت کا منھ ہوا کالا
اندھیری رات میں دنیا نے روشنی پائی

خالق کو جبکہ اسکی خطا دردِ سر ہوئی
رحمت کو آیا جوش جب اسکو خبر ہوئی
شہزادۂ حیات کو بھیجا زمین پر
دنیائے آرزو میں خوشی کی سحر ہوئی

رُباعی

مژدہ کہ خداوندِ جہاں آیا ہے
خوش باش کہ مختارِ جہاں آیا ہے
یہ عجز کہ چرنی میں ہوا ہے پیدا
ایک عرش نشیں دیکھو کہاں آیا ہے

اندھیرے ہو گئے کافور آفتاب آیا
لو نویدِ عمر دُوا ب عہد کامیاب آیا
مسیح آ گیا دُنیا میں دستگیری کو
خوش آمدید مناجات کا جواب آیا

توصیفِ مسیحا

میرے آقا میرے ایمان مسیحا پیارے
جان و دل آپ پر قربان مسیحا پیارے
جس نے چُوما ترا دامانِ مسیحا پیارے
اُس کی مشکل ہوئی آسان مسیحا پیارے
کلوری ہے تیری پہچان مسیحا پیارے
تو جہاں ہو گیا قربان مسیحا پیارے
کھینچ لائی ہے زمانہ کو محبت تیری
ہے ترا عشق ہی ایمان مسیحا پیارے
قاتلوں تک کیلئے دار پر بخشش چاہی
شانِ الفت ہے تری شانِ مسیحا پیارے
تیری چوکھٹ پہ نگوں ہو گئی جبیں سرکش کی
تو ہے سُلطانوں کا سلطان مسیحا پیارے
کھنچ گیا دار پر عالم کے گناہوں کیلئے
کون بھُولے گا یہ احسان مسیحا پیارے

تیرے در سے کوئی محروم نہیں لوٹا ہے
اب ہُما پر بھی ہو احسان مسیحا پیارے

مسیح مصلوب

مریم کا دل ہے شورشِ دریا لئے ہوئے
بہتے ہیں اشک خونِ تمنّا لئے ہوئے

نیزے نے نالہ زار کیا پہلوئے مسیح
پانی بہا نشان لہُو کا لئے ہوئے

تائب ہوا ہے رہزنِ گمراہ دار پر
مرتا ہے زندگی کا سہارا لئے ہوئے

لعزر یہ کون آیا ہے تیری لحد پہ آج
اپنے سخن میں زلیست کا ایما لئے ہوئے

جی اٹھنے کا مسیح کے مریم کو ہے یقیں
آنکھیں ہیں منظرِ پسِ فردا لئے ہوئے

پوری دلِ ہما کی مُرادیں ہوں اے مسیح
مٹ جائے وہ نہ یوں ہی تمنّا لئے ہوئے

جوش و ولولہ

نقابِ روئے ظلمت خانۂ دُنیا اُٹھاؤں گا
ہر اک صُورت کدہ کو مظہرِ عیسیٰ بناؤں گا

فراوانی سوادِ کفر کی یکسر مٹاؤں گا
جہاں کو نورِ ابن کبریا سے جگمگاؤں گا

سبق تثلیث[1] کا سارے زمانے کو پڑھاؤں گا
دبستانِ مسیحا ریگ زاروں میں بناؤں گا

پئے تعظیم عیسیٰ رفعتِ گردوں جھکاؤں گا
جو ہیں گمراہ انکو منزلِ مقصد پہ لاؤں گا

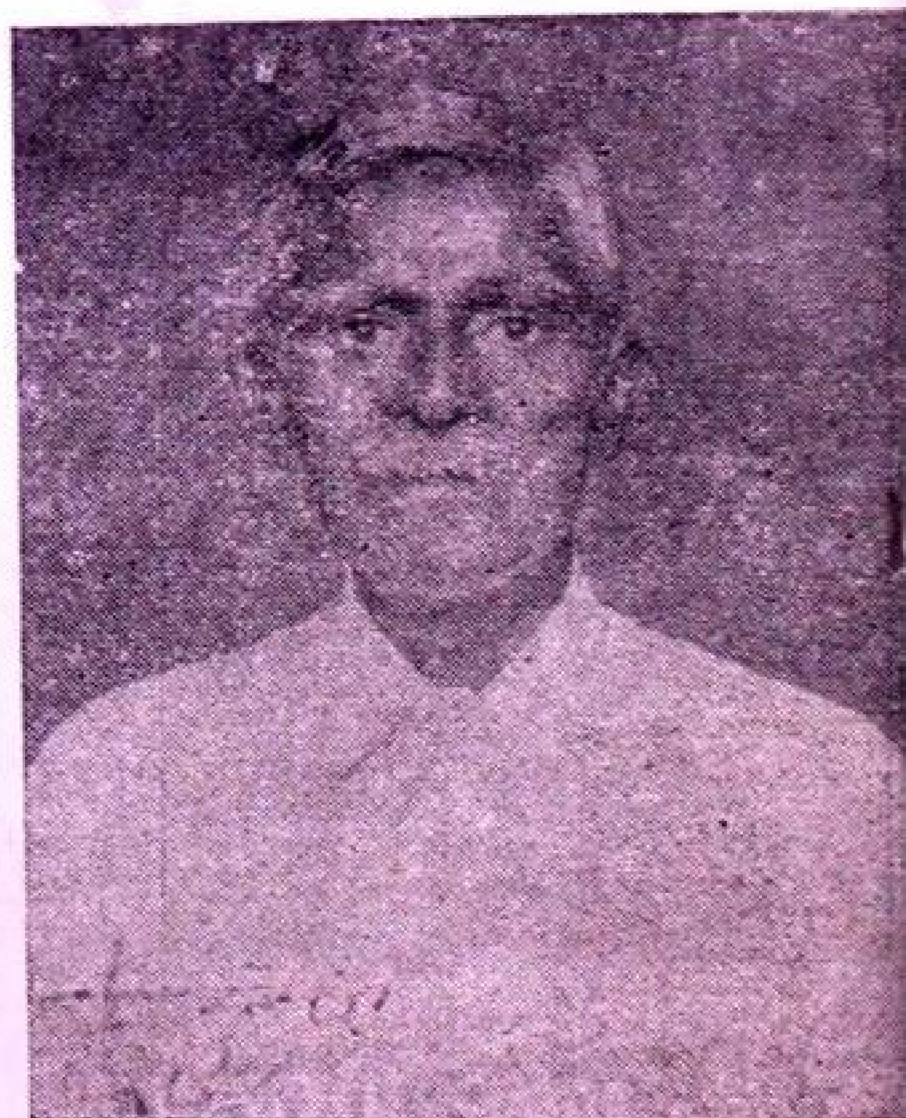
نئی دُنیا نئی تنظیم میں عالم میں لاؤں گا
مسیحی قوم کی اُجڑی ہوئی بستی بساؤں گا

بہ فیضِ ابن داؤد اسقدر توفیق پاؤں گا
حریمِ بزمِ ملّت ان کے جلوؤں سے سجاؤں گا

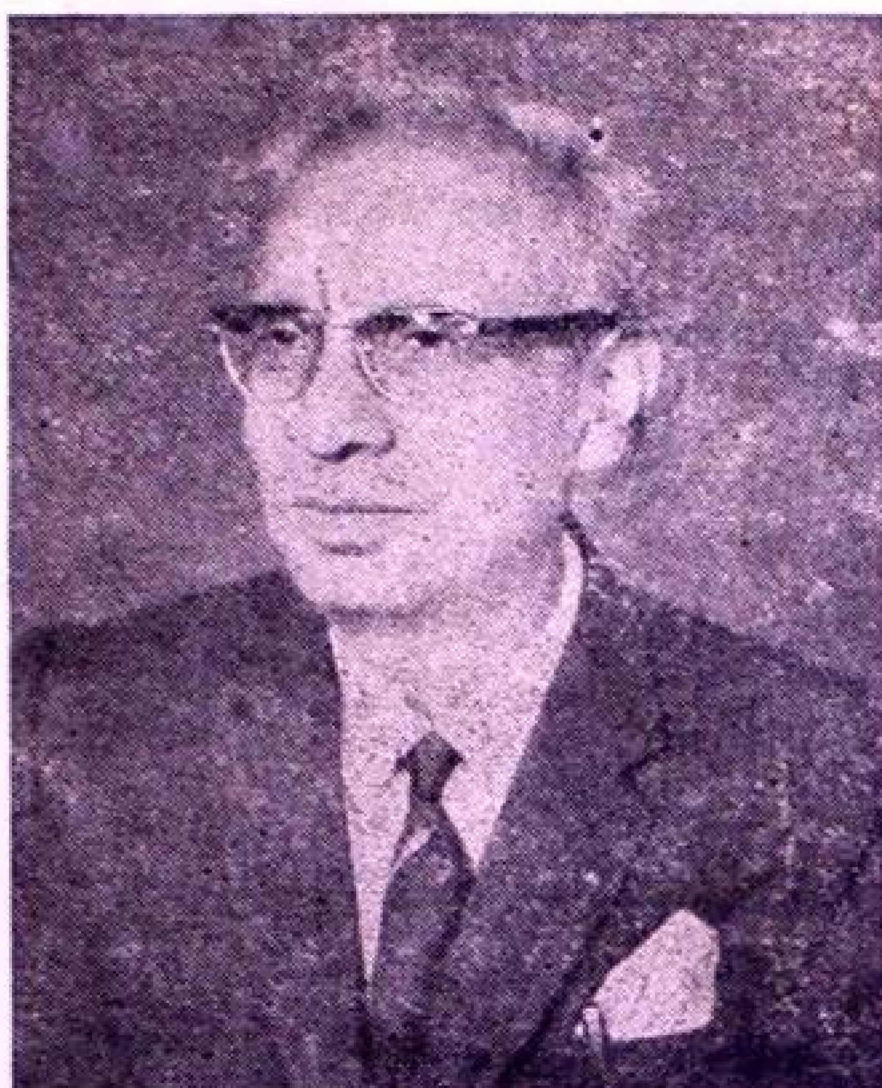
[1] خدا، بیٹا اور رُوح القدس



SHARAR Page-336



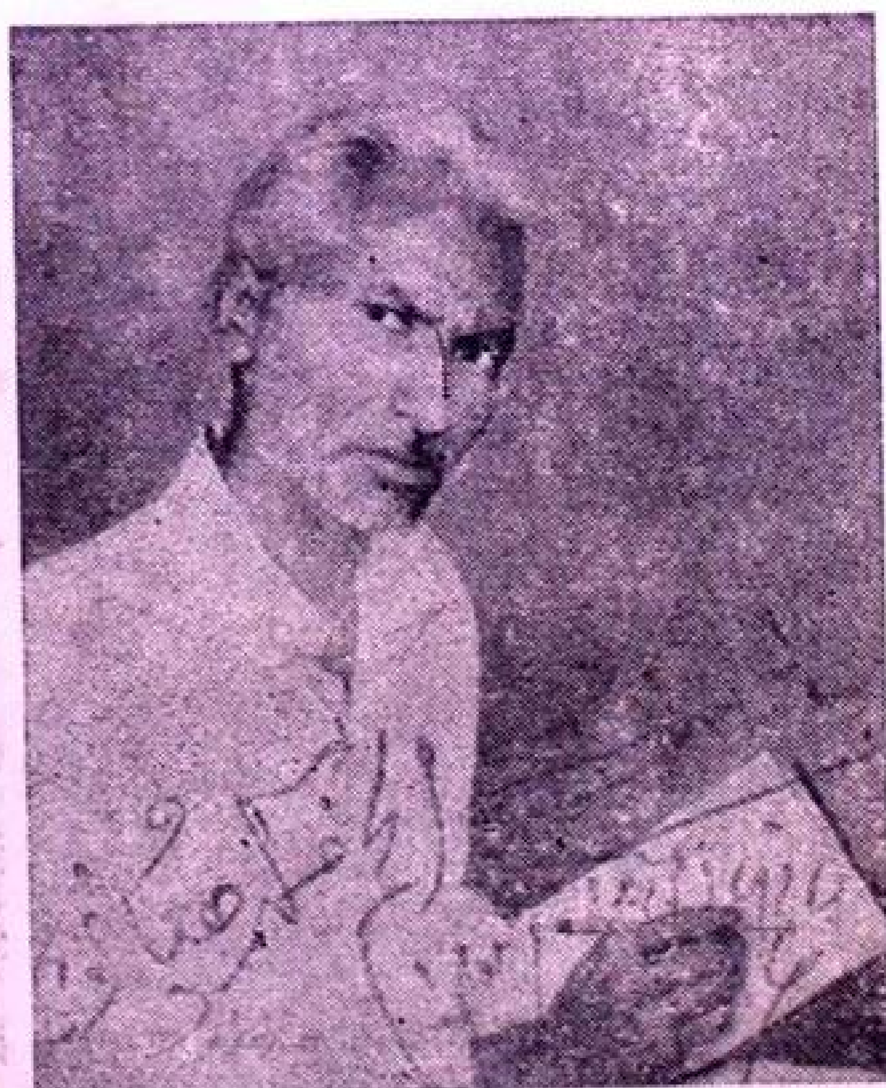
RAHIB Page-155



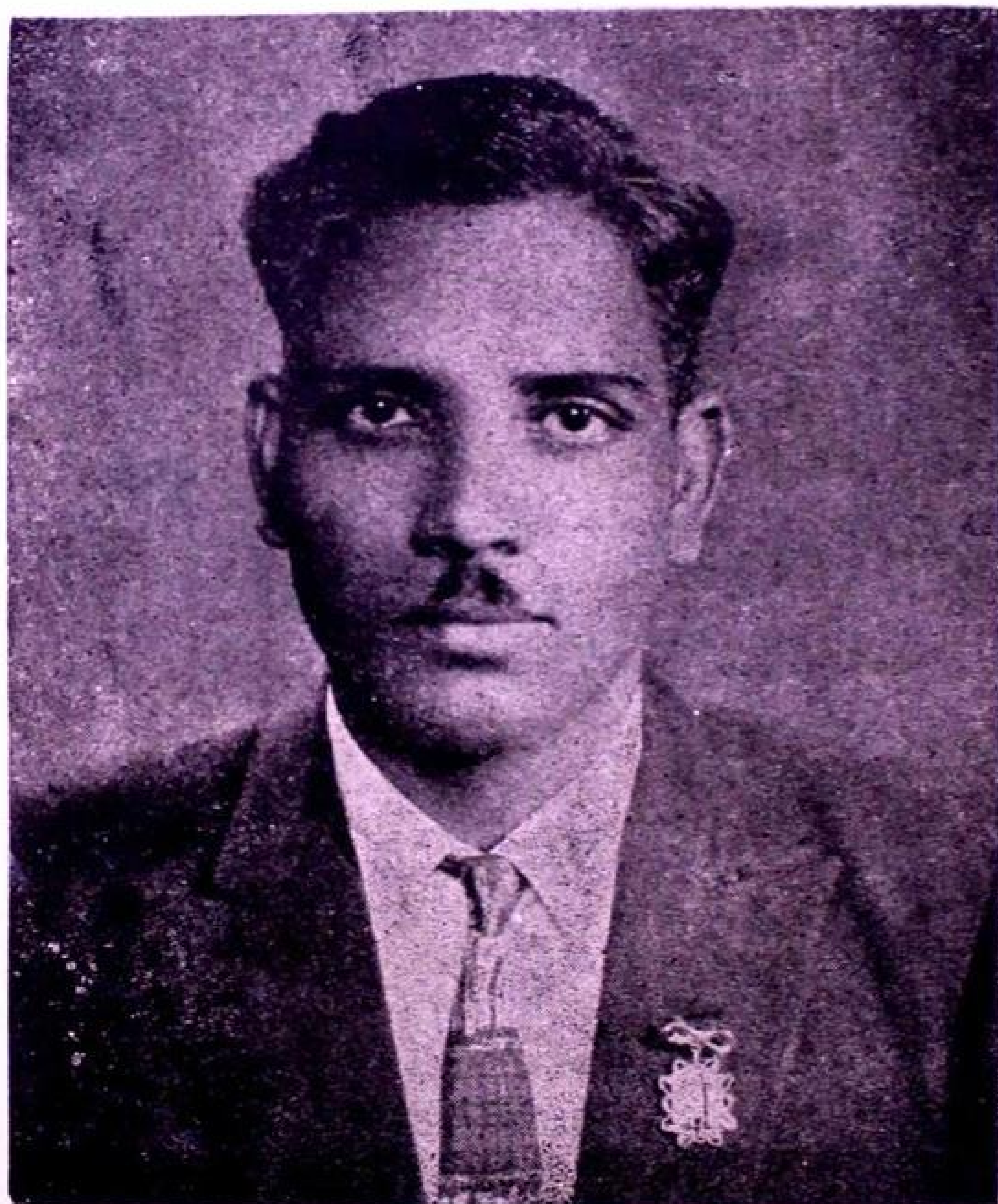
ASAR Page-111



AKHTAR SUSHIL
Page–113.



ANJUM Page-115.

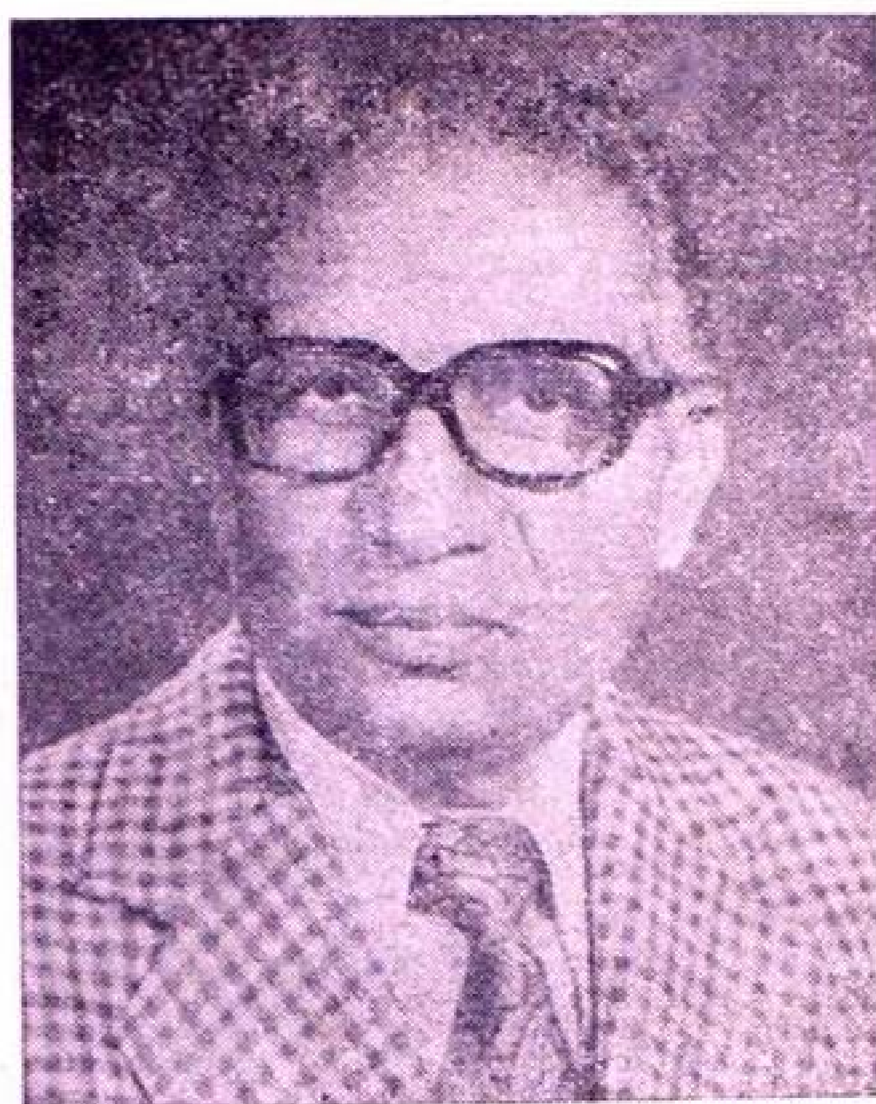


PETER RAZ

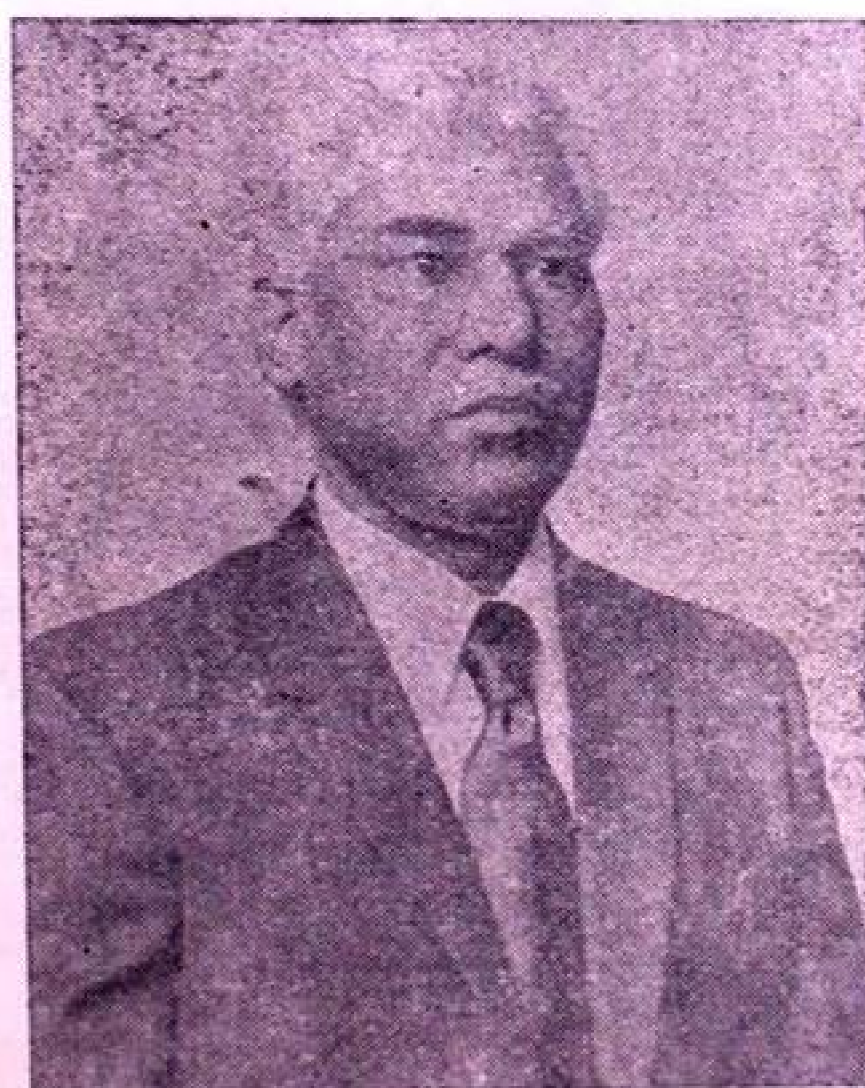
Page-157.



NAMI Page-291



NAMI NADRI Page-294



D.L. NASIR Page-301

غزل

کردیں گے سحر تم شفقِ شام ہمیں دو
دشوار ہے جو کام وہی کام ہمیں دو

ہم عیش بنا دیں غمِ ایام ہمیں دو
فولاد بنا دیں دلِ ناکام ہمیں دو

ظلمت کو بدل دیتے ہیں سورج کی کرن میں
بے نور زمانے کے در و بام ہمیں دو

تم دار و رسن دیکھ کے تھے خوف سے بھاگے
پھر اُس پہ یہ طرّہ ہے کہ الزام ہمیں دو

صیّاد کا سر تن سے جُدا کر کے دکھا دیں
خنجر جو کسی طرح تہہ دام ہمیں دو

گیسوئے رُخِ ہستی کے سنوارے ہیں ہمیں نے
ہم در خورِ انعام ہیں انعام ہمیں دو

ہم نے ہی نکھارا ہے ہماؔ نقشِ غزل کو
اب غالبؔ و خیّام کا تم نام ہمیں دو

غزل

تیر کیا گردشِ ایام ابھی باقی ہیں
غم کے کچھ اور بھی انعام ابھی باقی ہیں

تیر انداز تیرے شہر میں اک میں ہی نہیں
اور بھی عاشق گمنام ابھی باقی ہیں

وقت سے کہہ دو ذرا شمع کی لو اور بڑھا دے
مُردم قلبِ سیاہ خام ابھی باقی ہیں

اور بھی چند نوشتے ابھی لکھنا ہیں مجھے
رُوح میں اور بھی الہام ابھی باقی ہیں

اب غزل اور فسانوں کیلئے وقت کہاں
کام جب اور خوش انجام ابھی باقی ہیں

دل لگانے کیلئے شرط نہیں ہے تو ہی
اور بھی شہر میں اصنام ابھی باقی ہیں

کون کہتا ہے ہماؔ غالبؔ و خیّامؔ نہیں
پیروِ غالبؔ و خیّامؔ ابھی باقی ہیں۔

یونسؔ جالندھری

یونس مسیح نام تخلص یونسؔ ۱۹۲۳ء اپنے وطن جالندھر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ اردو زبان میں قابلِ قدر قابلیت پیدا کر لی ہے۔ عرصہ دراز سے شوقِ شاعری ہے۔ اور جناب مخمورؔ جالندھری سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ بسیار نویس ہیں۔ کلام مقبول ہے اسلئے آپ کو شاعرِ عوام کہا جاتا ہے۔ اردو زبان سے عشق ہے۔ کہتے ہیں ؎

بقول حضرتِ عاشقؔ نہ کچھ لو
کہ اردو کسقدر پیاری زبان ہے

پنجابی میں بھی شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔

توصیفِ مسیحا

مسیحِ پاک سے ہم دل لگائے بیٹھے ہیں — اسی کو دیدہ و دل میں بسائے بیٹھے ہیں
درِ مسیح پہ جو دل سے آئے بیٹھے ہیں — وہ خود کو وارثِ جنت بنائے بیٹھے ہیں
جو دل سے اپنی خودی کو سُلائے بیٹھے ہیں — وہ اپنا گلشنِ ہستی سجائے بیٹھے ہیں
صلیبی نور کے سائے میں آئے بیٹھے ہیں — چراغِ نورِ حقیقت جلائے بیٹھے ہیں
مسیح کے نام پہ مرنا بھی ہے قبول ہمیں — ہم اس پہ زندگی اپنی لُٹائے بیٹھے ہیں
مٹا کے عشقِ مسیحا میں اپنی ہستی کو — جہانِ عشق پہ ہم لوگ چھائے بیٹھے ہیں

سخنوری کا نہ دعویٰ کرو کبھی یونسؔ
غرور والے سدا منہ کی کھائے بیٹھے ہیں

بڑا دن

اب نہ ڈوبے گی کبھی کشتی میری طوفان میں
ناخدا عیسیٰ ہے میرا لو کنارا آ گیا

مَیں بلائیں کیوں نہ لوں ابنِ خدا کی آ ندیم
مجھ پہ جاں دینے کو وہ حق کا دُلارا آ گیا

آج پھر نی بھی ہے جس کے دم قدم سے کوہِ طور
ابنِ آدم بن کے وہ شافی ہمارا آ گیا

فیض پا یونسؔ مسیحِ ناصری کے فیض سے
اوج پر تیرے مقدر کا ستارا آ گیا

ایسٹر

جی اُٹھا قبر سے محبوبِ خدا تیسرے دن
ہو گیا دہر میں ایک حشر بپا تیسرے دن

موت کے بل جو نکالے تو نکالے تو نے
کر دیا سیدھا اُسے تیر نما تیسرے دن

سامنے موت تیرے ہوتی ہوا دیکھی ہے
موت کی تو نے زکالی ہے ہوا تیسرے دن

پاسباں قبر کے حیران تھے یہودی چُپ تھے
جانِ من قبر میں جب تو نہ رہا تیسرے دن

قابلِ فخر ہے یہ معجزہ تیرا دلبر
دیکھتے دیکھتے یہ ہو گیا کیا تیسرے دن

تیرے جی اُٹھنے میں اسرار تھا پنہاں حق کا
تیری عظمت کا پتہ سب کو لگا تیسرے دن

اس ادا پہ تیری قربان ہوا ہے یونسؔ
جی کے تو نے جو دکھائی ہے ادا تیسرے دن

غزل

صدائے توبہ جا کر جب درِ یزداں سے ٹکرائی !
گھٹا رحمت کی اُٹھی اور میرے عصیاں سے ٹکرائی

تری آمد نے دھبے دھو دیئے میرے گناہوں کے
میری فریاد جا کر جب ترے ایواں سے ٹکرائی

بھلا ڈوبے تو کیوں ڈوبے بھروسہ تجھ پہ رکھتا ہوں
ہزاروں بار یہ کشتی مری طوفاں سے ٹکرائی !

مسلسل تھی محبت زندگی میرے مسیحا کی
صداقت اس کی ہر غارت گرِ ایماں سے ٹکرائی

ستم کیشوں کو اس نے انکسار و عجز سکھلایا
مسیحا کی شرافت نخوتِ نازاں سے ٹکرا گئی

سمجھتا ہوں میں ہر ذرّے کو اس کا آستاں یونسؔ
جبیں میں نے جہاں رکھ دی درِ جاناں سے ٹکرا گئی

غزل

گردشِ تلخیِ حالات کی باتیں نہ کرو
غم میں ڈوبے ہوئے جذبات کی باتیں نہ کرو

یادِ ماضی کی کہیں پھر نہ مجھے تڑپائے
دوستو ترکِ ملاقات کی باتیں نہ کرو

زخم آلودہ ہے دل ہجر میں انکے یارو
اس سے اب موسمِ برسات کی باتیں نہ کرو

ہائے وہ رات کہ جس رات انھیں دیکھا تھا
دلِ افسردہ سے اس رات کی باتیں نہ کرو

میرا ہر روز محرّم ہے کسی کے غم میں
مجھ سے اب عید کی شب رات کی باتیں نہ کرو

حرف آئے نہ کہیں پیار سی افضل شے پر
دوستو دوستوں سے گھات کی باتیں نہ کرو

اُن سے اب پیار کی امّید نہ رکھو یونسؔ
اس زمانے میں عنایات کی باتیں نہ کرو

دتاخیر سے موصول ہونے والے شعراء

دوست جالندھری

نام ننھے مسیح۔ تخلص دوست سنہ ۱۹۰۲ء جالندھر چھاونی میں پیدا ہوئے۔ ۱۲ اپریل سنہ ۱۹۷۲ء لاہور۔ پاکستان میں انتقال ہوا۔

تقسیم کے بعد سنہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے گئے لیکن چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہندوستان میں رہ گئے۔ دو بیٹے و ایک بیٹی آپ کے ہمراہ پاکستان چلے گئے ارشاد ہوا ہے ؎

دو طرف گرنا پڑے گا اب تجھے برقِ تپاں
چار بیٹے نوجواں تقسیم ہو کر رہ گئے

ہندو پاکستان میں صفِ اوّل کے مسیحی شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ کلام پختہ اور قابلِ داد ہے۔ زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ اظہار خیال بڑے دلکش انداز میں کر دیتے تھے۔

تخیل کی رنگینیاں بڑی خوبصورت ہیں۔
نثر بھی نہایت عمدہ لکھتے تھے۔

توصیفِ مسیحا

آقائے ہست و بود شہِ دو جہاں ہے تو
کون و مکان تیرے ہیں کون و مکاں ہے تو

مہر و مہ نجوم میں تیری تجلیاں
برگ و گل و گیاہ میں جلوہ فشاں ہے تو

تیرے ہی دم سے عظمت و زینت چمن کی ہے
دنیائے ہست و بود کی روحِ رواں ہے تو

پھیلے ہیں تیرے جلوے ثریا سے بھی پرے
محوِ خرام ناز سرِ کہکشاں ہے تو

ہر دلِ شکستہ پاتا ہے تجھ سے طمانیت
وجہ سکونِ خاطرِ آشفتگاں ہے تو

تو رہبروں کے واسطے قندیلِ راہ ہے
گم کردہ راہروں کیلئے راہ رواں ہے تو

دشمن ہے کل جہان اگر تو نہیں ہے دوست
دنیا ہے مہرباں اگر مہرباں ہے تو

ہر اک شے ہے عالمِ امکاں میں بے ثبات
ہر ذرے کو فنا ہے مگر جاوداں ہے تو

صد حیف آج بھی ہوں رہینِ غمِ حیات
شاید کہ مجھ سے آج بھی کچھ سرگراں ہے تو

میرے گناہ کثیر تیری رحمتیں عظیم
مَیں ذرۂ حقیر ہوں اور بیکراں ہے تو

اب غم نہیں ہے مجھ کو سزا و جزا کا دوست
جب جانتا ہوں یہ کہ مرا پاسباں ہے تو

بڑا دِن

مہرباں کتنا ہے دُنیا پہ خدا آج کے دِن
مصدرِ نور بنے ارض و سما آج کے دِن

عشق تشنہ نے پیا جامِ بقا آج کے دِن
آ گئی دام میں خود موجِ فنا آج کے دِن

بخشش عام کا اعلان ہوا دُنیا میں
دیدنی ہے تیری رحمت کی ادا آج کے دِن

اُٹھتے جاتے ہیں حجاباتِ نظر تھے جتنے
عشق کو حسن کا ملتا ہے صلا آج کے دِن

شامِ غم ختم ہوئی صبحِ بہاراں آئی
شادماں ہو ہی گئی صیدِ بلا آج کے دن

روئے گیتی کے مقدر سے سیاہی اُتری
جلوہ فگن ہوا چرنی میں خدا آج کے دن

ظلمتِ کفر زمانے سے مٹائی جس نے
ہے وہی نورِ ازل جلوہ نما آج کے دن

خطِ تقدیر نہیں قابلِ ترمیم مگر
بدلا جاتا ہے نصیبوں کا لکھا آج کے دن

کھل گیا پھر اثر بابِ اجابت اے دوست
کیوں نہ مقبول ہو پھر اپنی دُعا آج کے دن

قطعہ

اس روز ہوئی شمع محبت کی فروزاں
اس روز ہوئے دُور نجوست کے اندھیرے

اس روز بپا کیوں نہ کریں جشنِ چراغاں
چمکے ہیں ہر ایک سمت مسرت کے سویرے

کلوری

تاریکئ قلوب کا درماں ہوا تو ہے
ہم پر مسیحِ پاک کا احساں ہوا تو ہے

وہ نور کلوری پہ نمایاں ہوا تو ہے
انسان کی نجات کا ساماں ہوا تو ہے

حاصل ہوئے ہیں آج وہ اسرارِ سرمدی
دل بے نیازِ گردشِ دوراں ہوا تو ہے

روشن رُخِ حیات ہے رخشندہ روح و دل
سینے کا داغ داغ فروزاں ہوا تو ہے

پھوٹا ہے کلوری سے وہ سرچشمۂ حیات
اب زندگی کے جینے کا ساماں ہوا تو ہے

اے باپ بخش دے انھیں یہ جانتے نہیں[1]
بخشش کا دشمنوں کی یہ ساماں ہوا تو ہے

جانِ عزیز دے کے فتح پائی موت پر
یہ بھی خدا کا لطف فروزاں ہوا تو ہے

[1] صلیب پر اپنے دُشمنوں کی مغفرت کے لئے حضرت مسیح نے دُعا کی تھی۔ لوقا ۲۳ : ۳۴

سچ مچ کیا ہے اُس نے گنہ گار سے پیار　　بندوں پہ اپنے دیکھ وہ قرباں ہوا تو ہے
مہکا ہے ہر نفس میرا خوشبوئے یار سے
اے دوستؔ یہ خرابہ گلستاں ہوا تو ہے

غزل

گھٹائیں جھوم کر آنے لگی ہیں　　مری توبہ کو بہکانے لگی ہیں
چمن زاروں پہ جوبن آ گیا ہے　　ہوائیں عطر برسانے لگی ہیں
وہ جلوے عام ہوتے جا رہے ہیں　　نگاہیں میری شرمانے لگی ہیں
گذر جاتے ہیں وہ زلفیں جھٹک کر　　بلائیں مجھ سے کترانے لگی ہیں
جو گذری تھیں وطن کے گلکدوں میں　　وہ گھڑیاں آج یاد آنے لگی ہیں
چلا اے دوستؔ دورِ شعر و نغمہ
فضا پر مستیاں چھانے لگی ہیں

غزل

کون درد آشنا ہے کیا کہیئے۔　　کس کو پاسِ وفا ہے کیا کہیئے
وقت وہ آ گیا ہے کیا کہیئے　　دوست نا آشنا ہے کیا کہیئے
کس کو فرصت ہے اب پرکھنے کی　　کون اچھا بُرا ہے کیا کہیئے
کوئی لذت نہیں ہے جینے میں　　زندگی بے مزا ہے کیا کہیئے
عشق کی بس یہی ہے ایک تعریف　　آپ اپنا خدا ہے کیا کہیئے

بے طلب ایک بوسۂ عارض — نعمتِ بے بہا ہے کیا کہیئے
دستِ ساقی میں ساغرِ رنگیں — میکشوں کی دُعا ہے کیا کہیئے
غم و شادی کا اب نہیں احساس — دِل کو کیا ہو گیا ہے کیا کہیئے
حسن ہی زندگی ہے شاعر کی — زندگی بے وفا ہے کیا کہیئے

کون ہے دوست پوچھتے ہیں وہ
شاعرِ بے نوا ہے کیا کہیئے

میلادِ مسیح

مقدر زمانے کا تاباں ہوا ہے — کہ اس روز انسان پیدا ہوا ہے
محبت کا سورج فروزاں ہوا ہے — منجیؐ کی آمد کا ساماں ہوا ہے

ہوا جس کی آمد سے غائب اندھیرا
طلوع ہے محبت کا ہر سو سویرا

بہاروں کا پیغام ہے اُس کی آمد — مداوائے آلام ہے اُس کی آمد
خوشی کا بھرا جام ہے اس کی آمد — کہ اک جلوۂ عام ہے اس کی آمد

اِدھر آؤ! تم کو وہ دلشاد کر دے
گناہوں کی ظلمت سے آزاد کر دے

خداوند، نورِ ازل ابنِ مریم — شکستہ دلوں کے لئے ایک مرہم
ہے ممنون جس کا ہر اک ابنِ آدم — جسے دوست کہتے ہیں چارہ گرِ غم

وہ آیا، گئے دور آ کر اندھیرے
جہاں میں محبت کے نغمے بکھیرے

عاجز بدایونی

نام پریم جون۔ عاجز تخلص۔ جناب اٹن جون مخلص کے صاحبزادے ہیں ۱۹۳۰ء وطن بدایوں میں پیدا ہوئے۔ مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ صحت میں مُلازمت اختیار کی۔ سنہ ۱۹۶۱ء سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور جناب رونق بدایونی کی شاگردی میں آگئے۔

کلام صاف و سُلجھا ہوا ہے۔ شعر سمجھ کر کہتے ہیں۔

نمونۂ کلام:۔

توصیفِ مسیحا

میں مریضِ غمِ فرقت ہوں دوا دی جائے
مجھ کو تصویرِ مسیحا کی دکھا دی جائے

زندگی عشقِ مسیحا میں مٹا دی جائے
زندگی کو یہ حسیں راہ دکھا دی جائے

اپنی تقدیر کی تحریر بدلنے کے لئے
آستانے پہ مسیحا کے صدا دی جائے

ہر گنہگار کی بخشش کا سہارا ہیں مسیح
ہر گنہگار کو یہ بات بتا دی جائے

دعوتِ فکر و عمل دیجے جہاں والوں کو
اور انجیل کی توقیر بڑھا دی جائے

ان جہاں والوں کو پیغامِ مسیحا دے کر
شمع گھر گھر میں محبت کی جلا دی جائے

مَیں پرستارِ مسیحا ہوں ازل سے عاجز
یہ خطا ہے تو مجھے خوب سزا دی جائے

غـــزل

آہ کرنا غم محبوب سے نالاں ہونا!
کفر ہے رسم محبت میں پریشاں ہونا

جو سمجھتا نہیں اوروں کا پریشاں ہونا
ایسے انسان کا بیکار ہے انساں ہونا

جو گلستاں کے کسی کام نہ آئے یارو
چاہتے ہیں وہ گلستاں کے نگہباں ہونا

اس کی تقدیر کی الجھن نہ گئی تا بہ حیات
جس نے دیکھا تری زلفوں کا پریشاں ہونا

کس نے آکاش کے تاروں کو ضیا بخشی ہے
کس نے ذروں کو سکھایا ہے درخشاں ہونا

ایک مجبور محبت ہی سمجھ سکتا ہے
ایک مجبور محبت کا پریشاں ہونا

حکم صیاد ہوا ہے کہ قفس میں عاجزؔ
جرم ہے ذکر چمن ذکر بہاراں ہونا

غزل

دل میں باقی نہیں تاب غم دیکھئے
اب نہ ہو مجھ پہ مشق ستم دیکھئے

حسرت و یاس رنج و الم دیکھئے
جو دکھائیں کسی کے کرم دیکھئے

راہرو عشق ہم بھی ہیں اور آپ بھی
کون رہتا ہے ثابت قدم دیکھئے

اہل دنیا کے عیب و ہنر دیکھ کر
اپنی جانب بھی شیخ حرم دیکھئے

حسن پر حسن ظن قہر ہو جائے گا
آپ للہ آئینہ کم دیکھئے

ہم محبت کے راہی کہاں آگئے
رہ گئے دور دیر و حرم دیکھئے

ناز ہے جانے عاجزؔ کو کسی بات پر
اور بھی تو ہیں اہل قلم دیکھئے

مُمتاز بریلوی

اسم گرامی ممتاز مسیح۔ تخلص ممتاز۔ وطن بریلی میں ۲۷ مارچ ۱۹۱۷ء پیدا ہوئے
آپ کے والد بزرگوار پادری محبوب مسیح بیدار کہنہ مشق شاعر اور موسیقار تھے اسلئے تمام
بچے بہت اچھے موسیقار ہوئے اور شاعری میں دلچسپی لینے لگے لیکن ممتاز صاحب نے شاعری اور
موسیقی دونوں میں شہرت پائی۔

ممتاز صاحب نے ہائی اسکول پاس کرکے مذہبی تعلیم حاصل کی اور الہ آباد سنگیت
پریشد سے موسیقی میں بی۔ اے کیا۔ اس کے بعد پادری کے عہدہ پر سرفراز ہوکر کھتولی، الہ آباد
اور بریلی مدرسات علم الٰہیات میں معلم اور استادِ موسیقی رہے۔

۱ مئی ۱۹۷۹ء فالج کا دورہ پڑا اور ۷ مئی ۱۹۷۹ء اسی مرض میں وطن
میں وفات پائی۔

کلام پختہ ہے لیکن کم ہے۔ ابتدا میں والد بزرگوار بیدار صاحب سے اصلاح لی۔
ملازمت کی مصروفیات کی وجہ سے شعر و شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔

غزل

حضورِ ابن اللہ آیا ہوں شوریدہ شوریدہ
بہت اپنے گناہوں سے ہوں میں رنجیدہ رنجیدہ

صلیبی موت کا ابن خدا کی کیا بیاں کیجے
تصور سے مرا دل جس کے ہے لرزیدہ لرزیدہ

مسیح ابنِ خدا کے نور سے روشن ہے یہ دنیا
ازل سے تا ابد ہر چیز ہے تابیدہ تابیدہ

بتاؤں چشمِ گریاں سے مجھے کیا ہو گیا حاصل
نظر آتی ہے ہر لغزش مری بخشیدہ بخشیدہ
گنہگارِ محبت ہوں سرِ محشر میں کیا آؤں
مرا دل منفعل ہے اور نظر دزدیدہ دزدیدہ
مسیحا کی حضوری کو کوئی ممتازؔ کیا جانے
وہ میرے دل میں رہتا ہے مگر پوشیدہ پوشیدہ

غزل

جو دُنیادار ہے وہ شاداں و فرحاں نہیں ہوتا
کبھی اس کا اندازِ غمِ دوراں نہیں ہوتا
تکبر آدمی تو کیا گراتا ہے فرشتوں کو
فرشتہ گر کے ورنہ عرش سے شیطاں نہیں ہوتا
تمہاری ہی تو ہے جلوہ گری مہرِ درخشاں میں
تمہارا نور نہ ہوتا مہِ تاباں نہیں ہوتا
چمکتا ہے ترا سورج بدوں پر اور نیکوں پر
بھلا وہ کون ہے جس پر ترا احساں نہیں ہوتا
صلیبی موت کا ابنِ خدا کی کیا بیاں کیجیے
تصور ہی سے کس کا دل بھلا لرزاں نہیں ہوتا
میرے اس دردِ پنہاں کی مسیحا تو خبر لے لے
کہ تیرے در پہ کس کے درد کا درماں نہیں ہوتا
نہیں کچھ شاعری آساں کوئی ممتازؔ سے کہہ دے
محض اشعار کہنے سے وہ نکتہ داں نہیں ہوتا

٥

وفاؔ لکھنوی

نام ایم سنتوشم داس۔ خلفِ اصغر حضرت رساؔ لکھنوی سنہ ۱۹۲۸ء
میں ولادت ہوئی۔ ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ گھر میں شاعری کا ماحول
تھا اسلیئے شعر کہنے لگے لیکن والد بزرگوار اُستاد رساؔ سے کچھ فیض حاصل
نہیں کیا۔ اگر باقاعدہ اکتساب فن کرتے اور مشق جاری رکھتے تو ادب میں
بلند پایہ کلام کا اضافہ ہوتا۔ مستقل علالت کے باعث کوئی خاص کام نہ کر سکے
اور مدت سے شعر و شاعری بھی ترک کر دی ہے۔

دہلی میں مستقل طور پر سکونت رکھتے ہیں۔

نمونہ کلام۔

بڑا دن

دلِ بے تاب کو قرار آیا — میرا ہمدرد غم گسار آیا
غم سے فرصت ہوئی قرار آیا — غم رسیدوں کا غم گسار آیا
آمدِ شاہ کی خبر سُنکر — چین آیا مجھے قرار آیا
آسمانوں میں جسکی دھومیں ہیں — اس جہاں میں وہ ذی وقار آیا
میرے عصیاں کا دے دیا فدیہ — کتنا مسیح کو مجھ پہ پیار آیا
جس کے دم سے ہے زندگی کی بہار — آج وہ میرا کردگار آیا
کیوں نہ دنیا میں رحمتیں ہوں نثار — خود خدا ہو کے جلوہ بار آیا
اے وفاؔ تیری سرفرازی کو — بن کے انسان کردگار آیا

عیدِ قیامت

وفا خوش ہو ابنِ خدا جی اٹھا ہے ۔۔۔ کہ منجّی ہر دوسرا جی اٹھا ہے
نہ کیوں آج شرمائیں دل میں یہودی ۔۔۔ مسیحا میرا جی اٹھا جی اٹھا ہے
چلیں کیوں نہ اب زندگی کی ہوائیں ۔۔۔ خداوندِ مُلکِ بقا جی اٹھا ہے
یہ اس کی مسیحائی کا معجزہ ہے ۔۔۔ جو تھا بے شبہ مرگیا جی اٹھا ہے
نہ کیوں وجد میں جلوۂ زندگی ہو ۔۔۔ کہ آقائے نور و ضیاء جی اٹھا ہے
زمانے میں ہے روشنی جس کے دم سے ۔۔۔ وہی مہ لقا مہ لقا جی اٹھا ہے

فرشتے فلک پہ ثنا گا رہے ہیں
بصد شان و عزت خدا جی اٹھا ہے

غزل

تہ بذب میں ہم خستہ جاں اور بھی ہیں ۔۔۔ یہ کس نے کہا امتحاں اور بھی ہیں۔
فقط ایک میں ہی نہیں تیرا شیدا ۔۔۔ ترے عشق میں خستہ جاں اور بھی ہیں
ترے فضل کے منتظر یا مسیحا ۔۔۔ قیامت میں ہم سے جواں اور بھی ہیں
کہانی میرے عشق کی ہے نرالی ۔۔۔ یوں کہنے کو تو داستاں اور بھی ہیں
بھڑک کر تمہاری محبت کے غم میں ۔۔۔ میری آہ آتش فشاں اور بھی ہیں

میری شرمِ عصیاں کے اعجاز دیکھو
وہ مجھ پر وفا مہرباں اور بھی ہیں

شرر گجرانوالی

اسم گرامی گریفن جونز تخلص شرر۔ وطن ضلع گجرانوالہ کے موضع منڈیالہ تیگہ میں یکم ستمبر ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرکے کالج کے دوران جذبۂ حب الوطنی کے زیر اثر تعلیم کو خیرباد کہہ کر فوج میں بھرتی ہو گئے اور مختلف محکموں میں کام کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن گئے اور مستقل طور پر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ۱۹۴۷ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ کلام نہایت پختہ بلند پایہ اور پُراثر ہے۔ انگلستان میں ان کو شاعرِ ملت کہا جاتا ہے کل ہند مسیحی اردو مصنفین انجمن نے اپنے سالانہ اجلاس مشاعرہ ۱۹۸۱ء لدھیانہ میں انھیں سراجِ سخن کے خطاب سے نوازا۔ ہندوستان میں ان کے دو مجموعے "نقوشِ صلیب" اور "صلیبیں زندہ ہیں" شائع ہوئے۔ بہار اردو اکاڈمی نے "نقوشِ صلیب" پر انعام دیا ہے۔ صلیب آپ کا محبوب موضوع ہے۔ کلام وطنی قومی اور ملی محبت کے جذ[bات] سے پُر ہے بائبل کی تلمیحات کو بڑے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں البتہ زبان پر پنجابیت غالب ہے۔

نمونۂ کلام: — **غزل** (از نقوشِ صلیب)

میں تہی دست ہوں اُجڑوں تو اجڑ جانے دو ۔۔۔ زندگی جیسی گذرتی ہے گذر جانے دو
کلوری پر جسے تکتا ہے تصور میرا ۔۔۔ اسکی تصویر میرے دل میں اتر جانے دو
جن سے مہکا تھا کبھی دوستو گلزارِ صلیب ۔۔۔ اُن گلوں کو میرے دامن میں بکھر جانے دو
میرے ایمان کا غنچہ نہ کھلا ہیکل میں ۔۔۔ جس طرف کوئی خرابہ ہو ادھر جانے دو
مجھ پہ اب قوم حقارت کی نظر ڈالتی ہے ۔۔۔ زخم دب دب کے ابھرتے ہیں ابھر جانے دو
میں سمو دیتا ہوں ہر شعر میں سولی کی چبھن ۔۔۔ میرے پیغام سے سینوں کو سنور جانے دو
مجھ کو دیوار میں زنداں کی چُنا جائے گا ۔۔۔ جشن اک مرگِ شرر ہے مجھے مر جانے دو